بدریا برس گئی اس پار

رضیہ جمیل

ترتیب

بدریا برس گئی اس پار ۷

نشان راہ منزل ۴۷

سناٹے گونجتے ہیں ۸۵

میں گیا وقت نہیں ۱۲۷

اسکور ۱۴۵

خوابوں کے دھنک رنگ پیرہن ۱۶۳

آؤ اب لوٹ چلیں ۲۰۹

اک سودائی لڑکی ۲۳۹

● ● ● ● ● ● ●

جملہ حقوق محفوظ

بار اول 2004ء

ناشرین .... خواتین ڈائجسٹ

پریس .... ابن حسن پریس، کراچی

انتساب

طوفان کے بعد، پیام شکیب، غنون الشواطی اور کئی
دوسرے افسانوں کی مصنفہ اپنی چھوٹی بہن

عذرا جمیل کے نام

بدریا برس گئی اس پار
لئے کھڑی ہے پیت گگریا
جوگنیا اس پار

مجھے کہنا ہے

2002ء کے ابتدائی مہینوں کی بات ہے جب بلو (ناصر ریاض) نے مجھ سے میرا ناول ''اک گھروندا برف کا'' شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا- میں حیران رہ گئی- یہ ناول چند سال قبل ماہنامہ ''خواتین ڈائجسٹ'' میں قسط وار شائع ہوا تھا- ناول کا اختتام ہوا تو مجھے امید تھی کہ میرا یہ ناول کتابی صورت میں شائع ہوگا- لیکن وقت گزرنے کے ساتھ میری یہ امید ناامیدی میں بدل گئی- پھر میں نے آس ہی چھوڑ دی- کئی سال پہلے میرا ایک ناول ''آج آنگن پر چاند نہیں'' ماہنامہ ''شعاع'' میں قسط وار شائع ہوا تھا- بہت سے قارئین خواہش مند تھے کہ میرا وہ ناول بھی کتابی شکل میں شائع ہو- چند وجوہ کی بناء پر وہ ناول بھی کتابی شکل میں نہیں شائع ہوسکا- اب بلو نے اسے بھی شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے- لیکن اس ناول کی تین یا چار قسطیں نہ میرے پاس ہیں نہ آفس کے ریکارڈ میں ہیں- خدا کرے پرانے قارئین میں سے کسی کے پاس سے مل جائیں-

محمود ریاض صاحب بہت خواہش مند تھے کہ میرے افسانوں کا مجموعہ شائع ہو اور ایک مجموعہ میرے ناولٹ کا شائع ہو- انہوں نے چند افسانوں اور ناولٹ کی کتابت کروا کے مجھے پروف ریڈنگ کے لئے دی- پروف ریڈنگ بھی ہوگئی- لیکن اس کے بعد چند ناگزیر وجوہ کی بناء پر اس مجموعے کو شائع کرنے کے لئے مزید کام نہیں ہوسکا- وہ پلندہ میرے پاس اب تک محفوظ ہے-

اس مجموعے میں 1972ء سے لے کر 1985ء تک کے کچھ افسانے ہیں- کچھ کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ ناولٹ اور افسانے تو اس دوران بہت سے شائع ہوئے تھے- خواتین ڈائجسٹ' ماہنامہ شعاع' ماہنامہ کرن اور ماہنامہ حنا میں- لیکن ایک ہی مجموعے میں سارے ناولٹ اور سارے افسانے شامل نہیں کیے جا سکتے تھے-

مجھے نہیں معلوم کہ گزشتہ 33 برس کے دوران شائع ہونے والے افسانوں اور ناولٹ کا مجموعہ چھپنا چاہئے تھا یا نہیں؟ لیکن بلو جس کام کا ارادہ کر لے اسے پایہ تکمیل تک پہنچا کر ہی رہتا ہے- خدا کرے کہ اس کی یہ محنت اور کوشش رائیگاں نہ جائے-

ہر افسانے کے عنوان کے نیچے سنہ بھی تحریر کیا گیا ہے تاکہ قارئین کو اندازہ ہوسکے کہ یہ افسانے پچھلے دس بارہ برسوں میں نہیں لکھے گئے ہیں- 33 برسوں میں دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے- نئی نئی اصطلاحات سننے اور پڑھنے میں آتی ہیں- انگریزی کے بیشتر الفاظ کی ادائیگی جس طرح کی جاتی ہے' پندرہ بیس برس پہلے تک کانونٹ میں پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں بھی ان الفاظ کو اس طرح نہیں بولتے تھے-

گھروں' اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیز کا ماحول بھی یہ نہیں تھا جو گزشتہ کئی سالوں سے دیکھنے میں آتا ہے- آج کے دور کی بیشتر نانیاں دادیاں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں- جو کانونٹ کی پڑھی ہوئی نہیں ہیں وہ بھی بہترین انگلش میڈیم اسکولوں اور اچھے کالجوں کی تعلیم یافتہ ہیں- ان میں ڈاکٹر بھی ہیں' انجینئر بھی ہیں' بہترین کالجوں میں پروفیسر ہیں- سرکاری ملازمتوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں- وہ اپنے نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں سے انگریزی میں بات کرتی ہیں- انہیں کمپیوٹر سے متعلق معلومات حاصل ہیں-

ان سب باتوں کی وضاحت کرنا اس لئے ضروری معلوم ہوا تاکہ میرے افسانوں کو پڑھتے ہوئے اگر قارئین کو نانیوں اور دادیوں کے کرداروں کی مخصوص زبان پڑھنے کو ملے تو وہ اس بات کو ضرور مدنظر رکھیں کہ یہ افسانہ کس دور کے پس منظر میں لکھا گیا ہے-

اس مجموعے میں میری جو تحریریں شامل ہیں- اتفاق سے ان میں کالج یا یونیورسٹی سے متعلق کوئی افسانہ نہیں ہے- ورنہ یقیناً اس میں جو ماحول دکھایا جاتا' وہ بھی آج کے دور سے مختلف ہوتا-

سیاسیات میں آنرز' پھر ماسٹرز اور اس کے بعد اردو ادب میں ماسٹرز کرنے کے دوران ہی مجھے یونیورسٹی میں ArchiresDepartment میں ریسرچ آفیسر کی جاب مل گئی تھی- اس طرح میں 1979ء تک یونیورسٹی سے وابستہ رہی- اس وقت تک یونیورسٹی میں دو ہی فیکلٹیز تھیں- ایک آرٹس فیکلٹی' دوسری سائنس فیکلٹی- یونیورسٹی کیمپس میں آئی- بی- اے کی بلڈنگ بہت فاصلے پر تھی- اس کا نظام بالکل الگ تھلگ تھا-

1979ء میں جب میں نے جاب چھوڑی تو کچھ اس طرح یونیورسٹی کو خیر باد کہا کہ پھر کبھی وہاں جانا ہی نہیں ہوا- اکثر سننے میں آتا رہتا تھا کہ اب وہاں یہ تبدیلی آگئی ہے اب یہ تبدیلی آگئی ہے- کچھ نئے ڈیپارٹمنٹس بھی وجود میں آگئے-

کالجوں اور یونیورسٹی میں پڑھنے والی لڑکیاں اگر میرے افسانے پڑھیں گی تو انہیں وہ ماحول نہیں ملے گا جو وہ آج کل دیکھتی ہوں گی- لیکن اگر وہ اپنی امی سے کسی خالہ چچی' مامی یا پھوپھی سے پوچھیں گی تو یقیناً وہ انہیں بتائیں گی کہ اس دور میں جب وہ پڑھتی تھیں یہی ماحول تھا جو ان افسانوں میں ہے-

کالجوں اور یونیورسٹی سے ہٹ کر بھی اپنے اردگرد جو ماحول ہم دیکھتے ہیں' وہ بھی اس ماحول سے مختلف ہے جو بیس پچیس سال پہلے تھا- اس زمانے میں بہت سے سینما ہاؤس تھے- نت نئی فلمیں لگتی تھیں- اور سینما ہاؤس جا کر فلم دیکھنا بہت اچھی تفریح سمجھی جاتی تھی- پھر وی- سی- آر کا دور آیا- لوگوں کو گھر بیٹھے انڈین موویز دیکھنے کو ملنے لگیں- وی- سی- آر کے بعد ڈش اینٹینا نے زور پکڑا اور اب کیبل کا دور ہے- اتنے چینلز ہیں اور ہر چینل پر پروگراموں کی بھرمار ہے- گھر بیٹھے لوگوں کو تفریح میسر ہے تو لوگ سینما ہاؤس کا رخ کیوں کریں گے؟

پہلے ٹرانسسٹر' ریڈیو اور ریکارڈ پلیئر کا دور تھا- اب ڈیک' ساؤنڈ سسٹم سی- ڈیز' وی- سی ڈیز اور ڈی- وی ڈیز کے الفاظ سننے میں آتے ہیں- پہلے دوسرے شہروں اور بیرون ممالک رہنے والے عزیزوں اور رشتے داروں سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ رکھا جاتا تھا- کال بک کروائی جاتی تھی لیکن سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے زندگی کے لئے بہت سی سہولتیں فراہم کی ہیں- کمپیوٹر رابطے کا بہت بڑا ذریعہ بن گیا ہے- بیرون ممالک بیٹھے ہوئے اپنے بیٹوں بیٹیوں اور دوسرے عزیزوں سے آپ نہ صرف بات کر سکتے ہیں بلکہ انہیں دیکھ بھی سکتے ہیں- بعد میں لکھے جانے والے افسانوں اور ناولٹ میں ایسے ہی ماحول کی عکاسی کی گئی ہے خواہ وہ میرے ہوں یا کسی اور مصنفہ کے-

یہ قارئین کی محبت' ان کا خلوص ہے اور بلو (ناصر ریاض) کی کوششیں ہیں جس کی وجہ سے میں نے اپنے کچھ افسانوں کو کتابی شکل میں چھپوانے کی ہمت کی- اللہ سے دعا ہے کہ بلو کی کوشش کو پذیرائی حاصل ہو- اگر اس کی یہ پرخلوص کوشش رائیگاں نہ گئی' تو پھر اپنے ناولٹ میں سے بھی کچھ کو یکجا کرنے کی کوشش کروں گی تاکہ محمود ریاض صاحب کی خواہش پوری ہو سکے-

میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ یہ بلو (ناصر ریاض) کا شوق' اس کی لگن' اس کی محنت اور اپنے فن سے اس کی محبت ہے جو یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے- اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کے فن کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے- اسے صحت و تندرستی کے ساتھ اپنے گھر والوں کے درمیان سلامت رکھے- آمین-

رضیہ جمیل
02 **اگست** 2004

بدریا برس گئی اس پار

جنوری 1977ء

موسم بہار کی پہلی بارش اسی صبح ہوئی تھی- آنکھ کھلنے پر اس کے کانوں میں جو سب سے پہلی آواز آئی، وہ رم جھم برستی پھوار کی آواز تھی- وہ سر تک چادر اوڑھے لیٹی رہی اور بند دریچوں کے شیشوں سے ٹکراتی ہوئی بوندوں کا مدھم ساز سنتی رہی، بستر سے اٹھنے کو اس کا ذرا بھی دل نہ چاہا- اس نے لیٹے ہی لیٹے یونیورسٹی جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا-

سارا دن تھم تھم کے بارش ہوتی رہی اور اودے، کالے اور سرمئی بادل آسمان کی وسعتوں پر دوڑتے بھاگتے رہے- اس شام ڈاکٹر منصور اس کے سامنے پہلی بار اس گھر میں آئے- وہ پی، ایچ، ڈی کر کے چھ سال بعد وطن لوٹے تھے- انہیں آئے ہوئے آٹھ دس روز سے زیادہ نہیں ہوئے تھے- آسیہ اور تحریم تو ان سے مل آئی تھیں- خالہ امی نے کہا تو اس سے بھی تھا لیکن وہ نہیں گئی-

اور وہ بھلا جاتی بھی کیوں؟

اس کی ان سے کیا رشتے داری تھی؟

وہ آسیہ اور تحریم کے تایا زاد بھائی تھے-

خالہ امی کے لاڈلے بھتیجے تھے-

لیکن اسے اپنے ساتھ منصور کا کوئی تعلق، کوئی واسطہ محسوس ہی نہ ہوا، پھر محض رسمی طور پر جانا اسے قطعی نامناسب لگا- آسیہ اور تحریم سے اس نے منصور کا نام تو اکثر سنا تھا، ان کی تصویریں بھی دیکھی تھیں لیکن بذات خود انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا- آسیہ نے ہی اسے بتایا تھا کہ وطن واپس آنے کے بعد منصور شعبہ بین الاقوامی تعلقات میں پڑھائیں گے-

شام کو جس وقت منصور آئے تو بادل کچھ زیادہ ہی گہرے ہو گئے تھے خالہ امی، تحریم اور آسیہ باہر والے برآمدے میں کین کی رنگ برنگی کرسیوں پر بیٹھی گزشتہ شام کی کسی تقریب پر زور و شور سے تبصرہ کر رہی تھیں- اور وہ خود ان لوگوں کے قریب ہی ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑی تھی- اور اپنے کھلے ہوئے الجھے بالوں کو انگلیوں سے آہستہ آہستہ سلجھا رہی تھی اور ان لوگوں کی باتیں سنتی جا رہی تھی- اس کا کنگھا اور تیل کی شیشی کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھی ہوئی تھی خالہ امی کے منع کرنے کے باوجود وہ صبح سے ہی نہانے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی، لیکن سستی تھی کہ کسی طرح پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہی تھی-

منصور بغیر کسی اطلاع کے بالکل اچانک آ گئے تھے، منصور کو دیکھتے ہی سوائے اس کے باقی سب کے چہرے مسرت سے کھل اٹھے، اس نے انہیں اتنی آہستہ سے سلام کیا کہ وہ سن بھی نہ سکے لیکن سر کی خفیف جنبش سے انہیں یہ خیال آیا کہ غالباً سلام کیا گیا ہے، انہوں نے بھی اسی انداز سے جواب دے دیا، مگر دل میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکے-

''یہ نیا چہرہ کون ہے؟''

خالہ امی نے انہیں بہت زیادہ سوچ بچار میں مبتلا نہ ہونے دیا، عائشہ کا تعارف کراتے ہوئے بولیں-

''عائشہ کو تم نہیں جانتے ہو گے منصور بیٹے؟''

''نہیں، بالکل نہیں-''

''یہ میری بھانجی ہے-''

''اچھا-''

''میری بہن کا انتقال ہو گیا تھا پچھلے دنوں، جب سے یہ میرے ہی پاس ہے-''

خالہ امی اپنی اکلوتی بہن کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئیں منصور یا تو سچ مچ ہی اس بات سے متاثر ہو گئے، یا پھر محض رسمی طور پر بولے-

''اوہو! بہت افسوس ہوا، کیا کچھ بیمار تھیں آپ کی بہن؟''

خالہ امی ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں-

''وہ غریب تو شادی کے بعد ہمیشہ بیمار ہی رہی-''

آسیہ نے امی کو اداس ہوتے دیکھا تو جلدی سے موضوع بدل دیا اور بولی-

''امی! منصور بھائی پکوڑے تو کھائیں گے نہیں چائے کے ساتھ- ان کے لیے بوا سے کوئی میٹھی چیز بنوا دوں؟''

''ہاں! منصور کو کہاں عادت رہی ہو گی اب ان چیزوں کی-''

آسیہ اٹھ کر اندر گئی تو خالہ امی نے عائشہ کی طرف دیکھا جو سر جھکائے اپنے کام میں مشغول تھی-

''بیٹی! تم بھی جلدی سے غسل کر کے آ جاؤ، چائے بننے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے-''

عائشہ نے کنگھا اور تیل کی شیشی اٹھاتے ہوئے کہا-

''جی بس میں جا ہی رہی ہوں-''

اس لمحے منصور نے بھی کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، مسٹرڈ کلر کے ملگجے سے کپڑوں میں وہ اپنی ذات سے بھی بے نیاز سی نظر آ رہی تھی- چھوٹی سی خوبصورت ناک میں جگمگاتی ہوئی سرخ نگ کی کیل اس کے حسن میں کچھ اور اضافہ کر رہی تھی- کتنا صاف وشفاف اور بے داغ چہرہ تھا اس کا، اپنے گھنے، خمدار بال پشت پر بکھرائے وہ اندر چلی گئی- اس کے اوجھل ہونے تک منصور کی نگاہیں اس کے دوپٹے سے الجھتی رہیں، جس کا ایک سرا لمبا ہو کر زمین سے گھسٹتا ہوا چلا جا رہا تھا-

وہ غسل کر کے آئی تو اس وقت خالو جان اور وقاص بھی آ چکے تھے، گھر کی فضا میں پکوڑوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی- عصر کی نماز پڑھ کر وہ بھی باہر آ کر بیٹھ گئی- آسیہ ٹرے میں پکوڑے اور چٹنی لیے چلی آ رہی تھی سوائے عائشہ کے سبھی نے پکوڑوں پر لمبے لمبے ہاتھ مارے، منصور نے پکوڑوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا-

آسیہ بار بار عائشہ کو ٹہوکے دے رہی تھی-

''جلدی جلدی کھاؤ نا، ختم ہو جائیں گے-''

''یہ مرچ والے پکوڑے لو-''

''آلو کے پکوڑے بھی مزیدار ہیں، یہ بھی لو-''

''چٹنی اور دوں تمہیں؟''

عائشہ اپنے خوبصورت ہونٹ دانتوں تلے دبائے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کیے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی-

''کس قدر بچپنا ہے آسیہ میں-''

وقاص اسے بار بار ٹوک رہا تھا-

''اپنا پیٹ سمجھ کے کھایئے آپی-''

تحریم خلاف معمول بڑی خاموش اور سنجیدہ بنی بیٹھی تھی، وقاص کا خیال تھا کہ وہ یقیناً کسی مردے کی ہڈیاں گننے میں مصروف ہے-تحریم میڈیکل کی اسٹوڈنٹ تھی، اس لئے وقاص اکثر اس کے ساتھ اسی قسم کی فقرے بازی کیا کرتا تھا-

چائے ختم ہوئی تو عائشہ اٹھ کر اندر آ گئی- پھر رات کے کھانے پر ہی اس کا سامنا ان لوگوں سے ہوا تھا- کھانا کھا کر وہ اور آسیہ باہر لان میں ٹہلتی رہیں اور ہلکی ہلکی پھوار میں بھیگتی رہیں- پھوار تیز ہوئی تو وہ بادلِ نخواستہ برآمدے میں آ گئیں-

آسیہ کو ایک دم یاد آیا کہ کل صبح کے لئے کپڑے تیار نہیں ہیں- وہ عائشہ کو وہیں چھوڑ کر سرپٹ کرتی اندر چلی گئی- عائشہ نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برآمدے کا چکر لگاتے ہوئے اپنی عادت کے مطابق گنگنانا شروع کر دیا، پھر وہ تھک کر برآمدے کی ریلنگ کے قریب رک گئی اور ریلنگ پر دونوں کہنیاں ٹیک کر باہر کی طرف جھک گئی- اس وقت منصور آسیہ کو خدا حافظ کہنے اس کے کمرے میں آئے تھے' وہ باتیں تو آسیہ سے کر رہے تھے لیکن ان کے کان عائشہ کی آواز پر لگے ہوئے تھے' اسے احساس ہی نہیں تھا کہ اس کے گنگنانے کی آواز ہوا کی لہروں پر ڈولتی ہوئی ان کے کانوں تک پہنچ رہی ہے- منصور نے بڑی مدت کے بعد اتنی خوبصورت آواز سنی تھی، اور گانے کے بول بھی ایسے تھے جو بڑی آہستگی سے ان کے دل کو ایک انجانے سے درد سے آشنا کر رہے تھے وہ آسیہ سے مل کر باہر آئے، عائشہ کے قریب انہوں نے محض ایک لمحے کے لئے رک کر خدا حافظ کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گئے، عائشہ نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا، وہ ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچ گئے تھے- سب لوگ انہیں رخصت کرنے کے لئے باہر نکل رہے تھے-

گھر سے نکل کر انہوں نے گاڑی کی رفتار قدرے تیز کر دی- ہوا کی لہروں پر ڈولتی ہوئی عائشہ کی آواز انہیں بالکل اپنے قریب ہی کہیں سنائی دی-

بدریا برس گئی اس پار
لیے کھڑی ہے پیت گگریا
جو گنیا اس پار

سارے راستے عائشہ کی آواز کی بازگشت انہیں سنائی دیتی رہی-

یہ ان دونوں کی پہلی ملاقات تھی-

مگر کیسی ملاقات؟

نہ ڈاکٹر منصور نے کچھ کہا-

نہ عائشہ نے کچھ کہا،

عائشہ کو نہ ان کے آنے کی خوشی تھی،

اور نہ ان کے چلے جانے کا کوئی غم،

خوشی تو بہت دور کی بات تھی-

اسے تو ان کے آنے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی-

اس کے نزدیک وہ محض آسیہ اور تحریم کے کزن تھے-

اور ڈاکٹر منصور......

ان کے جذبات بھی عائشہ کے جذبات سے کچھ مختلف ہوتے اگر وہ اسے گنگناتے ہوئے نہ سن لیتے-

رات جب وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹے تو وہ اس حقیقت کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکے کہ-

انہیں عائشہ کی آواز نے متاثر کیا تھا-

بے حد متاثر

یا پھر شاید گانے کے بول انہیں متاثر کر گئے تھے-

لیکن نہیں،

انہوں نے اگلے ہی لمحے اپنے اس خیال کو جھٹک دیا-

''صرف گانے کے بول اتنے اثر انگیز نہیں ہو سکتے، یقیناً اس کی آواز کا جادو بھی اس میں شامل ہے-''

دوسری بار ایسا ہوا کہ عائشہ کو یونیورسٹی سے آئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ڈاکٹر منصور بھی آ گئے- آسیہ کالج سے اس وقت تک نہیں آئی تھی، تحریم ہمیشہ ہی دیر سے آتی تھی، عائشہ کپڑے بدل کر کھانا کھانے آئی تو خالہ امی کے ساتھ منصور بھی موجود تھے، اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر سلام کیا اور خالہ امی کے برابر میں بیٹھ گئی، خالہ امی کو جانے کیا سوجھی، ایک دم عائشہ کی طرف دیکھ کر بولیں-

''اب تو منصور بھی یونیورسٹی جانے لگے ہیں عائشہ؟''

عائشہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دے، وہ خاموش رہی-

''تم منصور کے ساتھ کیوں نہیں آ جاتیں-''

''جی-''؟ عائشہ نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا-
''اور کیا، ناحق بسوں میں دھکے کھاتی ہو-''
عائشہ نے پیاس نہ ہونے کے باوجود پانی کا گلاس منہ سے لگا لیا-
''کیوں منصور بیٹے، میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''
''جی چچی جان! مجھے تو کوئی اعتراض نہیں-''
اب عائشہ نے چپ رہنا مناسب نہ سمجھا-
''یونیورسٹی میں آج کل بسوں کی کمی نہیں ہے، بہت آسانی سے جگہ مل جاتی ہے-''
''لیکن بیٹی! گاڑی میں تم زیادہ آرام سے آجاؤ گی اور جلدی بھی پہنچ جاؤ گی-''
عائشہ نے کہا-
''میرے اور ان کے اوقات مختلف ہیں، میں عموماً دیر سے آتی ہوں-''
''آج تو تم دونوں ساتھ ساتھ ہی آئے ہو-''
''جی، بس اتفاق ہی سمجھئے-'' عائشہ نے کہا-
''ہاں تو جب کبھی تم دونوں ساتھ ساتھ نکلو تو آجایا کرو-''
عائشہ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی-
کھانا کھا کر وہ واش بیسن میں ہاتھ دھو رہی تھی کہ خالہ امی نے آکر کہا-
''منصور کھانا کھانے کے بعد کافی پینے کا عادی ہے عائشہ-''
''جی بہت بہتر، میں ابھی بنا دیتی ہوں-''
''منصور بیٹے، اگر تم آرام کرنا چاہو تو وقاص کے کمرے میں چلے جاؤ-''
''جی ہاں، آرام تو کروں گا میں تھوڑی دیر-''
عائشہ باورچی خانے میں چلی گئی تو خالہ امی منصور کو لیے ہوئے وقاص کے کمرے کی طرف چلی گئیں- عائشہ کافی بنا کر لائی تو منصور کمرے میں تنہا تھے- عائشہ کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے اٹھ کر اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی اور بولے-
''بڑی زحمت ہوئی آپ کو-''
''قطعی نہیں، کافی بنانا کوئی محنت طلب کام تو ہے نہیں-''
''پھر بھی آپ تھکی ہوئی ہیں، آپ کے آرام کا وقت ہے-''
عائشہ خاموش رہی-

''اب میں جاؤں، اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں آپ کو؟''
''نہیں، شکریہ-''
عائشہ ان کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی، لیکن منصور اس کے سراپے میں الجھ کر رہ گئے-
پھر ان کی تیسری ملاقات یونیورسٹی میں ہوئی- عائشہ جرنلزم میں تھی منصور کا ڈیپارٹمنٹ اس کے ڈیپارٹمنٹ کے بالکل برابر میں تھا- منصور گھر جانے کے لئے اپنے کمرے سے نکلے تو عائشہ لیکچر اٹینڈ کر کے باہر آرہی تھی- اس نے منصور کو دیکھ تو لیا تھا لیکن وہ نظریں بچا کر چپ چاپ آگے بڑھ گئی- منصور نے قریب کھڑے چپراسی کو بھیج کر اسے بلوایا- عائشہ کو مجبوراً واپس پلٹنا پڑا، وہ قریب آئی تو منصور نے پوچھا-
''آپ گھر جا رہی ہیں؟''
''جی-''
''چلیے، میں ڈراپ کر دوں گا-''
''شکریہ، میں بس سے چلی جاؤں گی-''
''آج میرے اور آپ کے گھر جانے کے اوقات مختلف نہیں ہیں-''
''جی......؟'' عائشہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا-
ان کے ہونٹوں پر بڑی مدھم سی مسکراہٹ تھی-
''آپ کو شاید علم نہیں کہ ہر علاقے کے لئے ایک بس مخصوص ہے، میری بس مجھے گھر کے بالکل قریب اتارے گی-''
''آپ فکر نہ کیجئے، میں آپ کو بالکل دروازے پر اتاروں گا-''
''لیکن......''
''لیکن ویکن کچھ نہیں، میں چچی جان کی بات نہیں ٹال سکتا-''
''میرا خیال ہے، یہ مناسب نہیں ہے-''
''اس سلسلے میں آپ کو مزید کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے-''
عائشہ نے پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا-
''آیئے!''
عائشہ چپ چاپ ان کے ساتھ چلدی، گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے ایک دفعہ پھر انہیں ٹالنے کی کوشش کی، لیکن اسے احساس ہوا کہ اس نے ناحق ہی اتنی بکواس کر ڈالی-

ڈاکٹر منصور نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

''اگر آگے بیٹھنے میں کوئی اعتراض ہو تو پیچھے بیٹھ جائیے۔''

عائشہ نے سوچا۔

''آگے بیٹھوں یا پیچھے بیٹھوں، میرے نزدیک کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

وہ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر ان کے برابر بیٹھ گئی۔

گاڑی کیمپس کی حدود سے باہر نکلی تو ڈاکٹر منصور نے کہا۔

''آپ بہت غیریت برتتی ہیں۔''

عائشہ خاموش رہی۔

''میں گھر آتا ہوں جب بھی آپ خاموش رہتی ہیں۔''

عائشہ پھر بھی چپ رہی۔

''آخر تحریم اور آسیہ بھی تو ہیں۔ وہ دونوں....''

''ان دونوں سے آپ کی رشتہ داری ہے ڈاکٹر صاحب۔''

ڈاکٹر منصور نے گاڑی چلاتے ہوئے محض ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ سے کوئی رشتہ داری نہیں؟''

''نہیں۔''

''میں تو ایسا نہیں سمجھتا، میرے نزدیک تو آپ میں اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔''

''حقیقت بہر حال حقیقت ہے۔''

ڈاکٹر منصور چند لمحے خاموش رہے، پھر بولے۔

''یونیورسٹی میں اگر آپ کو کسی قسم کی دقت پیش آئے تو مجھے بتائیے گا۔''

''بڑی مہربانی آپ کی۔''

''میرا مطلب ہے میرے لائق کوئی خدمت ہو تو......''

عائشہ خاموش رہی، ڈاکٹر منصور نے بھی پھر کوئی بات نہیں کی وہ دونوں گھر پہنچے تو آسیہ برآمدے میں ہی کھڑی تھی، انہیں ساتھ دیکھ کر اس نے کسی حیرت اور تعجب کا اظہار نہیں کیا۔

اجنبیت کی دیوار تو گر چکی تھی، لیکن تکلف اب بھی برقرار تھا۔ عائشہ نے ایک حد مقرر کر رکھی تھی، اس حد سے آگے نہ وہ خود بڑھتی تھی اور نہ ڈاکٹر منصور کو بڑھنے دیتی تھی۔ روز اول کی طرح وہ اب بھی اسی رکھ رکھاؤ سے ان سے ملتی تھی۔

بلا ضرورت لب نہ کھولنے کی اس نے قسم کھا رکھی تھی۔

دھیمی آواز،

مختصر جملے،

مدھم مسکراہٹیں،

ان سب کو جیسے اس نے اپنی زندگی کا اصول بنا رکھا تھا۔

ایک شام خالہ امی نے بیٹھے بٹھائے عائشہ کو ڈاکٹر منصور کے گھر لے جانے کا پروگرام بنالیا، وہ خود تو اکثر جاتی رہتی تھیں، باقی لوگ بھی جاتے تھے، عائشہ کے پاس ہمیشہ نہ جانے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ موجود رہتا تھا، لیکن اس روز اس کے ہر حیلے بہانے کو مسترد کر دیا گیا، خالہ امی سے بڑھ کر آسیہ اس کے پیچھے پڑ گئی۔

''آج تو میں تمہیں ساتھ لیے بغیر نہیں جاؤں گی۔''

''مگر میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟''

''میں کیا کرتی ہوں وہاں جا کر۔''

''میں کیا بتا سکتی ہوں۔''

''نہیں بتا سکتیں تو آج ساتھ چل کر دیکھ لینا۔''

''تم جانتی ہو مجھے کہیں آنا جانا پسند نہیں۔''

''عاشی پلیز! اپنی یہ عادت چھوڑ دو، اپنے آپ کو اس خول سے باہر نکالو۔''

''میں اس طرح بہت سکون سے رہتی ہوں۔''

''لیکن میں تمہیں بے سکون کرنا چاہتی ہوں۔''

''مجھے بے سکون کر کے تمہیں کیا فائدہ حاصل ہوگا۔''

''فائدے نقصان کے بارے میں میں کبھی نہیں سوچتی۔''

خالہ امی نے ان دونوں کی بحث ختم کراتے ہوئے کہا۔

''اس بحث کو ختم کرو آسیہ! عاشی آج میرے ساتھ ضرور جائے گی، یہ میرا فیصلہ ہے۔''

عائشہ نے منت کی۔

''پلیز خالہ امی۔''

''نہیں، اب ایک لفظ نہیں سن سکتی، جاؤ فوراً کپڑے بدلو۔''

عائشہ منہ بسورتے ہوئے اٹھ گئی۔

منصور نے خلاف توقع عائشہ کو دیکھا تو انہیں ایک انجانی سی خوشی کا احساس ہوا۔

اسی شام ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے وہ اچانک عائشہ سے پوچھ بیٹھے۔

''آپ نے جرنلزم کا انتخاب کیوں کیا؟''

''مجھے یہ سبجیکٹ پسند ہے۔''

''ایم۔اے کے بعد آپ کیا کریں گی؟''

''کسی اخبار میں سروس کرنے کا ارادہ ہے اگر مل جائے تو۔''

''میرا خیال ہے صحافت سے وابستہ خواتین کو مرد کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔''

''مردوں کا کیا ہے، وہ تو کسی بھی پیشے سے منسلک خواتین کو اچھا نہیں سمجھتے۔'' عائشہ کا لہجہ تلخ تھا۔

''نہیں، خیر ایسی بات تو نہیں ہے۔''

''صورتحال یقیناً یہی ہے۔''

پھر منصور کے کچھ کہنے سے قبل ہی آسیہ بول پڑی۔

''چھوڑیے منصور بھائی، کوئی اور بات کیجئے۔''

''اچھا چلو تم ہی کوئی بات کرو۔''

''یہ بتائیے فلم کب دکھا رہے ہیں۔''

''جب تم کہو۔''

''پرسوں سنڈے ہے، تحریم کو بھی فرصت ہوگی۔''

''ٹھیک ہے کونسی فلم دیکھوگی۔''

''جو بھی آپ دکھادیں۔''

''اردو یا انگریزی۔''

''اردو فلمیں تو سبھی ایک جیسی ہوتی ہیں، وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟''

''جاؤ پھر بھاگ کے اخبار اٹھا لاؤ دیکھیں کون کون سی فلمیں لگی ہوئی ہیں۔''

آسیہ اخبار لینے گئی تو عائشہ بھی اٹھ کر اندر چلی گئی۔

اور اتوار کے دن پھر وہی مسئلہ تھا، عائشہ نے پکچر جانے سے صاف انکار کر دیا تھا، شام کو منصور آئے تو آسیہ نے انہیں چپکے سے بتادیا۔

''عاشی نہیں جارہی ہے منصور بھائی۔''

''کیوں؟''

''اس کو فلموں کا بہت زیادہ شوق نہیں ہے۔''

''پھر......؟''

''پھر یہ کہ آپ ان کے اوپر رعب جما کر انہیں آمادہ کیجئے۔''

''میرا خیال ہے انہوں نے اپنے اوپر رعب جمانے کا حق مجھے ہرگز نہیں دیا ہے۔''

''اوہو، یہ تو مجھے بھی معلوم ہے، لیکن پھر بھی میں اندازہ کرنا چاہتی ہوں کہ......''

''تم مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈالو آسیہ۔''

''بڑے کم ہمت اور بزدل ہیں آپ۔''

''جو چاہو کہہ لو۔''

''عاشی نہیں جائے گی تو میرا جانا بھی کینسل سمجھئے۔''

''یہ تو سراسر زیادتی ہے تمہاری۔''

''تو پھر آپ عاشی کو آمادہ کیجئے۔''

''اچھا کوشش کرتا ہوں، امید تو نہیں کہ وہ مان جائیں گی۔''

آسیہ نے شرارت سے کہا:

''جائیے، خدا پہ بھروسہ رکھئے۔''

عائشہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی، منصور کے قدموں کی آہٹ سن کر اس نے نظر اٹھا کر دیکھا اور اپنے مخصوص انداز میں سلام کیا۔ منصور نے سر کی خفیف سی جنبش سے جواب دیا اور بولے:

''میں نے سنا ہے آپ ہمارے ساتھ فلم دیکھنے نہیں جارہی ہیں۔''

''آپ نے ٹھیک سنا ہے۔''

''میں اس کی وجہ معلوم کر سکتا ہوں۔''

''کوئی خاص وجہ نہیں۔''

''عام ہی سہی۔''

''مجھے فلموں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔''

''ٹھیک ہے، لیکن اس وقت آپ ضرور چلیں گی۔''

''جی......؟'' عائشہ نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا، ان کا لہجہ کس قدر تحکمانہ تھا۔

''میں ہر بات میں انکار سننے کا عادی نہیں ہوں۔''

اس دفعہ ان کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔

عائشہ کی حیرانی کچھ اور بڑھ گئی۔

''آپ فوراً جا کر کپڑے بدلیے۔''

عائشہ ان کی طرف دیکھتی رہ گئی، لیکن کچھ نہ بول سکی جانے اس کی زبان کو کیا ہو گیا تھا۔

اس نے آہستہ آہستہ اخبار کے بکھرے ہوئے اوراق سمیٹنے شروع کیے تو منصور نے کہا۔

''دیر نہ کیجئے، وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے۔''

عائشہ اخبار چھوڑ کھڑی ہوگئی، جاتے جاتے اس نے پلٹ کر منصور کی طرف دیکھا۔

وہ ایک لمحے کے لئے رکی،

یوں جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو،

لیکن پھر چپ چاپ باہر نکل گئی۔

منصور کہنے کو تو سب کچھ کہہ گئے لیکن وہ کتنے شرمسار تھے، اس کا اندازہ کسی کو نہ تھا۔

انہوں نے سوچا:

''یہ میں نے کیا کیا؟

مجھے بھلا کیا حق تھا اس سے اس انداز سے بات کرنے کا؟ وہ کیا سوچتی ہوگی؟

ان کی نگاہوں کے سامنے اس کا حیران حیران سا چہرہ تھا یوں پلکیں جھکائے بنا ان کی طرف دیکھتی ہوئی وہ کتنی اچھی لگ رہی تھی۔

عائشہ جب اپنے کمرے سے باہر آئی تو منصور نے دیکھا، وہ بڑی بددلی سے تیار ہوئی ہے۔ اس نے میک اپ تک نہیں کیا تھا، حالانکہ یونیورسٹی جاتے ہوئے وہ ہمیشہ ہلکا سا میک اپ کرتی تھی اپنے کھلے ہوئے گھنیرے اور خمدار بالوں کو اس نے ٹھیک سے سلجھائے بغیر ربن سے باندھ لیا تھا۔

اس سادگی کے باوجود وہ بے حد اچھی لگ رہی تھی۔

یا پھر حسن خود ڈاکٹر منصور کی نگاہوں میں تھا۔

نظریں بار بار اس کے سراپے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

انہوں نے حیران ہو کر سوچا:

''یہ آج انہیں کیا ہو گیا ہے؟''

آج سے پہلے تو انہوں نے اس انداز سے عائشہ کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔

وقاص نے بھی عائشہ کے سراپے کا جائزہ لیا اور بولا۔

''آپ کیا بستر سے اٹھ کر چلی آ رہی ہیں؟''

''نہیں تو۔'' وہ ایک دم ہنس پڑی۔

''بال بنانے کی بھی توفیق نہیں ہوئی آپ کو۔''

''پھر تم لوگ لیٹ ہو جاتے۔''

''کچھ بھی سہی، لیکن آپ کو یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ اگر میرا کوئی دوست مل گیا تو کتنی انسلٹ ہوگی

میری۔''

آسیہ نے کہا:

''بس اب خاموش ہو جاؤ وقاص، شکر کرو کہ آ گئی ہیں۔''

پکچر ہاؤس میں اسے منصور کے برابر سیٹ ملی لیکن وہ اس قسم کی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتی تھی۔

انٹرول ہوا تو بیک وقت اس نے منصور کی طرف اور منصور نے اس کی طرف دیکھا۔ منصور کی نگاہوں میں معذرت تھی، وہ لاتعلق سی ہو کر گیٹ سے باہر نکلنے والے لوگوں کو دیکھنے لگی۔

گھر پہنچ کر بھی اسے احساس ہوا کہ منصور اس سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن اس نے انہیں کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔

اور منصور کے خیالات اس روز منتشر ہو کر رہ گئے۔

وہ کس سے کہتے؟

کیسے بتاتے؟

کہ وہ انہیں کس کس انداز سے یاد آتی رہی۔

وہ اتنے دنوں سے اسے دیکھ رہے تھے

اس سے مل رہے تھے۔

مگر وہ بہت سکون سے تھے۔

نہ ان کی سوچیں پریشان ہوئی تھیں،

اور نہ ان کی راتیں بے خواب ہوئی تھیں،

ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ،

وہ عائشہ سے محض تین تحکمانہ جملے کہہ کر اسے اپنے اس قدر قریب محسوس کریں گے۔

بالکل قریب

رگِ جاں سے بھی قریب۔

یہ کیسا انقلاب ہے خدایا!

وہ مجھے اس قدر اپنی اپنی سی کیوں لگ رہی ہے؟

ہوا کی لہروں پر ڈولتی ہوئی عائشہ کی آواز انہیں بالکل قریب ہی کہیں سنائی دی۔

بدریا برس گئی اس پار\
لیے کھڑی ہے پیت گگریا\
جو گنیا اس پار

عائشہ! عائشہ!

مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈالو عائشہ!

انہوں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے سوچا۔

ہم ایک دوسرے کے نہیں بن سکتے،

تو ہم ایک دوسرے کے بارے میں کیوں سوچیں؟

اپنے ہی ہاتھوں اپنی راہوں میں کانٹے بچھانا کوئی عقل مندی تو نہیں۔

درد کا یہ خارستان نہ تمہیں راس آئے گا نہ مجھے۔

لیکن

یہ تو صرف میری سوچیں ہیں نا!

مجھے یقین ہے تم بہت سکون سے ہو۔

تمہارے دل میں کوئی جذبہ نہیں جاگا۔

''کیا زندگی میں لوگ یوں بھی اثر انداز ہو جایا کرتے ہیں؟'' انہوں نے سوچا۔

اور پھر انہوں نے فیصلہ کیا۔

وہ اپنے آپ کو ہر ممکن طریقے سے سمجھائیں گے۔

آخر وہ مرد ہیں۔

اور مرد بھی ایسے۔

جو اپنی زندگی میں کبھی کسی لڑکی سے متاثر نہیں ہوئے۔

لیکن بہرحال انہیں اپنے رویہ کی معافی ضرور مانگنی پڑے گی اس سے۔

انہیں کوئی حق نہیں تھا اس کے اوپر رعب جمانے کا۔

اگلے روز یونیورسٹی میں انہوں نے چپراسی کو بھیج کر اسے بلوایا۔ وہ ان کے کمرے میں پہنچی تو وہ اپنا بریف کیس بند کر رہے تھے اور گھر جانے کے لئے تیار تھے۔

وہ ان کے قریب جا کر کھڑی ہوگئی۔

''آپ گھر چلیں گی؟''

عائشہ نے خشمگیں نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''یہ آپ کا حکم ہے؟''

وہ ایک دم مسکرا دیئے اور بولے۔

''میں لوگوں کو حکم نہیں دیا کرتا۔''

''تو پھر کل کیا تھا؟''

''وہ ایک مجبوری تھی عائشہ۔''

انہوں نے پہلی دفعہ اس کا نام لیا۔

''کیسی مجبوری؟''

''بس تھی ایک مجبوری۔''

''اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بتا دیں۔''

''اگر آپ ساتھ چل رہی ہیں تو راستے میں بتا دوں گا۔''

عائشہ خاموش رہی۔

''نہ چلنا چاہیں تو کوئی زبردستی بھی نہیں ہے۔''

''چلئے۔''

''شکریہ۔'' ڈاکٹر منصور مسکرائے۔

گاڑی کیمپس کی حدود سے باہر نکلی تو ڈاکٹر منصور نے کہا۔

''دیکھئے عائشہ! مجھے نہیں معلوم کہ آپ اتنی الگ تھلگ اور خاموش کیوں رہتی ہیں لیکن......''

وہ ایک لمحے کے لئے رکے اور بولے:

''میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ آپ بھی تحریم اور آسیہ کی طرح ہنسیں بولیں، زندگی کو زندگی کی طرح گزاریں۔''

عائشہ چپ چاپ سنتی رہی۔

''کل مجھ سے جو حرکت سرزد ہوئی، میں اس کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔
میرا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ اس تفریح میں حصہ لیں۔
اور مجھے یہ بھی یقین تھا کہ اگر میں ہمیشہ کی طرح آپ سے تکلف سے بات کروں گا تو آپ ہمارے ساتھ چلنے پر رضامند نہیں ہوں گی۔''

عائشہ نے گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا اور بولی:

''بس اتنی سی بات تھی؟''

''جی ہاں، اگر آپ یقین کریں تو......''

''میں اگر اپنی زندگی کا انداز بدل دوں تو آپ کو کیا ملے گا۔''

''مجھے بے حد خوشی ہوگی۔''

''بس صرف خوشی ہوگی؟''

"آپ کے خیال میں اور کیا ہونا چاہئے؟"

ڈاکٹر منصور نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں میں یونہی کہہ گئی۔"

"یہاں یونیورسٹی میں بھی آپ کی کوئی سہیلی نہیں، میں نے ہمیشہ آپ کو تنہا ہی دیکھا ہے۔"

"جی ہاں، صورتحال کچھ ایسی ہی ہے۔"

"کوئی دوست بھی نہیں؟"

"نہیں، کوئی دوست بھی نہیں۔"

"آپ کو یہ بات عجیب نہیں لگتی؟"

"نہیں۔"

"لوگ آپ کے بارے میں کیا کہتے ہوں گے؟"

"یونیورسٹی میں لوگ مجھے مغرور اور خود پسند کہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقتاً میں ایسی نہیں ہوں، آپ بتائیے کیا میں ایسی ہی ہوں۔"

"آپ یقیناً ایسی نہیں ہیں، لیکن آپ کے انداز لوگوں کو ایسا سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

"لیکن میں کس کس کی پروا کروں؟"

"لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے آپ کو لوگوں کی پروا کرنی پڑے گی۔"

"لیکن آپ یہ بھی تو سوچئے ڈاکٹر منصور! کہ ہم بیک وقت تمام لوگوں کو خوش نہیں رکھ سکتے۔"

"آپ کی بات ٹھیک ہے عائشہ، لیکن......"

عائشہ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"اصل میں آپ کو اندازہ نہیں ہے ڈاکٹر صاحب، ذرا بھی تو اندازہ نہیں ہے......"

وہ جانے کیا کہتے کہتے رک گئی۔

"پل صراط پر کھڑا ہوا انسان کتنا خوفزدہ ہوتا ہے اور کتنا محتاط؟" عائشہ نے مدھم لہجے میں کہا۔

ڈاکٹر منصور نے چونک کر ایک ثانئے کے لئے اس کی طرف دیکھا اور دوبارہ اسٹیرنگ وہیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اگلے دن یونیورسٹی پہنچنے کے دو گھنٹے بعد اچانک بسوں کی اسٹرائیک ہو گئی۔ کلاسیں اٹینڈ کرنے کے بعد وہ خود ڈاکٹر منصور کے کمرے میں جا پہنچی۔

"آیئے عائشہ! میں ابھی آپ کو بلوانے ہی والا تھا۔"

"جی ہاں! آج بسوں کی اسٹرائیک ہے، اس لئے میں بغیر بلوائے ہی آ گئی۔"

"اچھا، آپ بیٹھئے، میں ابھی پانچ منٹ میں آتا ہوں۔"

عائشہ کھڑکی کے قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

گھر جاتے ہوئے راستے میں ڈاکٹر منصور نے عائشہ سے کہا۔

"آپ کو میری کل کی باتیں کچھ قابل عمل بھی معلوم ہوئیں؟"

"آپ کی باتوں پر عمل کرنا مشکل ہے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ اپنی روش پر قائم رہیں گی۔"

عائشہ خاموش رہی۔

"میں نے تو ایک اچھے دوست کی حیثیت سے آپ کو مشورہ دیا تھا۔" منصور نے کہا۔

"آپ کے جذبات کا شکریہ ڈاکٹر منصور! لیکن کسی بات پر عمل کرنے سے پہلے اس کے ہر پہلو پر غور کر لینا بھی تو بہت ضروری ہے۔"

"کتنے دن تک غور کریں گی؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"اچھا چھوڑیئے، یہ بتائیے آپ کو چائنیز کھانے پسند ہیں؟"

"جی ہاں، لیکن......"

عائشہ نے کچھ پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"جی کہئے، رک کیوں گئیں؟"

"اگر آپ کا ارادہ اس وقت چائنیز ریسٹورنٹ جانے کا ہے تو میں آپ کا ساتھ قطعی نہیں دے سکتی۔"

"مجھے اس قدر غیر ذمہ دار بھی نہ سمجھئے۔"

عائشہ نے اطمینان کا سانس لیا۔

"میں تحریم اور آسیہ کے بغیر آپ کو ساتھ لے جانے کی جرأت کبھی نہیں کروں گا جب تک آپ خود نہ چاہیں۔"

"میں کیوں چاہوں گی؟"

"فرض کر لیجئے، شاید کبھی ایسا ہو جائے۔"

"مجھے یقین ہے، ایسا کبھی نہیں ہوگا۔"

"وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔"

عائشہ خاموش رہی۔

''اور نہ خیالات بدلتے دیر لگتی ہے-'' ڈاکٹر منصور زیرلب مسکرائے-

عائشہ ان کے الفاظ پر غور کرتی رہ گئی-

ان دِنوں آس پاس کے شعبوں میں ڈاکٹر منصور کا بڑا چرچا تھا اسٹوڈنٹس ان سے بہت مرعوب اور متاثر تھے، خصوصاً لڑکیاں- اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ وہ بہت محنتی استاد تھے، ان کی شخصیت کی وجاہت اور ان کا انداز گفتگو بھی بہت متاثر کن تھا، جس طرف سے گزر جاتے تھے، بے شمار نگاہیں پسندیدگی کا انداز لئے ان کا تعاقب کرتی رہتی تھیں ان کے شعبے کی فائنل ایئر کی طالبہ تو بڑی سنجیدگی سے ان کے عشق میں مبتلا تھی- بقول لڑکوں اور لڑکیوں کے ان کی دیوانی بنی ہوئی تھی چاہنے والوں کے تو انداز بتادیتے ہیں، پھر شہناز حارث کے دلی جذبات دوسروں سے اور خود ڈاکٹر منصور کی نگاہوں سے کیسے پوشیدہ رہ سکتے تھے، وہ جس حد تک اسے نظرانداز کر سکتے تھے، کر رہے تھے-

عائشہ کا ڈاکٹر منصور کی گاڑی میں کبھی کبھی چلے جانا شہناز کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا، ایک روز شہناز بالکل اچانک عائشہ سے پوچھ بیٹھی-

''ڈاکٹر منصور آپ کے کون ہیں؟''

عائشہ ایک لمحے کے لئے چونک سی گئی-

''جی......!'' اس نے حیرت سے شہناز کی طرف دیکھا-

شہناز نے اپنا سوال دہرایا-

دل سے انہیں اپنا کزن نہ ماننے کے باوجود عائشہ کو کہنا پڑا-

''وہ میرے کزن ہیں-''

شہناز کا قصہ کوئی ڈھکا چھپا تو تھا نہیں، جو عائشہ کے علم میں نہ ہوتا لیکن پھر بھی اس نے پوچھ لیا-

''آپ کیوں پوچھ رہی ہیں''

''کوئی خاص بات نہیں، یونہی پوچھ رہی تھی-''

عائشہ چپ چاپ کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہی، شہناز نے فوراً بات بنائی-

''بہت اچھے استاد ہیں- وہ بہت محنت سے پڑھاتے ہیں-''

پھر دو چار ادھر ادھر کی باتیں کر کے وہ چلدی-

اسی شام ڈاکٹر منصور گھر آئے تو عائشہ نے کہا-

''شہناز آپ کے بارنے میں پوچھ رہی تھی-''

ڈاکٹر منصور چونکے!

''کون شہناز......؟''

''آپ کی شاگرد، شہناز حارث-''

''اچھا-'' ڈاکٹر منصور نے بے نیازی سے کہا-

''بہت مداح ہیں آپ کی-''...... عائشہ زیرلب مسکرائی-

ڈاکٹر منصور خاموش رہے-

عائشہ نے پھر کہا-

''میرا خیال ہے میرے بارے میں وہ کسی غلط فہمی کا شکار ہیں-''

ڈاکٹر منصور پھر بھی چپ رہے-

''اگر آپ کہیں تو میں ان کی غلط فہمی دور کردوں-''

''کیا بات ہے آج آپ بہت موڈ میں ہیں-'' ڈاکٹر منصور مسکرائے-

''آپ کی نصیحتوں پر عمل کر رہی ہوں-''

''واقعی، یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے-''

''ویسے شہناز اچھی لڑکی ہے، اگر آسیہ کا خیال نہ ہوتا تو میں ضرور اس کی سفارش کرتی-''

''آسیہ کا کیا ذکر ہے، آپ سے کسی نے کچھ کہا؟''

''نہیں تو، میرا اپنا اندازہ ہے-''

''آپ کا اندازہ غلط بھی تو ہوسکتا ہے-''

''ممکن ہے آپ ہی ٹھیک کہتے ہوں-''

آسیہ کے آجانے سے گفتگو کا موضوع بدل گیا-

اگلے روز اتوار تھا، گیارہ بجے کے قریب وہ نہا کر نکلی تو ڈاکٹر منصور کی پوری فیملی آئی ہوئی تھی- ان کی دونوں شادی شدہ بہنیں بھی مع اپنے ایک ایک عدد گود کے بچوں کے آئی ہوئی تھیں، وہ اپنے بالوں کو تولیہ میں لپیٹ کر خشک کر رہی تھی کہ تحریم آگئی-

''چچا جان آئے ہیں عاشی، سلام کرآؤ-''

''ابھی جاتی ہوں-'' اس نے بال جھٹک کر پشت پر پھیلا دیئے شمپو کی ہلکی سی مہک تحریم کی سانسوں میں جذب ہوگئی- ڈریسنگ ٹیبل سے کنگھا اٹھا کر عائشہ نے سامنے سے بالوں کو ذرا سا سلجھایا اور انہیں انگلیوں سے پیچھے کی طرف سمیٹتی ہوئی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئی-

سب کو سلام کر کے وہ آسیہ کے برابر بیٹھ گئی، عائشہ کو اچھی طرح احساس تھا کہ منصور کی دونوں بہنیں اسے بے حد پسندیدگی کی نظر سے دیکھ رہی تھیں- منصور اس کے بالکل سامنے بیٹھے تھے- لیکن انہوں نے بس ایک دفعہ دیکھ کر ہی اس کے سراپے کو نگاہوں میں بسا لیا تھا- چاکلیٹی رنگ اس

کے اوپر بہت سج رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں استری کر رہی تھی اور اپنی عادت کے مطابق دھیرے دھیرے گنگناتی جا رہی تھی۔ اپنے اردگرد سے وہ بالکل بے نیاز تھی۔ منصور جب اس کے پیچھے آ کر کھڑے ہو گئے تو وہ ایک دم چونکی اور کچھ شرمساری ہو گئی۔

منصور چند لمحوں تک چپ چاپ کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے، عائشہ دوبارہ نظریں ہی نہ اٹھا سکی، ورنہ دیکھتی کہ منصور کی نگاہوں میں کتنا والہانہ پن تھا۔

’’کیا گا رہی تھیں عائشہ؟‘‘

’’بس یونہی۔‘‘ عائشہ کے ہونٹوں پر جھینپی سی مسکراہٹ تھی۔

’’تمہاری آواز بہت اچھی ہے۔‘‘

عائشہ خاموش رہی۔

’’تم یہ گانا بہت گنگناتی ہو۔‘‘

’’جی، مجھے پسند ہے۔‘‘

’’بہت المیہ گانا ہے، مت گایا کرو۔‘‘

’’آسیہ بھی یہی کہتی ہے۔‘‘ عائشہ ہنسی۔

’’بعض دفعہ ایسے گانوں کا اثر زندگی پر بھی پڑ جایا کرتا ہے۔‘‘

عائشہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔

’’میری زندگی پر تو جو اثر پڑنا تھا پڑ چکا۔‘‘

منصور جانے کیا سمجھے، اس کے گھنیرے بالوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

’’یہ بھی تو ممکن ہے کہ کسی دوسرے کی زندگی پر اس کا اثر پڑے۔‘‘

’’ارے نہیں منصور صاحب، کسی کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہر روز جانے کتنے المیہ گانے سنتے ہیں ہم لوگ۔‘‘

’’اچھا چھوڑو، یہ بتاؤ فلم کا پروگرام بنایا جائے؟‘‘

’’ضرور بنائیے، لیکن مجھے شامل نہ کیجئے پروگرام میں۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’مجھے کل کے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔‘‘

’’رات کو پڑھ لینا۔‘‘

’’رات کو مجھے جلدی سونے کی عادت ہے۔‘‘

’’ایک دن دیر سے سو جانا۔‘‘

’’نہیں جاگا جاتا۔‘‘

’’اچھا پھر کل دیکھ لیں گے۔‘‘

’’کل کیوں؟ آج ہی دیکھ لیجئے، میرا جانا کوئی ضروری تو نہیں۔‘‘

’’یہ تو صرف تمہارا خیال ہے نا۔‘‘

’’عائشہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔‘‘

’’کل تو بہانہ نہیں بناؤ گی۔‘‘

’’بہانہ تو آج بھی نہیں بنایا۔‘‘ عائشہ نے دوپٹے پر استری کرتے ہوئے کہا۔

پھر ایک دم اسے جانے کیا سوجھی، منصور کی طرف دیکھ کر بولی:

’’آپ کافی دیر سے میرے پاس کھڑے ہیں۔‘‘

’’پھر......؟‘‘

’’میرا خیال ہے، اب آپ کو یہاں سے چلے جانا چاہیے۔‘‘

’’تم ڈرتی ہو؟‘‘

’’زندگی میں ہر قدم پر محتاط رہنا اچھی بات ہے۔‘‘

’’لیکن یہاں پر تمہارا ڈرنا بالکل بے جا ہے۔‘‘

’’میں نہیں چاہتی میرے بارے میں کسی کو کوئی غلط فہمی یا بدگمانی ہو۔‘‘

’’اس گھر میں سب تم سے بے حد محبت کرتے ہیں۔‘‘

’’آپ کا خیال درست ہے لیکن......‘‘

’’لیکن؟‘‘

’’غلط فہمی کا ناگ جب اپنا پھن اٹھاتا ہے تو شفقت و محبت کے جذبے کو ذرا سی دیر میں ڈس لیتا ہے۔‘‘

منصور دل ہی دل میں اس کی بات کو سراہے بغیر نہ رہ سکے۔

منصور کی کوششوں سے اتنا تو ہوا تھا کہ اب عائشہ ان سے بے تکلف ہو کر بات کرنے لگی تھی، لیکن یہ بے تکلفی دن بدن منصور کو بے آرام کرتی جا رہی تھی، وہ ان سے بات نہیں کرتی تھی تب بھی وہ بے قرار تھے اور اب بات کرنے لگی تھی تو بھی وہ بے چین تھے۔ اتنی ملاقاتوں کے بعد بھی وہ یہ نہیں سمجھ پائے تھے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔

وہ کیا سوچتی ہے؟

اس کے خیالوں میں کہیں ان کا گزر بھی ہے یا نہیں؟
اس موضوع پر اس سے بات کرنے کی ہمت ان میں بالکل نہیں تھی-
اپنے آپ کو مزید سمجھانا بھی ان کے بس میں نہیں رہا تھا-
کتنے الجھے الجھے سے رہتے تھے وہ ان دنوں-
اور یہ سوچ سوچ کر حیران ہوتے تھے کہ وہ اس قدر سگریٹ نوشی کرنے لگے ہیں-
اور پھر ہر بات میں وہ اپنے آپ کو بالکل بے اختیار پاتے ہیں-
ایک روز دوپہر کو یونیورسٹی سے واپسی پر' جب گھر بہت زیادہ دور نہیں رہ گیا تھا، منصور اچانک بولے:
''عائشہ!''
''جی......!''
''دن یا رات کے کسی حصے میں تمہیں میرا خیال کبھی نہیں آتا؟''
عائشہ نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا اور بولی-
''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟''
''اتنے دنوں میں میں نے تمہیں ذرا سا بھی متاثر نہیں کیا؟''
''اس انداز سے تو میں نے آپ کے بارے میں کبھی نہیں سوچا اور نہ میں اس کی جرات کر سکتی ہوں-''
منصور گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے دل کی بے قابو دھڑکنوں کو سنبھالتے رہے-
''لیکن آپ ڈاکٹر منصور! دوسرے مردوں سے تھوڑے مختلف ضرور ہیں-''
منصور کچھ نہیں بولے-
پھر عائشہ بھی سارے راستے خاموش رہی-
اس روز تحریم اپنی تھکن اتارنے کے لئے اس بات پر تلی بیٹھی تھی کہ رات کا کھانا کسی ہوٹل میں کھائے گی- لیکن اس وقت تک نہ ابو گھر پہنچے تھے نہ وقاص آیا تھا- وہ بری طرح بور ہو رہی تھی اور اپنی بوریت دور کرنے کے لئے ریڈیو گرام کے قریب بیٹھی اونچی آواز سے ریکارڈ سن رہی تھی-
''عائشہ جلدی سے تیار ہو جاؤ-''
''کیوں؟''
''کھانا کھانے جا رہے ہیں-''
''کہاں؟''

چائنیز ریسٹورنٹ-''
''کیوں، کیا گھر میں کھانا نہیں پکا؟''
''اوہو! تم بحث نہ کرو، جلدی تیار ہو جاؤ-''
عائشہ ٹرانسسٹر گود میں رکھے اس کی طرف دیکھتی رہی-
''جلدی اٹھو بھئی-''
''کون کون جا رہا ہے؟''
''امی اور ابو نہیں جا رہے-''
عائشہ نے ہاتھ بڑھا کر ٹرانسسٹر میز پر رکھ دیا اور کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی-
آسیہ اس کے قریب آ کر بولی-
''اور دیکھو، ڈھنگ سے تیار ہونا-''
''ڈھنگ سے کیسے تیار ہوتے ہیں؟''
''میرا مطلب ہے کوئی خوبصورت سی ساڑی باندھ لینا-''
''چھوڑو جی، ساڑی واڑی کون باندھتا پھرے گا-''
''تم باندھو گی اور کون باندھے گا-''
''نہیں بھئی آسی پلیز! یہ پابندی مت لگاؤ-''
آسیہ نے اس کی الماری کھولتے ہوئے کہا:
''میں ایک لفظ نہیں سننا چاہتی-''
اس نے ہینگر میں لٹکی ہوئی سرخ پھولوں والی نیوی بلیو امریکن جارجٹ کی ساڑی نکال کر عائشہ کی طرف بڑھائی-
''لو، یہ باندھ لو-''
عائشہ نے کچھ کہنا چاہا لیکن آسیہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا:
''کہا نا، ایک لفظ نہیں سنوں گی-''
عائشہ پلکیں جھپکا کر رہ گئی-
آسیہ نے اپنے کپڑے نکالتے ہوئے کہا:
''میک اپ بھی ٹھیک سے کرنا-''
عائشہ اس کے آگے کچھ بھی تو نہ بول سکی، وہ تیار ہو کر کمرے سے نکل رہی تھی کہ ایک دم منصور سامنے آ گئے اور اس کی طرف دیکھتے ہی رہ گئے-

وہ کتنی حسین لگ رہی تھی۔
اس کا یہ روپ منصور کے لئے بالکل نیا تھا۔
وہ کہے بغیر نہ رہ سکے۔
"عائشہ! یہ آپ ہیں؟"
"یقین نہیں آتا آپ کو؟"
"آپ ظلم کرتی ہیں عائشہ، اپنی ذات سے لاپرواہو کر۔"
وہ کچھ نہ کہنے کے باوجود بہت کچھ کہہ گئے،
اور عائشہ سمجھ جانے کے باوجود کہہ گئی،
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"
"آپ کو ذرا بھی احساس نہیں کہ یہ سب کچھ آپ پر کتنا اچھا لگتا ہے۔"
"کسی چیز کی محتاجی بہت ناگوار گزرتی ہے مجھے، میں چاہتی ہوں کہ لوگ اگر مجھے پسند کرنا چاہتے ہیں تو اصلی رنگ وروپ کے ساتھ پسند کریں۔"
منصور کا دل چاہا، وہ کہہ دیں:
میں نے تو تمہیں اصلی رنگ وروپ کے ساتھ پسند کیا ہے۔
لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکے۔
راستے بھر وہ بے حد سرشار رہے اور عائشہ کا موڈ بھی بہت اچھا رہا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی بے شمار نگاہیں عائشہ کی طرف اٹھ گئیں۔ عائشہ کا دل جانے کیوں بڑی زور سے دھڑک اٹھا۔
مدھم مدھم روشنیوں کا خوابناک سا ماحول۔
دھیمے سروں میں بجتے ہوئے ساز۔
چھری، کانٹوں، چمچوں اور پلیٹوں کا جلترنگ۔
اور ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو مدھم آوازیں۔
ان سب نے مل کر بھی اس کے اعصاب پر کوئی خوشگوار اثر نہیں چھوڑا۔
وہ جیسے پانی کی لہروں پر چلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی اور پھر ایک دم چونک پڑی۔
اتنی بہت ساری نگاہوں میں وہ دو نگاہیں کتنی تیز اور چبھ جانے والی تھیں۔
اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دو نگاہیں جسم کے اندر آرپار گزری جارہی تھیں۔
وہ سرتاپا سرد ہو کر رہ گئی۔
اس نے اپنے ساتھ چلتی ہوئی آسیہ کا ہاتھ بڑی مضبوطی سے تھام لیا۔

آسیہ نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔
"کیا بات ہے عاشی؟"
"کچھ نہیں۔"
"تمہارے ہاتھ اتنے سرد کیوں ہو رہے ہیں؟"
"معلوم نہیں۔" اس نے بڑی بے بسی سے آسیہ کی طرف دیکھا۔
اسی وقت تحریم نے چلتے چلتے پلٹ کر عائشہ کی طرف دیکھا اور پھر آسیہ بھی زیادہ دیر تک بے خبر نہ رہ سکی۔
آسیہ نے اسے تسلی دی۔
"اتنی نروس مت ہو عاشی! منصور بھائی کیا سمجھیں گے؟"
"کیا ہم لوگ واپس نہیں جا سکتے؟"
"کس قدر آکورڈ لگے گا، ذرا سوچو۔"
اس وقت تک منصور ایک میز کا انتخاب کر چکے تھے، وہ کونے والی آخری میز تھی۔ ہال میں بیٹھے ہوئے بے شمار لوگ پیچھے رہ گئے تھے لیکن عائشہ کو اب بھی ان دو نگاہوں کی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دانستہ ایسی سیٹ پر بیٹھی کہ باقی سارے لوگ اس کی پشت کی طرف رہیں۔ منصور اس کے بالکل سامنے بیٹھے تھے اور اس کے چہرے کے بدلے ہوئے رنگ کو دیکھ رہے تھے۔
وہ حیران تھے کہ یہ ایک دم اسے کیا ہو گیا۔
گھر سے وہ لوگ چلے تھے تو وہ بالکل ٹھیک تھی۔
تمام راستے اس کا موڈ بہت خوشگوار رہا تھا۔
پھر اب یہ تبدیلی کیسی تھی۔
چہرے کی ساری شگفتگی ماند پڑ چکی تھی۔
مگر وہ پوچھتے تو کس سے پوچھتے۔
انہوں نے بڑی ہمت کی اور آخر کار اپنے برابر میں بیٹھی ہوئی آسیہ سے پوچھ ہی بیٹھے۔
"عائشہ کی طبیعت کچھ خراب ہے؟"
آسیہ گھبرا کر بولی:
"جی، جی ہاں۔"
"کیا ہوا؟"
"وہ کچھ اختلاج کی سی کیفیت ہے۔"

منصور نے حیران ہو کر پوچھا:
''اختلاج؟''
''ہاں، کبھی کبھی انہیں ایسا ہو جاتا ہے۔''
''ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو بالکل ٹھیک تھیں۔''
آسیہ خاموش رہی۔
تحریم نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی عائشہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔
''اپنے آپ کو سنبھالو عاشی، تم اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟''
''میں اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہی ہوں تحریم۔''
منصور نے میز پر رکھا ہوا پانی کا جگ اپنی طرف کھسکایا اور گلاس میں پانی انڈیل کر عائشہ کی طرف بڑھایا۔
''لیجئے، تھوڑا سا پانی پی لیجئے۔''
عائشہ نے شکریہ کہہ کر گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔
پھر جب تک وہ لوگ وہاں رہے، عائشہ ایک اضطراب کے عالم میں بیٹھی رہی، کھانا بھی اس نے برائے نام سا کھایا۔ منصور جب بل ادا کر کے کھڑے ہوئے تو اس کی جان میں جان آئی، ہال سے باہر نکلتے ہوئے وہ پیچھے رہ گئی، منصور اس کے برابر آ گئے۔
انہوں نے اس کی طرف قدرے جھکتے ہوئے پوچھا۔
''کیسی طبیعت ہے عائشہ؟''
''پہلے سے بہتر ہے۔''
''اس سے پہلے تو کبھی تمہاری طبیعت اس طرح خراب نہیں ہوئی۔''
عائشہ خاموش رہی۔
''مجھے بڑا افسوس ہے، ذرا بھی انجوائے نہ کر سکیں۔''
''آپ نے تو انجوائے کیا نا؟''
''نہیں، بالکل نہیں۔''
''ویری سوری، میری وجہ سے آپ لوگ بور ہوئے۔''
''میں تو بے حد پریشان ہو گیا تھا۔''
عائشہ نے چلتے چلتے ایک لمحے کے لئے ان کی طرف دیکھا۔
''میری باتوں پر یقین نہیں آتا تمہیں۔''

عائشہ ایک دبی ہوئی سانس لے کر رہ گئی۔ وہ لوگ باہر نکلے تو ایک لمبی سی گاڑی سے ٹیک لگائے وہ سگار ہونٹوں میں دبائے کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی دو آدمی اور کھڑے تھے۔ عائشہ کی سانسیں ایک دفعہ پھر بے ترتیب ہونے لگیں۔ منصور نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ سب سے پہلے گاڑی میں بیٹھ گئی۔
وہ تمام رات عائشہ نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ صبر و ضبط کے بندھن بڑی آہستگی سے ٹوٹ گئے۔
مدت سے رکے ہوئے آنسو ہر بند کو توڑ کر بہہ نکلے،
گرم گرم آنسو اس کے کانوں کی لوؤں کو چھوتے ہوئے نرم تکیے میں جذب ہونے لگے۔
پھر ایک شام منصور آئے تو پہلی دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ عائشہ گھر میں نہیں تھی۔ وہ دل چاہنے کے باوجود اس کے متعلق کسی سے بھی نہ پوچھ سکے۔
انہوں نے سوچا:
کہیں ایسا نہ ہو، یہ معمولی سی بات ہی ان کے دل کا راز افشا کر دے اور عائشہ پر کوئی حرف آ جائے۔
عائشہ کی رسوائی انہیں کسی طور پر بھی منظور نہ تھی۔
انہوں نے سوچا:
وہ خود کل یونیورسٹی میں اس سے پوچھ لیں گے، انہوں نے اسے بلوایا تو معلوم ہوا وہ جا چکی ہے۔
دو تین دفعہ ایسا ہی اتفاق ہوا۔ منصور گھر گئے تو وہ گھر میں نہیں تھی۔
انہی دنوں گھر میں ان کی شادی کا چرچا ہونے لگا۔ ان کی امی کو تحریم پسند تھی۔ لیکن تحریم کے لئے کسی ڈاکٹر کا رشتہ آیا ہوا تھا جو اسے پڑھاتے تھے اور تحریم خود بھی ان میں انٹرسٹڈ تھی۔ انتظار صرف اس بات کا تھا کہ اس کی تعلیم ختم ہو جائے۔ تحریم کے بعد منصور کی امی کو آسیہ سے بڑھ کر اور کون عزیز ہو سکتا تھا، لیکن منصور نے ابھی تک انہیں کوئی صاف جواب نہیں دیا تھا، اور وہ صاف جواب دے بھی کیسے سکتے تھے۔
ان کے دماغ کے ہر گوشے پر عائشہ کا تسلط تھا۔
ان کے دل کے خاموش ایوان میں عائشہ کی مورتی سجی تھی۔
ان کی نفس کے تار ہر لمحے عائشہ، عائشہ کی تکرار کرتے تھے۔
وہ اس سے ملنا چاہتے تھے۔
اس سے بات کرنا چاہتے تھے۔

اس سے پوچھنا چاہتے تھے۔
کہ اتنی بہت ساری ملاقاتوں کے باوجود بھی اس کے دل میں ان کا کوئی گزر نہیں؟
وہ ان کے متعلق بالکل نہیں سوچنا چاہتی؟
انہوں نے سوچا:
وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتی تو نہ سہی۔
وہ تو ایک لڑکی ہے۔
لیکن وہ خود تو ایک مرد ہیں۔
کیا وہ اتنی سی ہمت بھی اپنے آپ میں پیدا نہیں کر سکتے کہ......
سیدھے سادے الفاظ میں اس کے سامنے اپنے دل کے جذبوں کا اظہار کر دیں۔
لیکن وہ جانے کہاں چلی جاتی تھی۔
اس کی تو کوئی سہیلی بھی نہیں تھی۔
کوئی دوست نہیں تھا۔
پھر اس کی شامیں کہاں گزرتی تھیں؟
پھر ایک روز وہ دوپہر کو یونیورسٹی سے گھر واپس جا رہے تھے تو اپنے آگے والی گاڑی میں انہوں نے عائشہ کو دیکھا۔ فرنٹ سیٹ پر جانے وہ کس کے ساتھ بیٹھی ہوئی جا رہی تھی۔
ڈاکٹر منصور حیران رہ گئے۔
انہیں اپنے دماغ پر شدید ضرب کا احساس ہوا۔
ان کا دل چاہا کہ وہ اس گاڑی کا تعاقب کریں اور دیکھیں کہ عائشہ کہاں جا رہی ہے؟
لیکن وہ سرے ہی لمحے انہیں اپنی گھٹیا ذہنیت پر بیحد غصہ آیا۔
انہوں نے سوچا:
افوہ! اب میں اتنا پست ہو گیا ہوں۔
ممکن ہے اس کا کوئی رشتہ دار ہو۔
میں اس کے رشتہ داروں کو کہاں جانتا ہوں۔
اب سے کچھ عرصہ پہلے تک تو میں اس کے متعلق بھی نہیں جانتا تھا۔
وہ سیدھے اپنے گھر چلے گئے، لیکن شام کو عائشہ کے پاس جائے بغیر نہ رہ سکے۔ عائشہ گھر میں ہی تھی۔ تحریم، آسیہ اور وقاص نہیں تھے، وہ اپنی چچی کو سلام کر کے اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ گئے۔

ٹی۔وی کھلا ہوا تھا مگر انہیں کمرے کے سامنے سے گزرتے ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ ٹی۔وی نہیں دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہیں کھلے ہوئے دریچے سے باہر بھٹک رہی تھیں، اس کا چہرہ بیحد مرجھایا ہوا تھا۔
منصور اس کے قریب آ کر رکے تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی، وہ اتنی اپ سیٹ تھی کہ انہیں سلام تک نہ کر سکی، منصور کو ہی پہل کرنی پڑی۔
منصور دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے، کچھ دیر تک دونوں ہی خاموش رہے، پھر منصور نے پوچھا:
’’آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے‘‘
’’جی ہاں۔‘‘
’’معلوم تو نہیں ہوتی۔‘‘
عائشہ نظریں جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔
’’آج کل آپ یونیورسٹی میں نظر نہیں آتیں۔‘‘
’’کلاسز ختم ہو چکی ہیں، میں لائبریری میں پڑھتی ہوں۔‘‘
’’گھر کس وقت آتی ہیں؟‘‘
’’جلدی ہی آ جاتی ہوں۔‘‘
’’آج دوپہر کون تھا آپ کے ساتھ؟‘‘
’’آپ کے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟‘‘
’’میں کیا بتا سکتا ہوں؟‘‘
’’پھر اس ذکر کو جانے دیجئے۔‘‘
’’آپ کا کوئی رشتے دار؟‘‘
’’رشتہ دار ہی سمجھ لیجئے۔‘‘
’’کوئی قریبی رشتہ دار؟‘‘
’’رشتہ داری دور کی ہو یا قریب کی، بہرحال نبھانی ہی پڑتی ہے۔‘‘
’’ہوں۔‘‘ منصور نے ایک طویل سانس لے کر سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا اور بولے۔
’’آپ بے حد الجھی ہوئی اور پریشان نظر آ رہی ہیں۔‘‘
’’نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔‘‘
’’میں کیسے یقین کر لوں کہ میری آنکھیں دھوکہ کھا رہی ہیں۔‘‘
عائشہ خاموش رہی۔

''آج سے پہلے میں تین دفعہ آیا تھا، آپ گھر میں نہیں تھیں۔''
''جی ہاں۔''
''آپ کی تو کوئی سہیلی بھی نہیں، پھر آپ کہاں چلی جاتی ہیں؟''
عائشہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''شاید آپ بتانا نہیں چاہ رہیں۔''
''یہی سمجھ لیجیے۔''
کچھ دیر کمرے میں خاموشی رہی، منصور نے سوچا۔
آج سے بہتر موقع شاید پھر نہ ملے۔
مجھے عائشہ سے پوچھ کر تو دیکھنا چاہیے۔
معلوم نہیں کیوں، اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ان کی ہمت ہمیشہ ہی پست ہو جاتی تھی۔
لیکن اب مزید خاموش رہنا ان کے بس میں نہیں تھا۔
انہوں نے ایک نظر عائشہ کے مرجھائے ہوئے چہرے پر ڈالی اور بولے:
''عائشہ! میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''
''کہیے۔''
''آپ برا تو نہیں مانیں گی اگر میں آپ کو پروپوز کروں۔''
عائشہ نے بے حد پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔
''نہیں منصور صاحب! ایسی بات تو آپ کو سوچنی بھی نہیں چاہیے۔''
''کیوں، اس میں کیا حرج ہے؟'' ڈاکٹر منصور کا چہرہ ایک دم بجھ کر رہ گیا۔
''آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟''
ڈاکٹر منصور نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔
''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔''
''خالہ امی یا تحریم وغیرہ نے آپ کو میرے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا؟''
ڈاکٹر منصور کی آنکھیں جانے کس خیال کے تحت چمک اٹھیں انہوں نے اس کی طرف قدرے جھکتے ہوئے کہا:
''آپ.... آپ کسی کو پسند کرتی ہیں؟''
''آپ جو چاہیں سمجھ لیں ڈاکٹر منصور! لیکن اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہ کریں۔''
''پھر کس سے کروں؟''

''میرے علاوہ گھر کے کسی بھی فرد سے آپ جو چاہیں پوچھ لیں جو چاہیں کہہ لیں۔''
ڈاکٹر منصور نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے لیکن عائشہ اٹھ کر چلی گئی.....
اگلے روز عائشہ یونیورسٹی نہیں گئی، شام کو ڈاکٹر منصور اس کی طرف آنے کے لئے سوچ ہی رہے تھے کہ ان کی چھوٹی بہن آ گئیں۔ ان کے جانے کے بعد وہ کافی دیر تک الجھے الجھے سے بیٹھے رہے۔
''عائشہ! تم تو شروع دن سے میرے لئے ایک معمہ بنی رہی ہو۔''
انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔
اور اٹھ کر اپنے ایک دوست کے گھر چل دیئے، وہاں ان کے ایک اور ساتھی استاد بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی ریسٹورنٹ جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ باہر کھانا کھانے کا ان کا موڈ بالکل بھی نہیں تھا، لیکن سب کے اصرار پر وہ بادل نخواستہ ان لوگوں کے ساتھ چلے گئے۔
وہاں ڈاکٹر منصور نے عائشہ کو دیکھا۔
بلاشبہ اس کے ساتھ وہی شخص تھا جسے انہوں نے اس کے ساتھ گاڑی میں دیکھا تھا۔
وہ حیران رہ گئے۔
ان کے چلتے ہوئے قدم ایک لمحے کے لئے رک گئے۔
ان کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ لہرا گیا۔
عائشہ کی نگاہیں بھی اسی لمحے ان کی طرف اٹھیں۔
لیکن اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔
سیدھا سپاٹ چہرہ لئے وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھی رہی۔
آج ڈاکٹر منصور کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئی تھیں۔
گھر آ کر وہ دیر تک عائشہ کے بارے میں سوچتے رہے۔
عائشہ تم تو کسی سے نہیں ملتیں۔
تمہاری تو کوئی سہیلی نہیں۔
کوئی دوست نہیں۔
میں کیسے یقین کر لوں کہ تم کسی سے اس حد تک بھی فری ہو سکتی ہو۔
دوسرے روز وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے آفس سے نکل رہی تھی تو ڈاکٹر منصور سامنے آ گئے، اس نے نظریں بچا کر نکل جانا چاہا لیکن وہ قریب آ چکے تھے۔
''عائشہ؟''
''جی!''

''آج آپ میرے ساتھ چلئے گا۔''

''میں تو ابھی جا رہی ہوں۔''

''میں بھی چلتا ہوں، آپ پانچ منٹ میرا انتظار کیجئے۔''

''مگر میں آپ کے ساتھ جانا مناسب نہیں سمجھتی۔''

ڈاکٹر منصور نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں، آج کوئی نئی بات ہو رہی ہے۔''

عائشہ خاموش رہی۔

''آپ میرے ساتھ ہی چلیں گی۔''

عائشہ نے بے بس نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا لیکن کچھ نہ بول سکی۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ڈاکٹر منصور نے سوچا۔

مجھے اس لڑکی سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔

لیکن کس جگہ کا انتخاب کروں؟

عائشہ بہت بیزار سی بیٹھی تھی۔

انہوں نے دل ہی دل میں کہا:

عائشہ بیگم! آج چاہے تمہارا موڈ کیسا ہی ہو، تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔

وہ ایک دم اس سے پوچھ بیٹھے،

''آپ میرے ساتھ ریسٹورنٹ چل سکتی ہیں؟''

''جی......؟''

عائشہ نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا اور بولی:

''صرف میں، تحریم اور آسیہ میں سے کوئی نہیں؟''

''جی ہاں، صرف آپ۔''

''مجھے حیرت ہے، آپ ایک ایسی بات کہہ رہے ہیں جس کے متعلق میرے اور آپ کے درمیان واضح گفتگو ہو چکی ہے۔''

''اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟''

''آپ کو اپنے الفاظ ذرا بھی یاد نہیں؟''

''مجھے اپنے الفاظ بہت اچھی طرح یاد ہیں۔''

''پھر......؟''

''اب صورتحال بالکل مختلف ہے۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔''

''آپ درحقیقت ویسی لڑکی نہیں ہیں جیسی میں سمجھتا تھا۔''

عائشہ کا چہرہ شدت رنج سے سرخ ہو گیا۔

''ڈاکٹر منصور۔'' اس کی آواز قدرے تیز تھی۔

ڈاکٹر منصور نے ترچھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کے جذبات کی قطعی پروا نہ کی اور بولے:

''آپ جب کسی اور کے ساتھ ہوٹلوں میں جا سکتی ہیں تو پھر میرے ساتھ جانے میں کیا قباحت ہے''

عائشہ رنج و غم سے اپنے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی۔

اس نے انتہائی دکھ سے سوچا:

آپ میرے لئے اس انداز سے بھی سوچ سکتے ہیں؟

ڈاکٹر منصور کہا:

''اگر میں یہ فرض کر بھی لوں کہ وہ آپ کے رشتہ دار ہیں تو پھر رشتہ داری تو میرے ساتھ بھی ہے آپ کی، دور کی ہی سہی۔''

عائشہ سے ضبط نہ ہو سکا۔

''چپ ہو جائیے ڈاکٹر منصور، چپ ہو جائیے۔''

''میں نے سچی بات کہی ہے، اس لئے آپ کو کچھ زیادہ ہی تلخ محسوس ہو رہی ہے۔''

''آپ نے سچی بات کہی ہے یا نہیں، لیکن میں اس وقت ضرور آپ کو سچ بات بتاتی ہوں۔''

ڈاکٹر منصور خاموش رہے۔

''وہ......وہ میرے ہزبینڈ ہیں۔''

''عائشہ!''

اسٹیرنگ وہیل پر ڈاکٹر منصور کی گرفت کمزور ہو گئی۔ اگر وہ فوراً خود کو سنبھال نہ لیتے تو گاڑی ان کے کنٹرول سے باہر ہو گئی ہوتی۔

''آپ مجھے بتائیے، آپ یا کوئی دوسرا شخص میرے لئے ان کے برابر تو نہیں ہو سکتا، میں ہر شخص کے ساتھ ہوٹل یا پکچر ہاؤس تو نہیں جا سکتی۔''

''آپ نے کس قدر تکلیف دہ انکشاف کیا ہے، میرا دل اور دماغ اس بات کو ماننے کے لئے ذرا

ابھی تو آمادہ نہیں ہوتے۔''

''آپ کے دل و دماغ کے نہ ماننے سے حقیقت بدل تو نہیں سکتی۔''

''اس الجھی ہوئی گتھی کا سرا کہاں جا کر ملتا ہے عائشہ؟ آپ نے کبھی بھی تو مجھ سے ذکر نہیں کیا۔''

''جب گھر میں کسی اور نے آپ کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا تو پھر آپ ہی بتائیے میں خود اپنے دکھڑے آپ کے سامنے روتی ہوئی اچھی لگتی۔''

''مگر یہ ظلم ہے، مجھ سے یہ سب کچھ کیوں چھپایا گیا؟''

''تکلیف دہ باتوں کا ذکر نہ کرنا ہی اچھا ہوتا ہے۔''

''آپ کو کچھ اندازہ ہے، میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں؟''

عائشہ نے افسردگی سے ان کی طرف دیکھا اور بولی:

''جس روز ہم چائنیز گئے تھے، اس دن پہلی بار مجھے آپ کے احساسات کا اندازہ ہوا تھا، لیکن......''

''لیکن؟''

''یہ احساس بعد از وقت تھا، اگر مجھے پہلے سے ذرا سا شبہ بھی ہوتا تو میں آپ کو ہرگز آگے نہ بڑھنے دیتی۔''

''آپ کیا کرتیں؟''

''میں آپ کو سب بتا دیتی۔''

ڈاکٹر منصور بالکل خاموش رہے، عائشہ بھی سارے راستے خاموش رہی لیکن جب انہوں نے گھر جانے والی سڑک کے بجائے گاڑی دوسری سمت موڑی تو اس نے کہا:

''آپ غلط راہ پر جا رہے ہیں۔''

''میں آپ کو اپنے گھر لے جا رہا ہوں۔''

''کیوں؟''

''بے شمار سوالات ہیں دماغ میں، آپ سے نہ پوچھوں تو کس سے پوچھوں؟''

''کسی سے بھی نہ پوچھئے، ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟''

''آپ چاہتی ہیں میرے دماغ کی رگ پھٹ جائے یا میں پاگل ہو جاؤں؟''

''خدا نہ کرے، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

''بس تو پھر آپ کچھ نہ بولیے۔''

''لیکن آپ کے گھر میرا تنہا جانا مناسب نہیں ہے، آپ کی امی کیا سوچیں گی۔''

''امی آج گھر میں نہیں ہوں گی۔''

عائشہ ایک طویل سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

گھر پہنچ کر عائشہ نے ڈاکٹر منصور کے اصرار کے باوجود کھانا نہیں کھایا اور خود ان کی بھوک پیاس تو بالکل ختم ہو چکی تھی۔ کتنی ہی دیر تک وہ دونوں ڈرائنگ روم میں بالکل گم سم بیٹھے رہے۔

ڈاکٹر منصور سوچ رہے تھے۔

اس جیسی نازک اور کامنی سی لڑکی کا شوہر وہ گرانڈیل اور بدہیئت شخص ہے، یہ کیسا ظلم ہے؟

انہوں نے پوچھا:

''یہ بے جوڑ شادی کس طرح ہو گئی عائشہ؟''

''یہ باتیں پرانی ہو چکی ہیں منصور صاحب! اب ان کا ذکر کرنے سے کیا فائدہ؟''

''پھر بھی کچھ تو بتائیں۔''

''بس یوں سمجھ لیجئے، دولت نے دولت کا انتخاب کیا تھا۔''

ڈاکٹر منصور نے ایک طویل سانس لی۔

''ہاشم صاحب میرے والد مرحوم کے بزنس پارٹنر تھے۔''

''اچھا پھر؟''

''میرے ابا مرحوم میں بہت سی خوبیاں تھیں لیکن بس ایک برائی ان کی تمام خوبیوں کو چھپا دیتی تھی، انہیں دولت سے بڑا پیار تھا، وہ مجھے بے پناہ چاہتے تھے، اور ان کا یہ خیال تھا کہ میری شادی کسی ایسے شخص سے ہونی چاہئے، مال و دولت جس کے ہاتھ کا میل ہو۔''

عائشہ ایک سیکنڈ کے لیے رُکی اور بولی۔

''شادی کس طرح ہوئی، کیونکر ہوئی؟ یہ ایک طویل قصہ ہے بہر حال شادی ہو گئی، میں نے اپنے باپ کے حکم کو اپنی تقدیر سمجھ لیا۔''

عائشہ کا چہرہ جذبات سے عاری تھا اور ڈاکٹر منصور کی نگاہیں اس کے چہرے سے نہیں ہٹتی تھیں، وہ اس کے دل کے جذبوں کو سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔

''جب تقدیر نے ہاشم صاحب کو میرا مجازی خدا بنا دیا تو میں نے ان کے ہر حکم پر سر جھکانا اپنا فرض سمجھ لیا۔

ان کا حکم تھا کہ میں ان کے دوستوں کو اپنا بھی دوست سمجھوں میں نے چپ چاپ سر جھکا دیا۔

ان کا فرمان تھا کہ میں ان کی عدم وجودگی میں بھی ان کے دوستوں سے ملنے سے احتراز نہ کروں، میں نے سر آنکھوں پر اس فرمان کو بھی مان لیا۔''

ڈاکٹر منصور تصویرِ حیرت بنے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میں ہر بات میں ان کی مرضی اور پسند کی تابع تھی لیکن جب اس تمام تابعداری کے صلے میں مجھ پر بہتان تراشی کی گئی تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہوئی ہوگی۔''

عائشہ نے نظر اٹھا کر ڈاکٹر منصور کی طرف دیکھا، جانے کونسی تکلیف دہ یاد پر اس کی آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔

''آپ میری زبان سے وہ الزام سننا چاہیں گے ڈاکٹر منصور؟''

ڈاکٹر منصور خاموش رہے۔

''بس آپ یہ سمجھ لیجئے کہ اس الزام پر کسی غیرت مند لڑکی کو سوائے اس کے اور کوئی راہ نظر نہیں آتی کہ وہ کہیں ڈوب مرے۔''

''میں اپنی بے گناہی کے جتنے ثبوت دے سکتی تھی میں نے دیے لیکن آپ تو جانتے ہیں کہ شک، غلط فہمی اور بدگمانی انسان کو اندھا کر دیتے ہیں۔''

عائشہ نے اپنی آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسوؤں کو آنچل میں جذب کر لیا۔

''تصور کیجئے منصور صاحب! وہ شخص جس کے لئے میں نے اپنے آپ کو سرتاپا بدل دیا، اس نے مجھے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا۔''

عائشہ نے اپنا سر صوفے کی پشت پر ڈال دیا اور اس کے آنسو بڑی روانی سے رخساروں پر پھسلنے لگے۔

ڈاکٹر منصور اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گئے۔

''آنسو نہ بہاؤ عائشہ! مجھے بے حد تکلیف ہوتی ہے۔''

مگر عائشہ کیسے چپ ہو جاتی؟

آج تو دل کے گھاؤ پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔

آج تو زخموں سے پھر قطرہ قطرہ لہو ٹپکنے لگا تھا۔

اور جب زخموں میں ٹیس اٹھے تو آنکھوں کے ساغر چھلک ہی جایا کرتے ہیں۔

مگر ڈاکٹر منصور بھی کیا کرتے؟

وہ، جو انہیں بے پناہ عزیز تھی۔

وہ، جسے انہوں نے اپنی متاعِ حیات سمجھ لیا تھا۔

وہ، جو ان کی رگِ جاں سے بھی قریب تھی۔

اتنی اداس

اتنی غمزدہ تھی۔

آج اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ انہیں برچھی کی طرح اپنے دل میں چبھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

کتنی تکلیف محسوس کر رہے تھے وہ۔

اتنا ضبط، اتنا حوصلہ وہ کہاں سے لاتے کہ اس کی آنکھوں سے ساون بھادوں برستے دیکھ کر بھی وہ لب نہ کھولتے۔

عائشہ کے آنسو تھمے تو اس نے کہا۔

''میرے ابا جان اس وقت دنیا میں نہیں رہے تھے جو اپنے حکم کو میری تقدیر بنا کر اس کا انجام بھی دیکھ لیتے، میری امی نے بھی ہاشم صاحب کے آگے ہاتھ جوڑے لیکن دل جب پتھر بن جائیں تو آسانی سے موم نہیں ہوا کرتے۔

کسی کے سمجھانے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ میری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے ساری دنیا کے سامنے رسوا کر کے وہ اپنے طویل بزنس ٹرپ پر بیرون ملک چلے گئے۔ میں پنڈی میں اپنی امی کے ساتھ رہنے لگی۔ امی کے انتقال پر انہیں تار دیا گیا تھا۔ لیکن وہ نہیں آئے، دسویں سے چالیسویں تک کی فاتحہ پر انہیں اطلاع دی جاتی رہی، انہیں معلوم تھا کہ امی کے بعد میں تنہا ہوں، لیکن وہ نہیں آئے۔''

عائشہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنی کنپٹیوں کو دبایا، اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔

تب ڈاکٹر منصور بولے:

''پھر آپ چچی جان کے ساتھ یہاں آ گئیں؟''

''جی ہاں۔''

''یہاں انہوں نے کبھی آپ سے ملنے کی کوشش نہیں کی؟''

''وہ اس بات سے لاعلم تھے کہ میں یہاں آ گئی ہوں۔''

''انہیں اطلاع نہیں دی گئی؟''

''نہیں، خالہ امی کا خیال تھا اب مجھے اپنے آپ کو مزید نہیں گرانا چاہئے۔''

''پھر.....؟''

''اس روز جب ہم لوگ چائنیز گئے تھے، تب انہوں نے مجھے دیکھا اور مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے کس طرح گھر تک رسائی حاصل کر لی۔''

''اب وہ کیا چاہتے ہیں؟''

''وہ شرمسار ہیں، شرمندہ ہیں اور معذرت خواہ ہیں۔''

''آپ کے دل و دماغ کا کیا فیصلہ ہے؟''

''میرا دل و دماغ تو ماؤف ہو چکا ہے، کچھ سوچنے پر آمادہ نہیں۔''

''کوئی بھی آمادہ نہیں؟''

''نہیں، ان کا خیال ہے مجھے ان سے خلع لے کر کہیں اور .....''

عائشہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''کیوں؟'' ڈاکٹر منصور نے پوچھا۔

عائشہ کچھ جھجکی پھر بولی:

''دراصل ان میں کچھ اور عادتیں بھی ہیں۔''

''میں مرد کی ہر بری بات نظر انداز کر سکتی ہوں لیکن اس کی بد اعتمادی مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی۔''

''ہوں۔'' ڈاکٹر منصور نے کہا۔

عائشہ نے ان کی طرف دیکھا۔

ڈاکٹر منصور نے کہا:

''آپ نے تو مجھے اتنی دکھ بھری داستان سنائی ہے عائشہ! کہ میں اپنا غم بھول گیا۔''

''آپ کا غم؟''

عائشہ کی آواز مدھم تھی۔

ڈاکٹر منصور نے دریچے کے قریب جاتے جاتے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور قریب آ کر بولے:

''آپ کے خیال میں یہ احساس میرے لئے تکلیف دہ نہیں کہ آپ میری نہیں ہو سکتیں؟''

عائشہ کی نظریں جھک گئیں، اس نے سوچا۔

''یہ کیسے دکھ دے دیئے ہیں میں نے اس شخص کو انجانے میں؟''

''ذرا سوچئے عائشہ! اتنے عرصے تک میں جس کا تعاقب کرتا رہا، وہ میرے لئے ایک پرچھائیں کے سوا کچھ نہیں۔''

''میں تو اب شاید ساری زندگی بھٹکتا ہی رہوں گا۔''

''ایسی بات نہ کہئے ڈاکٹر منصور! آپ کے لئے لڑکیوں کی کیا کمی ہے؟''

''لیکن ان میں سے کوئی لڑکی بھی میرے لئے عائشہ نہیں بن سکتی۔''

''عائشہ میں ایسی کوئی خوبی تو نہیں ہے۔''

ڈاکٹر منصور نے ایسی نگاہوں سے عائشہ کی طرف دیکھا کہ وہ بڑی دیر تک ان سے نظریں نہیں

ملا سکی۔

''آپ کے دل میں میرے لئے کبھی کوئی جذبہ نہیں بیدار ہوا؟''

''میں آپ کو سب کچھ تو بتا چکی ہوں، آپ خود ہی بتایئے ان حالات میں میں کسی کو پسند کرنے یا کسی سے محبت کرنے کے بارے میں کیسے سوچ سکتی تھی۔''

ڈاکٹر منصور چند منٹ تک خاموش پھر بولے:

''آپ کو یہ احساس تو ہوتا ہوگا کہ ہاشم صاحب آپ کے قابل نہیں۔''

''شادی ہو جانے کے بعد میں نے اس قسم کے ہر احساس کو مٹا ڈالا۔''

''لیکن اب تو بہر حال آپ کو کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہے۔''

''جی ہاں، وہ تو ظاہر ہے۔''

''آپ جو بھی فیصلہ کریں، اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں پر غور کرنا چاہئے۔''

عائشہ خاموش رہی، ڈاکٹر منصور بھی کچھ نہیں بولے:

''اب آپ مجھے گھر چھوڑ آیئے۔'' عائشہ نے کہا۔

اور جب ڈاکٹر منصور عائشہ کو چھوڑ کر واپس آ رہے تھے تو انہوں نے ایک بے خودی کے عالم میں کہا۔

''عائشہ! میں زندگی کا یہ طویل سفر تنہا نہیں طے کر سکتا اور سوائے تمہارے کسی اور کو ہمسفر بنا بھی نہیں سکتا۔''

عائشہ ان سے نظریں نہ ملا سکی۔

''آخری فیصلہ تو تمہیں ہی کرنا ہے نا، جانے کیوں مجھے آس سی ہے۔''

عائشہ چپ چاپ اندر چلی گئی۔

اور پھر ایک ہفتے بعد ڈاکٹر منصور آئے تو گھر میں خلاف توقع بے حد سناٹا تھا۔ دروازہ بوا نے کھولا۔ ''گھر میں کوئی نہیں ہے بوا؟''

''معلوم نہیں بھیا۔''

پھر ایک دم بوا کو جیسے کچھ یاد آ گیا بولیں:

''عاشی بٹیا ایک کتاب دے گئی ہیں آپ کے لئے، ان کے کمرے میں میز پر ہی رکھی ہوگی۔''

''کیسی کتاب؟''

''معلوم نہیں بھیا۔'' بوا نے کہا اور سٹر پٹر کرتی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

ڈاکٹر منصور عائشہ کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

رائٹنگ ٹیبل پر پڑی ہوئی کتاب انہوں نے کھولی تو ایک لفافہ نیچے گر پڑا۔ انہوں نے لفافہ اٹھا

کرچاک کیا، لفافے کے اندر سے پرچہ نکالتے ہوئے ان کی انگلیوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔

"ڈاکٹر منصور!

چھ سات روز تک مسلسل سوچنے کے بعد آج میں نے قطعی فیصلہ کرلیا ہے۔ ہاشم صاحب کو جس نے بھی دیکھا، اس نے یہی کہا کہ وہ میرے قابل نہیں۔ ایسی بے جوڑ شادیاں اس دنیا میں اکثر ہوا کرتی ہیں۔ میرے ساتھ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہوا۔ میں تو کسی کو بھی قصوروار نہیں ٹھہراتی۔ رشتوں کے فیصلے تو آسمانوں پر ہوا کرتے ہیں لیکن پھر ان رشتوں کو آخری سانسوں تک نبھادینا ہمارا کام ہوتا ہے۔ رنجشیں، غلط فہمیاں اور بدگمانیاں تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہیں، ہاشم صاحب کے گھر سے چلے آنے کے بعد آج تک کا عرصہ میں نے پل صراط پر چل کر گزارا ہے، مبادا اور رسوائیاں میرا مقدر نہ بن جائیں۔ شاید اسی احتیاط کی روش نے ہاشم صاحب کے دل ودماغ سے بدگمانی اور غلط فہمی کے داغ کو دھودیا ہے، معلوم نہیں وقتی طور پر یا مستقلاً؟ معلوم نہیں یہ میرے جذبوں کی سچائی ہے یا پھر کوئی معجزہ! وہ بہت بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ماضی میں جو کچھ ہوا وہ اس پر اس حد تک شرمسار ہیں کہ انہوں نے مکمل طور پر مجھے یہ اختیار دے دیا ہے کہ اگر میں بخوشی ان کے ساتھ رہنا نہ چاہوں تو ان سے علیحدہ ہوکر کہیں بھی شادی کرسکتی ہوں۔

میں نے بھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہاشم صاحب اگر نہیں بھی بدلے ہیں تب بھی میں خدا کے بعد انہیں ہی درجہ دینے پر مجبور ہوں، وہ میرے مرحوم ابا جان کا انتخاب ہیں، اور پھر جانے کیوں میرے دل کو یقین ہے کہ اب وہ میری بہت مضبوط پناہ گاہ ثابت ہوں گے،

میں آج ہاشم صاحب کے ساتھ جارہی ہوں۔ مجھے یقین ہے آپ میری خوش آئند زندگی کے لئے دعا کریں گے۔"

"عائشہ ہاشم"

ڈاکٹر منصور نے ایک طویل سانس لی اور دل ہی دل میں کہا۔

"عائشہ! تم میرے مقدر کا ستارا نہیں تھیں۔ میں انجانے میں تمہاری تمنا کر بیٹھا، جہاں رہو خوش رہو۔"

وہ عائشہ کا خط جیب میں ڈال کر باہر نکل آئے۔ بوا کو چائے کے لئے منع کرکے وہ برآمدے میں آگئے، ریلنگ پر نگاہ پڑتے ہی انہیں عائشہ کا پہلے دن والا روپ یاد آگیا اور کانوں میں اس کی آواز کی بازگشت سنائی دینے لگی۔

بدریا برس گئی اس پار

وہ تھکے تھکے قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے گاڑی اسٹارٹ کرکے جب وہ آگے بڑھے تو عائشہ کی آواز انہیں تعاقب کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔

انہوں نے زیرلب کہا:

"ہاں عائشہ! بدریا سچ مچ اُس پار ہی جاکر برسی۔"

نشان راہ منزل

اکتوبر 1982ء

اس کا بچپن مرغیوں اور بطخوں کے پیچھے بھاگ کر کڑکڑی، کڑی، قیں، قیں کی آوازیں نکالتے، مٹھو میاں کو چوری کھلاتے اور "لوسی" کو چھیچھڑے کھلاتے گزرا تھا۔ اس کے نزدیک بھنگن کی لونڈیا بملا، شکورے کی بٹیا چھمو اور گھر کے پچھواڑے رہتے والے آغا صاحب کی صاحبزادی نرگس میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس نے ہمیشہ سب کو ایک ہی لکڑی سے ہنکالا تھا نہ اسے بملا کے جوؤں بھرے سر سے گھن آتی تھی، نہ چھمو کی بارہ مہینے سڑسڑ بہتی ناک سے کراہیت آتی تھی۔ اور نہ ہی نرگس کے جھلملاتے صاف ستھرے کپڑوں اور رنگ برنگے چمکیلے ربنوں کو دیکھ کر مرعوب ہوجانے کا خیال آتا تھا۔ اس نے بارہا اپنا صاف ستھرا رومال چھمو کی سڑسڑاتی ناک صاف کرنے کے لئے بڑی فراخدلی سے پیش کیا تھا۔ بملا کے گندے چیکٹ بالوں میں سے موٹی موٹی پہلوان جیسی جوئیں پکڑ کر بائیں انگوٹھے کے ناخن پر رکھ کر دائیں انگوٹھے کے ناخن سے مارنے میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔

اس میل جول کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اس کے سر میں بھی کیڑے بلبلانے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے سر لیکھوں سے پٹ گیا۔ ایک ایک بال میں ڈھیروں موتی چمکنے لگے۔ بوا بے چاری اس کا سر صاف کرتے کرتے عاجز آگئیں۔ بہت سمجھایا، پیار سے۔ دلار سے

"بٹیا، ان نگوڑ ماریوں کے ساتھ نہ کھیلا کرو، یہ کم بختیں کہیں شریف زادیوں میں اٹھنے بیٹھنے کے

قابل ہیں۔"

مگر بیٹا اگر پیار دلار سے سمجھنے والی ہوتیں تو جانے کب کی سمجھ گئی ہوتیں۔ وہ تو اصل میں ان لوگوں میں سے تھیں جو مار کھائے بغیر دبلے رہتے ہیں، جوتے کھائے بغیر اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے، لیکن مشکل یہ تھی کہ بٹیا کو جوتیانے والا اس گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔

تابندہ نے ہوش سنبھال کر اپنے گھر میں اردگرد جن لوگوں کو دیکھا، ان میں ایک تو وجیہہ وشکیل ابا میاں کو دیکھا جن کی خوب صورتی اور وجاہت کا احساس اسے بہت بعد میں ہوا۔ ہاں، ان کے کھوئے کھوئے، اداس اور غمگین رہنے کا احساس اسے بڑی جلدی ہو گیا تھا ابا میاں کے علاوہ اس نے شکورے، اس کی بیوی اور ان کی اکلوتی بٹیا چھمو کو دیکھا۔ یہ دونوں میاں بیوی کھانا پکانے سے لے کر گھر کی صفائی ستھرائی، سودا سلف۔ سب کام کرتے تھے۔ ان تمام کاموں کے علاوہ وہ گھر کے چھوٹے سے باغیچے کے مالن، مالی بھی تھے۔ ان دونوں کے بعد بملا کی ماں تھی...... جو اپنے بھاری بھرکم جسم کو سنبھالے دھم دھم کرتی ہوئی کمانے آتی تھی۔ مگر کمانے سے پہلے اپنی جھاڑو اور ٹوکری ایک طرف پھینک کر پھسکڑا مار کر صحن میں بیٹھ جاتی تھی۔ اپنے گندے غلیظ سر کو کھبڑ کھبڑ کھجاتے ہوئے ہانک لگاتی تھی۔

"بوا جی! کہاں ہو؟"

اور بوا جی گھر کے کسی کونے کھدرے سے نکل کر سبڑ سبڑ کرتی اس سے کافی فاصلے پر رک کر کہتیں۔

"اے بملا کی ماں، آج تو پھر اتنی دیر سے آئی۔"

"اجی کیا کروں؟ روز کوشش کرتی ہوں وخت پر آنے کی، پر دیری ہو ہی جاتی ہے۔"

"تو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گی، اب مجھے کوئی دوسرا انتظام کرنا پڑے گا۔" بوا ایک سوکھی سی تڑی دیتیں۔

"کیوں گریب (غریب) کے پیٹ پہ لات مارتی ہو بوا جی؟ تم تو اللہ والی ہو۔" بملا کی ماں مسکین صورت بنا کر کہتی۔

اور بوا جی دل ہی دل میں سہم کر رہ جاتیں، جلدی سے بات کا موضوع بدل دیتیں۔ بس پھر بملا کی ماں کی بن آتی۔ محلے بھر کی رپورٹ دینا شروع کر دیتی۔ ساس بہوؤں کے جھگڑے، دیورانیوں جیٹھانیوں کی چپقلش۔ ایک گھر کی ملازمہ کا دوسرے گھر کے ملازم سے آنکھ مٹکا...... ہر بات کو خوب نمک مرچ لگا کر بیان کرتی۔ محلے کی رتی رتی بات کی خبر اسے رہتی تھی۔

اور تابندہ کو ان قصوں کے سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ بوا کے کولہے سے لگی بڑے غور سے یہ ساری باتیں سنا کرتی۔ بوا اسے بہلا پھسلا کر ہزار جتن کرتیں کہ وہ اپنے کھیل کود میں لگ جائے اور

اس قسم کی باتیں نہ سنے، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتی۔ ہاں اگر اس وقت بملا بھی اپنی ماں کے ساتھ آئی ہوئی ہوتی اور چھمو کی ماں نے بھی اسے کسی کام میں نہ لگا رکھا ہوتا، تو بے شک وہ انہیں ساتھ لے کر کدکڑے لگانے باغیچے میں چلی جاتی۔ بعد میں جب اسکول جانے لگی تو بملا کی ماں کی باتیں سننے کو اس کے کان ترس گئے۔

ان تمام لوگوں میں سے اسے ناپسند تو کوئی بھی نہیں تھا، لیکن بوا کی شخصیت کچھ اس طرح اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی کہ وہ باوجود کوشش کے ان کو بھلانے میں کبھی بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ بوا کے سفید براق کپڑے، ان کا کھچڑی بالوں والا سر اور میٹھی نرم آواز...... اس کے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں رچ بس گئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے پیار بھرے لہجے میں نصیحتیں کرنے کا انداز تو بس سونے پر سہاگہ تھا۔

ابا کو اس سے بہت پیار تھا اور بڑی محبت تھی لیکن اس کے مقابلے میں انہیں اپنی موٹی موٹی کتابوں، سفید چکنے کاغذوں کی فائلوں اور قلم سے کہیں زیادہ عشق تھا۔ یونیورسٹی سے واپس آ کر وہ اپنے اسٹڈی روم میں بند ہو کر کتابوں میں سر دے کر بیٹھ جاتے تھے پڑھتے جاتے تھے اور لکھتے جاتے تھے۔

سچی بات تو یہ تھی کہ ابا کو تابندہ کی اماں کی بے وقت موت نے کہیں کا نہ چھوڑا تھا۔ پہلے تو ان کے دل کی زرخیز مٹی میں چپکے سے اپنی محبت کا بیج بویا، دبے پاؤں جا جا کر اسے اپنی آہوں کی حرارت اور آنسوؤں کے قطروں سے پروان چڑھاتی رہیں۔ جب یہ بیج دھیرے دھیرے پرورش پا کر تناور درخت بن گیا تو ابا بیچارے بہت گھبرائے سٹپٹائے، پھر مسرت سے چور چور ہو گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے سہرا باندھا، فرخندہ بیگم نے گہنے لتے پہنے اور دونوں ایک دوسرے کے ہو گئے۔ ایسی چاہت، ایسی محبت اور اتنا پیار...... کہ دیکھنے والے حیران ہو کر رہ گئے۔ شادی کو دو سال گزرے کہ گھر میں ریشم کی ڈوری ایسی کسی چیز نے جنم لیا۔ سب نے یہ کہا کہ ریشم کی یہ ڈوری تو ان کے پیار کے بندھن کو اور بھی مضبوط کرے گی اور ہوتا بھی یہی ہے۔ لیکن جانے اللہ کو کیا منظور تھا۔ ایک دم عزرائیل کو بھیج فرخندہ بیگم کو زمین سے دور...... بہت دور...... بلندیوں پر آسمان کی وسعتوں پر بلوا لیا۔ چار مہینے کی ننھی سی تابندہ بلکتی رہ گئی دکھ اور پریشانیاں۔ غم اور تکلیفیں۔ سب ایک ساتھ ہی بانہیں پھیلائے چلے آئے اور تابندہ کے ابا کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ کس سے فریاد کرتے؟ کس سے کہتے؟ کس کو پکار کر معصوم تابندہ کو اس کی آغوش محبت میں دیتے؟ اس کا ننھیال نہ ہونے کے برابر تھا۔ فرخندہ غریب تو خود دوسروں کے ٹکڑوں پر پلی تھی۔ اپنی سگی خالہ کے گھر ماما گیری کرتے ہوئے اور ظلم وستم سہتے ہوئے جوان ہوئی تھی۔ اس کی یہی غربت اس کے ماتھے کا کلنک

بن گئی- ساس نے ساس بن جانے کے باوجود اپنے اور اس کے رشتے کو منظور نہ کیا، پہلے تو بیٹے کو شادی کی اجازت ہی نہ دی- مہینوں گزر گئے منتیں کرتے، ہاتھ جوڑتے لیکن جب پتھر دل نے پسیجنے کا نام ہی نہ لیا تو ابا اپنے ہمدرد اور غمخوار دوست اسد کے سامنے اپنا دکھ بیان کیے بغیر نہ رہ سکے- اسد کے گھر بچپن ہی سے آنا جانا تھا اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں نے ہمیشہ انہیں اپنا سمجھا تھا اسد ہی کے گھر سے بارات گئی، فرخندہ دلہن بن کر آئی- مہینہ بھر تک ان کے گھر میں بہو بیٹی بن کر رہی- بالکل اسی طرح اس کے سب چاؤ چونچلے ہوئے جیسے نئی نویلی دلہنوں کے سسرال میں ہوا کرتے ہیں-

تابندہ کے ابا نے تو یہ سوچ کر اور مطمئن ہو کر اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا کہ کچھ عرصے بعد اماں اپنے آپ ٹھیک ہو جائیں گی اور فرخندہ کو گھر لے جا کر رکھیں گی، لیکن ان کے اس اقدام نے تو ان کے قہر و غضب کو اور بڑھا دیا- عالم غیظ میں قسم کھا بیٹھیں کہ اب زندگی بھر بیٹے کی صورت نہیں دیکھوں گی- دو ٹکے کی چھوکری کے آگے اس نے میری کوئی حیثیت نہ سمجھی-

اور پھر، ہوا بھی یہی کہ مرتے مر گئیں مگر بیٹے کی صورت نہ دیکھی- اسے بلوانا تو بہت دور کی بات تھی- ماں بیٹے اگر ایک شہر میں ہوتے تو شاید ملنے کی کوئی آس، کوئی امید بندھ جاتی، لیکن وہ ٹرانسفر ہو کر ———— چلے گئے- اماں اور ان کا غیظ و غضب پنڈی میں ہی رہ گیا- بھائی بہنوں نے تو اپنی سی ہر کوشش کر ڈالی کہ اماں اپنا غصہ تھوک دیں- لیکن اماں بھی پکی راجپوتنی تھیں- زبان سے جو بات نکل گئی سو نکل گئی- اب دنیا چاہے ادھر سے ادھر ہو جائے، مگر اماں نہیں بدلنے والی-

محبت تو خیر باقی بہنوں بھائیوں کو بھی تھی، لیکن ایک بہن تو تڑپ تڑپ کر رہ گئی، دونوں اوپر تلے کے جو تھے- اب جو فرخندہ نے ساتھ چھوڑ تو اسی بہن کا خیال آیا کہ تابندہ کو اس کے پاس چھوڑ دیں- لیکن وہ بیاہ کر ان دنوں اپنے شوہر کے ساتھ باہر گئی ہوئی تھی- ایسے میں ہی کسی نے بوا کا پتہ بتایا، بلکہ بوا کو لا کر سامنے کھڑا بھی کر دیا- بوا میں جانے کیا بات تھی کہ انہوں نے کچھ سوچے سمجھے بغیر تابندہ کو بوا کی بانہوں میں تھما دیا اور اس کی طرف سے جیسے بالکل مطمئن ہو کر اپنے آپ کو غم کے سمندروں میں ڈبو دیا- یوں تابندہ بوا کی شفقت اور محبت کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں تلے پروان چڑھتی رہی-

بوا کی فطرت میں بناوٹ بالکل نہیں تھی- نہ ہی انہیں تکلفات آتے تھے-- سیدھے سادے لوگ اور سیدھے سادے انداز انہیں ہمیشہ سے پسند تھے ایسی بات نہیں تھی کہ انہوں نے خوشحالی کا دور ہی نہیں دیکھا تھا، نہ ہی یہ ہوا تھا کہ خوشحالی اور روپیہ پیسہ ان کے گھر کی ڈھیہ چھو کر بھاگ گیا تھا- اب

تو خیر ان کا سب کچھ لٹ پٹ چکا تھا، مگر بوا نے اپنی خوشحالی کے دور میں بھی سادہ ہی زندگی گزاری تھی- اسی سادہ زندگی کی تربیت انہوں نے تابندہ کو بھی دی تھی- مگر تابندہ ہر بات میں انتہا کو پہنچ جایا کرتی تھی اس موقع کو وہ کیوں ہاتھ سے جانے دیتی- اس نے کچھ زیادہ ہی سادگی اور بے تکلفی اپنالی تھی اس کا بس چلتا تو بھنگن کی لونڈیا اور شکورے کی بٹیا کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتی، وہ تو بوا کے بہت سمجھانے بجھانے کی وجہ سے اپنی سوچوں کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتی تھی- وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جہاں قد کاٹھ میں تبدیلی آئی وہیں دماغ میں بھرے ہوئے بھوسے میں بھی کافی کمی آ گئی- بہت سی باتیں خود بخود سمجھ میں آنے لگیں، سوچوں کے انداز بھی کچھ کچھ بدل سے گئے- اپنے سر میں کلبلاتی ہوئی جوؤں اور رینگتی ہوئی دھکوں سے نہ صرف خوف آنے لگا بلکہ وحشت بھی ہونے لگی- بس نہیں چلتا تھا کہ کس طرح ایک ہی وقت میں بیٹھ کر بوا سے ساری جوؤں اور لیکھوں کا صفایا کروا دے- بوا بے چاری تو سدا سے ہی اس کی فکر میں دبلی ہوتی آئی تھیں، اس کا سر صاف کرنے کے لئے انہوں نے کون کون سے جتن نہیں کئے تھے- کبھی سر میں کافور مل کر کپڑا لپیٹ رہی ہیں، کبھی لکڑی کی کنگھی میں دھاگا باندھ کر لیکھوں کو صاف کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ شاید تابندہ نے تو جیسے شہر بھر کی ساری گندی میلی لڑکیوں سے دوستی گانٹھ رکھی تھی- جو اس کے سر کی جوؤں میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا- بڑے ہونے کے بعد اسے بوا کی دیدہ ریزی اور اپنی غلطی کا احساس خود بخود ہو گیا- جبھی وہ احتیاط برتنے لگی تھی- آخر کار بوا کی محنت رنگ لا کر رہی اور خدا خدا کر کے تابندہ کے سر کی جوئیں بالکل ختم ہو گئیں- لیکن سر کی جوئیں صاف کروا لینے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ اس نے سادگی کو بھی خدا حافظ کہہ دیا-

چھمو اور بملا سے اب بھی اسے اتنا ہی پیار تھا جتنا بچپن میں تھا- اپنے اچھے اچھے کپڑے اور دوسری بے شمار قیمتی چیزیں ان دونوں کو اب بھی وہ فراخدلی سے دے دیا کرتی تھی- درختوں سے بملا کے ہاتھ کے توڑے ہوئے امرود، جامن اور بادام کھا لینے میں اب بھی اسے کوئی عار نہیں تھا- فرق صرف اتنا ہی ہوا تھا کہ پہلے وہ ان چیزوں کو بغیر دھوئے کھا لیا کرتی تھی- بچپن میں اس کا دل چاہتا تھا کہ عمر کا یہ دور کبھی بھی نہ گزرے، لیکن اس کی ننھی اور کمزور بانہیں وقت کے ان لمحوں کو تھام کر روک نہ سکیں- بچپن گزر گیا...... لڑکپن آ گیا، تب اس نے سوچا کہ اگر عمر کا یہ دور ٹھہر جائے، مگر اس کے چاہنے سے کچھ بھی نہ ہو سکا- زندگی کے وہ لمحے بھی چپ چاپ اس کے ہاتھوں سے دامن چھڑا کر دھندلکوں میں گم ہو گئے- لمحوں کا ٹھہر جانا اگر تابندہ کے بس کی بات نہیں تھی تو خود وقت کے اپنے اختیار کی بات بھی تو نہیں تھی-

وقت آگے بڑھا تو تابندہ کی مصروفیتوں میں بھی تبدیلی آ گئی - اور یہ تبدیلی بالکل غیر محسوس طریقے پر آئی تھی - اس میں اس کی کوششوں اور اس کے ارادوں کا کوئی دخل نہیں تھا - اس تغیر اور اس تبدیلی کا اسے کوئی دکھ نہیں تھا - اگر دکھ تھا تو اس بات کا کہ چھمو بملا اور نرگس اس سے جدا ہو گئی تھیں نرگس کو اس کے بھائی بھابی نے لندن بلا لیا تھا - اور...... چھمو اور بملا جوان ہو گئی تھیں - ہاں، وہ جوان ہو گئی تھیں؟ غریبوں کی بیٹیاں بڑی جلدی جوان ہو جایا کرتی ہیں یا تو وہ سچ مچ جوان ہو جایا کرتی ہیں یا پھر مفلسی اور غربت ان کے ماں باپ کی آنکھوں پر کوئی ایسی عینک لگا دیا کرتی ہیں، جس کے پیچھے سے انہیں اپنی بیٹیاں کم سنی میں ہی جوان نظر آنے لگتی ہیں - اور وہ ان کے ہاتھ پیلے کرنے کی فکر میں گھلنے لگتے ہیں -

تابندہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ چھمو اور بملا اس کی ہم عمر ہی تھیں - چھمو اس سے صرف ایک سال بڑی تھی اور بملا تو چند ماہ چھوٹی ہی تھی، یہ بات اسے بوا نے بتائی تھی - تابندہ کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ان دونوں کی شادی ہونے والی ہے تو وہ دانتوں میں اپنی انگلی دبائے حیرت زدہ سی رہ گئی - وہ کچھ تو خیر اپنی جگہ پر تھا ہی - اس کا دل چاہا کہ وہ چھمو اور بملا کی ماں کو منع کر دے کہ ان دونوں کی شادیاں اتنی جلدی نہ کریں - کچھ جھجکتے ہوئے اس نے شکورے کی بیوی سے یہ بات کہہ بھی دی - شکورے کی بیوی نے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا اور بولی -

"بٹیا، چھمو اب جوان ہو گئی ہے -"

"جوان ہو گئی ہے؟"

تابندہ نے زیر لب کہا -

"ہاں، لڑکیاں جب جوان ہو جاتی ہیں، تو ان کی شادی کرنا ضروری ہو جاتا ہے -"

تابندہ نے چھمو کی ماں سے تو کچھ نہیں کہا، لیکن دل میں سوچا - "تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب بوا میری بھی شادی کر دیں گی میں بھی تو چھمو کی ہم عمر ہوں -"

مگر اسے ایک دم خیال آیا کہ اس نے تو اس سال میٹرک کا امتحان دیا ہے اور بوا کہتی ہیں کہ اس کی شادی بی - اے یا ایم - اے کرنے کے بعد ہو گی -

تابندہ کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کچھ بھی نہ ہوا - چھمو اپنے تایا زاد کے ساتھ بیاہ کر چھمک چھلو بن کے چل دی - اور گئی بھی جانے کون سے گاؤں؟ جس کا نام بھی تابندہ نے اس سے پہلے نہیں سنا تھا بملا بھی لال پیلے کپڑے پہن کر اپنی سسرال چل دی -

تابندہ جب فرسٹ ایئر میں آئی تو نہ صرف اس کے بلکہ بوا کے ہوش و حواس پر بھی ایٹم بم گرا - ہوا یوں کہ تابندہ کے ابا نے چپکے سے دوسری شادی کر لی، ابا نے جن سے شادی کی تھی، وہ ان کے

ساتھ ہی یونیورسٹی میں پڑھاتی تھیں - ابا انہیں بیاہ کر گھر نہیں لائے بلکہ خود گھر داماد بن بیٹھے لیکن گھر داماد کافی عرصے بعد بنے تھے پہلے تو گاڑی اسی طرح چلتی رہی کہ کبھی دن میں جا کر دلہن سے مل آئے - کبھی رات میں - ہاں، ان دنوں یہ ضرور ہوا تھا کہ ابا رات کو بڑی دیر سے آتے تھے - جانے ابا کی زندگی میں اور ان کی فطرت میں یہ اتنا بڑا انقلاب کس طرح آ گیا تھا - ورنہ ایمان کی بات تو یہ تھی کہ فرخندہ بیگم کے مرنے کے بعد انہوں نے سوائے کتابوں کے کسی چیز سے دل نہیں لگایا تھا - شاید...... رخسانہ بیگم کا داؤ بڑا پیچ دار تھا یا ان کی زلفوں کا جال بڑا گھنا تھا - کہ اب اس میں الجھ کر پھر تنہا باہر نہ نکل سکے -

گھر کے کسی فرد کو انہوں نے کانوں کان بھی خبر نہ ہونے دی تھی، وہ تو بوا کو پڑوس سے کہیں سن گن مل گئی تھی - بوا لاکھ اس گھر کی بزرگ سہی - لیکن آئی تو ملازمت کرنے ہی تھیں - اب اس خبر کی تصدیق عامر صاحب (تابندہ کے ابا) سے کیسے کرتیں سوچ سوچ کر رہ گئیں لیکن ایک روز موقع پا کر کچھ ڈرتے ہوئے...... کچھ جھجکتے ہوئے وہ پوچھ ہی بیٹھیں -

عامر صاحب ایک دم ٹپٹائے اور کچھ ہونق سے بن کر رہ گئے - چند لمحے تو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے پھر سر نیہوڑائے ہوئے "گوں گاں" کر کے کچھ الٹ پلٹ بات کی - اور اس خبر کی تصدیق کر ہی دی، لیکن سر جو جھکا تو اوپر اٹھ ہی نہ سکا - نظریں ملائے بغیر اٹھ کر کھسکنے کی سوچی - تو بوا نے بڑے خلوص سے یہ مشورہ دیا کہ اب دلہن کو یہیں لا کر رکھو، مگر عامر صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ یہاں لا کر رکھنا مناسب نہیں ہے بوا چپکی ہو رہیں اور دل ہی دل میں سوچنے لگیں -

سب زمانے کے کھیل ہیں - جب میں نے اس گھر کی دہلیز پہ قدم رکھا تھا، تو میاں کی عمر ہی کیا تھی - یہی کوئی پچیس چھبیس برس کے سب کہہ کہہ کر ہار گئے - مگر میاں نے شادی نہ کی، کر کیسے لیتے؟ قسمت کا لکھا بھی تو پورا ہونا تھا - خیر جو ہوا ٹھیک ہی ہوا - اب بھی ایسی کون سی زیادہ عمر ہو گئی ہے ان کی؟ آج کل تو پینتیس چالیس برس کی عمر میں ہی شادیاں کی جا رہی ہیں لیکن...... تابندہ سنے گی تو کیا سوچے گی؟ اس کو اس بات کی خبر نہ ہی ہو تو اچھا ہے، لیکن تابندہ کو بھی آخر کب تک اس بات کی خبر نہ ہوتی؟ جانے کیسے؟ جانے کب؟ اسے بھی خبر ہو گئی - بہت دنوں تک اس کے دل و دماغ کی بڑی عجیب سی حالت رہی، پھر آہستہ آہستہ وہ خود ہی نارمل ہو گئی -

آتے جاتے لمحوں کے ناہموار سلسلے نے وقت کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا - تابندہ نے انٹر پاس کیا تو اس کی زندگی کے خاموش اور پرسکون سمندر میں ایک اور کنکری گری، ایک اور انقلاب آیا - وہ بوا کی شفقت و محبت کی گھنی چھاؤں سے محروم ہو کر تپتی چلچلاتی دھوپ میں آ کھڑی ہوئی - اس نے آنسوؤں کی دھند میں ڈوبی ہوئی نظریں ابا کی طرف اٹھائیں تو ان کے خوبصورت چہرے پر فکر اور

پریشانی کے سایوں کے جھومتے ناگوں کی طرح لہراتے ہوئے دیکھے۔

ابا نے جانے کیا سمجھ کر؟ جانے کیا سوچ کو ایک فیصلہ کیا اور اس فیصلے کی رو سے تابندہ کو اپنی انہیں بہن کے پاس چھوڑ آئے جو ان پر جان چھڑکتی تھیں۔ انہیں امریکہ سے واپس آئے کئی سال گزر چکے تھے۔ اب اپنے سسرال والوں کے ساتھ کراچی میں مقیم تھیں۔ انہوں نے تابندہ کو بڑی گرم جوشی سے کھینچ کر اپنے سینے سے لگایا اور اسے دیوانہ وار پیار کرنے لگیں اور...... اس دن سے تابندہ کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔

اس اچانک تبدیلی نے کچھ دن تک تو تابندہ کو گم سم رکھا۔ دماغ کی یہ کیفیت تھی کہ جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ اور دل منوں بوجھ تلے دب کر رہ گیا تھا۔ بوا کی صورت آنکھوں میں پھرتی تو آنسو ایک کے بعد ایک ٹپ ٹپ کر کے گرے جاتے۔ رفتہ رفتہ بوا کی جدائی کا صدمہ کم ہوا، تو نئے ماحول، نئے لوگوں اور ان کی انوکھی حرکتوں نے اسے ہونق بنا کر رکھ دیا، اس نے اپنی زندگی کے اٹھارہ برس، چھوٹے سے گھر میں چار پانچ افراد کے ساتھ بڑے سیدھے سادے انداز سے گزارے تھے۔ مگر یہاں پھوپھی جان کے پاس آ کر وہ ایک ایک بات کو دیکھ کر حیرت زدہ سی بیٹھی سوچتی ہی رہ جاتی تھی۔ ایک تو ان کا گھر...... گھر کا ہے کو تھا، بس ایک محل ہی تھا اوپر سے گھر کے افراد کی تعداد اور بوکھلائے دیتی تھی اس کے لئے تو ٹوکرا بھر افراد خانہ کے ناموں کو یاد رکھنا مشکل ہو گیا۔ یہ فلاں بھائی ہیں، وہ ڈھمکانے ہیں کسی کے نام کے ساتھ اپیا لگاؤ، تو کسی نام کے ساتھ بجیا لگاؤ۔ کوئی اپی ہیں تو کوئی پٹی ہیں۔

کئی لوگوں نے دو دو نام رکھ چھوڑے تھے۔ تابندہ پریشان ہوئی کہ آخر ان دو دو ناموں کی کیا ضرورت تھی؟ پتہ چلا کہ ایک ایک نام "تک نیم" ہے۔ نام بھی چھانٹ چھانٹ کر رکھے تھے۔ کوئی پینزی ہیں کوئی ڈیزی ہیں کسی کو یہ خوش فہمی کہ وہ اپنے رنگ وروپ کی وجہ سے انگریز کا بچہ دکھائی دیتا ہے۔ تو اس نے اپنے نام کے ساتھ جان' لگالیا۔ کسی کو یہ غلط فہمی کہ وہ اپنے ناک نقشے کی وجہ سے یونانی نظر آتا ہے تو اس نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اپنے لئے یونانی نام منتخب کر لیا۔ اور چڑھانے والوں نے بھی کسی بہت زیادہ ہی اونچی سیڑھی پر چڑھا دیا۔

تابندہ بولا کر رہ گئی۔ کئی دنوں تک وہ ان میں سے اکثر کو غلط سلط ناموں سے پکار کر شرمندہ ہوتی رہی۔ احتشام بھائی کو آصف بھائی کہہ دیا اور آصف بھائی کو اختر بھائی بنا دیا۔ سیما کو فریحہ اور فریحہ کو شمیلہ کہہ کر پکار لیا۔ جب ادھر ادھر سے ہیں۔ ہیں ارے۔ ارے کی آوازیں آئیں تو شپٹا کر تیری میری صورت تکنا شروع کر دی۔ گھر کے لوگوں کی تعداد ہی کیا کم تھی کہ اوپر سے آنے جانے والے لوگوں نے اور پریشان کر کے رکھ دیا۔ پھوپھی جان کی نندوں، نندویوں اور ان کی اولادوں

نے تابندہ کے پاگل ہو جانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سب سے میل جول ہے، سب کے ساتھ تعلقات اچھے تھے۔ محبت مارا ماری پڑتی تھی۔ صبح سے لے کر رات تک مہمانداری ہو رہی ہے۔ خانساماں غریب کھانے پکا پکا کر پاگل نہیں تو نیم پاگل ضرور ہوا جا رہا ہے۔ ملازم چائے بنا بنا کر اور گھر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک دوڑ لگا کر بوکھلائے جاتے ہیں۔

گھر کا ہر فرد اپنی مثال آپ تھا۔ کوئی نیویارک کی سڑکوں کی پیمائش کر کے آیا تھا، کوئی افریقہ کے گھنے جنگلوں میں بھٹک بھٹکا کر آیا تھا۔ ہر شخص کا شوق بھی نرالا تھا۔ جو کلبوں اور ہوٹلوں کے رسیا تھے، ان کے قدم شام کے وقت گھر میں مشکل سے ہی ٹکتے تھے جو فلم کے دیوانے تھے وہ ہر اچھی بری فلم دیکھنا فرض سمجھتے تھے شائستہ آپا کو کتابوں سے جنون کی حد تک عشق تھا وہ آنکھوں پر موٹے شیشوں والی عینک چڑھائے زیادہ تر وقت کتاب پر ہی جھکی نظر آتی تھیں۔ ان کے کمرے میں ہر طرف کتابیں ہی کتابیں نظر آتی تھیں۔ کتاب پڑھے بغیر نہ تو انہیں کچھ کھایا پیا ہضم ہوتا تھا اور نہ ہی انہیں نیند آتی تھی۔

کھانے کا عالم یہ تھا کہ تابندہ نت نئے نام سن سن کر پریشان ہو گئی۔ اس غریب نے تو سیدھے سادے پاکستانی کھانے کھائے تھے انہیں کے نام سنے تھے، بے چاری بوا اور شکورے کی بیوی کو کیا خبر کہ اطالوی ڈش کیسے تیار ہوتی ہے اور چینی کھانے کیسے پکائے جاتے ہیں پھوپھی جان کے گھر کے افراد کی زبانوں کو غیر ملکی کھانوں کی چاٹ پڑی ہوئی تھی، کبھی آصف بھائی فرمائش کر کے اسپیگھٹی بنوا رہے ہیں، کبھی اپیا کی خواہش ہے کہ آج میں "رولت خامہ" (ایرانی ڈش) کھاؤں گی سیما کو ہفتے میں کم از کم دو دفعہ کونٹی نینٹل جیلی ٹرائفل کی طلب ہوتی تھی۔

"میں کن لوگوں میں پھنس گئی ہوں؟"

تابندہ سوچتی اور پھر صبر کر لیتی کہ اب چاہے جن لوگوں میں بھی پھنس گئی ہوں، رہنا تو مجھے یہیں ہے۔ معلوم نہیں کب تک؟ حالانکہ اس گھر کے لوگوں نے اسے بڑی محبت اور چاہت دی تھی۔ سبھی اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن کسی کی محبت، چاہت اور دل جوئی اس خلا کو پُر نہ کر سکی جو اپنے چھوٹے سے گھر کے لوگوں سے بچھڑ کر اس کی زندگی میں پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی خاموش پرسکون زندگی اس اچانک حادثے سے کچھ اتنی زیادہ متاثر ہوئی تھی کہ اس کی فطرت اور اس کی طبیعت میں خود بخود تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ کبھی بھی حساس نہیں تھی۔ عمر رفتہ کے پچھلے سارے لمحات اس نے ہنستے کھیلتے ہوئے گزارے تھے دکھ کا احساس اسے پہلی بار اس وقت ہوا جب بوا نے چپکے سے آنکھیں بند کیں۔ اس کے بعد سے اس کا دل جیسے کرچی کرچی ہو کر رہ گیا تھا۔ بات بات پہ آنسو نکل آتے تھے، پلکیں بھیگ جاتی تھیں اور وہ اپنے کمرے کے دریچے میں کھڑی یا

کسی کونے میں کھڑی چپ چاپ روئے جاتی - ایک تو اسے وقت بے وقت شرمندہ، حیران اور پریشان ہونا پڑتا تھا کھانے کی میز پر بیٹھتی تو اپنی پسندیدہ چیز چاول کھا ہی نہیں سکتی تھی اس نے ہمیشہ ہاتھ سے چاول کھائے تھے، چمچے سے کھاتے ہوئے اسے سخت الجھن ہوتی تھی- لیکن یہاں چھوٹے بڑے سب چمچوں اور کانٹوں کا استعمال کرتے تھے، وہ دل نہ چاہتے ہوئے بھی چپ چاپ روٹی اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیتی اور سر جھکائے چھوٹے چھوٹے نوالے حلق سے اتارتی رہتی-

پھر...... گھر میں ہر وقت گٹ پٹ، گٹ پٹ ہوا کرتی تھی اس کا اسکول بھی اردو میڈیم تھا اور کالج میں بھی اتنی انگریزی اس کے فرشتوں کو بھی نہیں آتی تھی کہ وہ فراٹے سے بات کر سکے- مجبوراً زیادہ تر خاموش ہی رہتی تھی- ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ شدید احساس کمتری کا شکار ہوگئی- لیکن تنہائی میں وہ جب بھی اپنے متعلق سوچتی تو اسے اپنے دل سے یہی آواز سنائی دیتی کہ اس طرح زندگی گزارنا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں اپنے متعلق گھنٹوں اور پہروں سوچنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کر لیا کہ گھر کے دوسرے لوگ خواہ جس انداز سے بھی زندگی گزاریں، وہ اپنی روش نہیں بدلے گی- وہ ہاتھ سے ہی چاول کھائے گی- گھر میں ننگے پاؤں ہی پھرے گی اور باقی تمام باتوں پر بھی اسی طرح عمل کرتی رہے گی جس طرح پہلے کرتی تھی- جب رہنا ہی اسی گھر میں ہے تو وہ کیوں خواہ مخواہ اپنے آپ کو جلاتی اور کڑھاتی رہے اپنے بارے میں قطعی فیصلہ کر لینے کے بعد وہ جیسے مطمئن سی ہوگئی-

ایک روز کالج سے واپسی میں اسے دیر ہوگئی، گھر پہنچی تو سوائے اس کے سبھی کھانا کھا چکے تھے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے وہ یہ سوچ کر دل ہی دل میں خوش ہوتی رہی کہ چلو اچھا ہے آج تو میں اکیلی ہوں، ہاتھ سے چاول کھاؤں گی، خوب مزے لے لے کر، لیکن...... کپڑے بدل کر وہ کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ ہشام بھائی کی گاڑی آکر رکی ہشام بھائی اپنے کلینک سے واپس آئے تھے- تابندہ کے بڑھتے قدم رک گئے- ایک لمحے کے لئے اس نے کچھ سوچا اور اپنے کمرے میں واپس چلی گئی- ملازمہ اسے کھانے کے لیے بلانے آئی، تو اس نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا-

''میرا کھانا یہیں لے آؤ-''

ملازمہ ''جی اچھا'' کہہ کر چلی گئی، لیکن دو تین منٹ کے بعد ہی وہ الٹے قدموں واپس آ گئی-

''بی بی، ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں آپ وہیں آ کر کھانا کھائیے-''

''کیوں؟''

تابندہ چڑ کر بولی-

''معلوم نہیں-''

ملازمہ نے کہا-

''نہیں، میں یہیں کھاؤں گی-''

تابندہ کے لہجے میں ضد تھی-

ملازمہ غریب پھر ڈائننگ روم کی طرف چلی گئی- چند منٹ بعد وہ خالی ہاتھ جھلاتی آ گئی-

''ڈاکٹر صاحب آپ کو بلاتے ہیں-''

''بس رہنے دو، تم جاؤ، مجھے نہیں ضرورت کھانا کھانے کی-''

تابندہ جھنجلا کر بولی-

ملازمہ نے واپس جانے کے لئے قدم اٹھائے تو تابندہ جلدی سے بولی-

''ٹھہرو، ٹھہرو، ان سے کچھ نہ کہنا، میں آ رہی ہوں-''

چپل پہن کر وہ مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی ڈائننگ روم میں پہنچ گئی- قدموں کی آہٹ پر ہشام بھائی نے گردن گھما کر دیکھا اور زیر لب مسکراتے ہوئے اس کے چہرے کا جائزہ لیا- اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کرسی کھسکائی اور سنبھل کر بیٹھ گئی-

''کیا بات ہے؟ یہاں آنے سے انکار کیوں کر رہی تھیں-''

ہشام بھائی نے پوچھا-

''جی بس ایسے ہی-''

تابندہ کی آواز بہت دھیمی تھی-

''آخر کوئی وجہ تو ہوگی؟''

ہشام بھائی نے کہا-

''وجہ؟ کوئی وجہ نہیں-''

تابندہ نے کہا-

''اچھا چلو، نکالو کھانا-''

ہشام بھائی نے کہا-

تابندہ نے تھوڑے سے چاول اپنی پلیٹ میں نکالے، سالن ڈال کر کنکھیوں سے ہشام بھائی کی طرف دیکھا اور ڈرتے ڈرتے بغیر چمچہ کے کھانا شروع کیا- ہشام بھائی نے سالن نکال کر روٹی لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو تابندہ کی طرف نظر اٹھ گئی-

''ہاتھ سے کیوں کھا رہی ہو، چمچہ رکھا تو ہے سامنے-''

بس ہشام بھائی کا اتنا کہنا غضب ہو گیا- تابندہ نے نوالہ پلیٹ میں گرا دیا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی-

''ارے، خیریت! یہ تم کھانا چھوڑ کر کیوں بیٹھ گئیں؟''

تابندہ اٹھ کر تیز تیز قدموں سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور اپنے بستر پر اوندھی گر کر رونے لگی-

''معلوم نہیں ابا میاں مجھے کون لوگوں میں چھوڑ کر چلے گئے ہیں؟ ہر کام اور ہر بات میں دوسروں کی مرضی کا خیال رکھو...... بوا بے چاری نے تو......''

بس یہی سب سوچ کر اس کا دل بھر آیا تھا-

اور دوسری طرف ہشام بھائی، پہلے تو حیران پریشان اپنی جگہ پر بیٹھے رہے- ان کی سمجھ میں ہی نہ آسکا کہ آخر انہوں نے ایسی کون سی بات کہہ دی جو تابندہ یوں اٹھ کر چلی گئی- وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے اور تابندہ کے کمرے کی طرف چلے گئے- جب دو تین دفعہ دروازے پر دستک دینے پر بھی اندر سے کوئی آواز نہ آئی تو وہ پریشان ہو کر اندر داخل ہو گئے- اندر کا سین دیکھ کر ان کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا-

''تابندہ؟''

انہوں نے آواز دی- دو تین دفعہ آواز دینے پر تابندہ نے سر اوپر اٹھایا اور بڑی بے دردی سے اپنی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں رگڑنے لگی-

''رو کیوں رہی ہو؟''

ہشام بھائی اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے-

تابندہ نے کوئی جواب نہیں دیا-

''میری کوئی بات بری لگی ہے؟''

تابندہ نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا-

''کچھ بولو تو سہی' تمہارے خاموش رہنے سے کسی کو کیا پتہ چلے گا کہ تمہیں کیا تکلیف ہے-''

ہشام بھائی کے لہجے میں بہت نرمی تھی لیکن تابندہ نے تو جیسے ان کی کسی بات کا جواب نہ دینے کی قسم کھائی تھی-

''بلاوجہ نہیں رویا کرتے، چلو اٹھو کھانا کھاؤ-''

ہشام بھائی نے اس طرح کہا جیسے وہ کوئی بہت ننھی سی بچی ہو-''

''میں نہیں کھاؤں گی-''

تابندہ نے لمبے لمبے آنسو بہاتے ہوئے کہا-

''کیوں؟''

''میں یہاں رہوں گی بھی نہیں، میرے ابا میاں کو خط لکھ دیں کہ وہ مجھے آ کر یہاں سے لے جائیں-''

تابندہ کا انداز کسی ضدی بچے کا سا تھا-

''کیوں؟ تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟''

ہشام بھائی نے پوچھا-

''ہاں، بہت ساری تکلیفیں ہیں-''

تابندہ کی ''ہاں'' کچھ اتنی زور کی تھی کہ ہشام بھائی اس کی صورت تکنے لگے- پھر کچھ سوچ کر انہوں نے بڑی نرمی سے اس کی تکلیفوں کی فہرست طلب کی اور تابندہ تو جیسے منتظر ہی بیٹھی تھی کہ کوئی ایک اشارہ کرے اور وہ شکایتوں کا دفتر کھول کر بیٹھ جائے- اس نے مسلسل آنسو بہاتے ہوئے اپنی تکلیفوں کی فہرست پیش کر دی- ہشام بھائی بیساختہ ہنس دیئے-

''بس، اتنی معمولی سی بات؟''

ہشام بھائی محبت پاش نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے-

''اچھا بھائی، ایسا ہے کہ تم وہی کام کرو جس سے تمہارا دل خوش ہوتا ہو تم شوق سے گھر میں ننگے پیر پھرو، ہاتھ سے چاول کھاؤ، دو دو تین تین دن بعد کپڑے بدلو، دوسرے لوگ اگر رات کو سلیپنگ سوٹ پہنتے ہوں تو تم قطعی پرواہ نہ کرو، اپنے انہیں کپڑوں میں سو جاؤ اور باقی سب کام بھی اسی انداز سے کرو جس طرح پہلے کرتی تھیں کوئی شخص تمہیں نہیں ٹوکے گا اور نہ تم پر ہنسے گا-''

ہشام بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا-

''آؤ اب چل کر کھانا کھا لو، اٹھو گڈ گرل!''

ہشام بھائی نے کہا-

''آپ دوسروں کو کیا منع کریں گے آپ تو خود انگریزی بولتے ہیں-''

تابندہ نے کہا-

''اتنی انگریزی تو تم سمجھ لیتی ہو-''

''میں اس سے کہیں زیادہ انگریزی سمجھ لیتی ہوں، لیکن مجھے انگریزی بولنا بالکل ــــ نہیں اچھا لگتا-''

''ٹھیک ہے تم مجھے فوراً ٹوک دیا کرو-''

ہشام بھائی ہنس دیئے اور اس کو ساتھ لے کر ڈائننگ روم کی طرف چل دیئے- اس روز پہلی مرتبہ

تابندہ نے سکون اور اطمینان کے ساتھ کھانا کھایا۔

اس دن کے بعد سے تابندہ کی ذہنی الجھن میں کافی حد تک کمی آ گئی۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا سب کچھ اپنی مرضی کے مطابق ہونے لگا۔ اگر کسی وقت کسی نے ٹوکنے کی کوشش بھی کی تو ہشام بھائی حمایتی بن کر کھڑے ہو گئے۔

"نہیں بھئی، اسے کوئی نہ ٹوکے جیسے وہ خوش رہے اسی طرح کرنے دو۔"

اور اس ساری حمایت کی وجہ یہ تھی کہ اس دن کے چھوٹے سے واقعے نے ہشام بھائی کی سوچوں کے انداز بدل دیئے تھے۔ تابندہ...... انہیں بری تو کبھی بھی نہیں لگی تھی۔ جب پہلے روز وہ اس گھر میں آئی تھی، کچھ سہمی اور ڈری ہوئی سی۔ کچھ افسردہ اور تھکی تھکی سی۔ جبھی وہ انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی سب لڑکیوں سے منفرد نظر آئی تھی۔ اس کے بعد بھی جب جب ان کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں، وہ انہیں پہلے کی نسبت زیادہ ہی اچھی لگی۔ جو سادگی اور معصومیت اس میں تھی، وہ گھر کی کسی دوسری لڑکی کا حصہ نہیں تھی، لیکن ان کے ہوش وحواس پر اس بری طرح وہ کبھی نہیں چھائی تھی کہ وہ اپنے اور اس کے بارے میں کوئی قطعی اور آخری فیصلہ کر لیتے۔

اس دن کے بعد سے انہوں نے اس کے متعلق فرصت کی گھڑیوں میں بار بار سوچا۔ اور جتنا زیادہ سوچا وہ انہیں اتنی ہی زیادہ اچھی لگی۔ لیکن ان کی اس چاہت کی خبر تابندہ کے فرشتوں کو بھی نہ ہو سکی۔ اور ہوتی بھی کیسے؟ ہشام بھائی کی چاہت کا انداز بھی تو بڑا عجیب سا تھا۔ انہوں نے نہ تو اسے کبھی اپنی نگاہوں سے کوئی پیغام دینے کی کوشش کی۔ اور نہ اپنے جذبات کی ترجمانی کے لیے زبان کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ اس سے بات کرتے وقت یا کسی بھی موقعے پر اس کی حمایت لیتے وقت ان کی آواز اور ان کی نگاہوں سے محبت کا اظہار ضرور ہوتا تھا لیکن اس محبت کا انداز ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کسی بہت بڑی عمر کے آدمی کو کسی بہت چھوٹی سی بچی کے ساتھ پیار ہو لیکن...... ایک روز ان کے جذبات نے انہیں شکست دے دی۔ اور اس روز تابندہ کو یقین تو نہیں شبہ ضرور ہوا کہ ہشام بھائی کے دل میں شاید......

ہوا یوں تھا کہ اس روز اس کا بی۔ اے فرسٹ ایئر کا پرچہ تھا۔ واپسی میں اس کے رکشہ کا ایک تیز رفتار بس سے ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ہوش آنے پر اس نے اپنے آپ کو ہسپتال کے سفید بستر پر پٹیوں سے جکڑا ہوا پایا۔ گھر کے سارے افراد آ کر اس سے ملتے رہے اور ڈاکٹر کی ہدایت کے بموجب صرف دو چار جملوں میں اس کی خیریت پوچھ کر چلے گئے۔ اس کے ہوش میں آنے سے پہلے بھی کے چہروں پہ ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ وہ بے ہوش بھی تو گھنٹوں رہی تھی سب سے زیادہ پریشان پھوپھی جان تھیں، یہ سوچ سوچ کر کہ بھائی کی امانت ہے اگر خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو کیا منہ دکھاؤں

گی، پھر ڈاکٹروں نے یہ کہہ انہیں اور ہولا دیا تھا کہ ممکن ہے ان کی بینائی۔ اس سے آگے سننے کی پھوپھی جان میں ہمت نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر کے وہاں سے ہٹ گئی تھیں...... کتنی منتیں انہوں نے مانگ ڈالی تھیں۔

ہشام بھائی اس کے کمرے میں اس وقت آئے جب وہ تنہا تھی۔ اس کے بستر کے قریب پہنچتے ہی انہوں نے جس بیتابی سے اس کا ہاتھ تھام کر والہانہ انداز سے اپنی آنکھوں اور اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ اس انداز کو دیکھ کر تابندہ کی نگاہیں حیرت سے ان کے چہرے پر جمی رہ گئیں۔

اس وقت وہاں کوئی بھی ہوتا تو ان کے چہرے کے آئینے میں ان کے دل کی تصویر کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ ان کی آنکھوں سے چمکتی ہوئی محبت کو دیکھ سکتا تھا جو صرف اور صرف تابندہ کے لئے تھی۔ تو پھر تابندہ بھی کوئی ناسمجھ بچی تو نہیں تھی۔ ان کی زبان سے سوائے تابندہ کے اور کوئی لفظ نہیں نکلا، لیکن جس پیار اور محبت سے انہوں نے اس کا نام ایک بار لے کر دوبارہ پکارا تھا، اس میں دل کے جذبات اپنی تمامتر گہرائیوں کے ساتھ سموئے ہوئے تھے۔

اور...... تابندہ نے محسوس کیا کہ آج اس کا دل جس انداز سے دھڑکا ہے، ایسے تو پہلے کبھی نہیں دھڑکا تھا۔ وہ ابھی دل کے اس طرح دھڑکنے کا سبب سوچ ہی رہی تھی کہ ہشام بھائی کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں، تابندہ کی پلکیں لرز کر رہ گئیں۔ ہشام بھائی اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے۔ چند لمحوں تک ان کی نگاہیں اس کے چہرے پر سے ہٹ ہی نہ سکیں۔ مگر زبان نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔

تابندہ کے لئے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو گیا، باوجود کوشش کے اسے یاد نہ آ سکا کہ عمر گزشتہ کے پچھلے لمحوں میں کبھی اس کی ایسی کیفیت ہوئی ہو۔ وہ اس طرح نروس ہوئی ہو۔ کمرے کی فضا اتنی انوکھی سی تھی کہ تابندہ چند لمحوں کے لئے کھو سی گئی۔ لیکن آخر کب تک؟ اس نے اپنی کیفیت پر قابو پا ہی لیا اور آہستہ سے بولی۔

"ہشام بھائی، مجھے کتنے دنوں تک چھٹی مل جائے گی یہاں سے؟"

"کیوں؟"

ہشام بھائی نے الٹا اس سے سوال کر دیا۔

"ابھی تو میرا ایک پرچہ باقی ہے۔"

تابندہ نے فکرمندی سے کہا۔

"کب ہے تمہارا اگلا پرچہ؟"

ہشام بھائی نے پوچھا۔

"تین دن بعد۔"

"اتنی جلدی تو ڈسچارج نہیں کریں گے۔"
"پھر میں امتحان کیسے دوں گی؟"
"ایک ہی پرچہ تو ہے، اگلے سال فائنل کے پرچوں کے ساتھ دے دینا۔"
تابندہ سوچ میں ڈوب گئی۔
"تمہیں پرچے کی فکر لگی ہوئی ہے اور مجھے......"
ہشام بھائی نے بات ادھوری چھوڑ کر نگاہیں فرش پر جمادیں۔
تابندہ نے منتظر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا تو ہشام بھائی اس کی طرف قدرے جھکتے ہوئے بولے۔
"تابندہ، تم ٹھیک رہو، ہمیشہ ٹھیک رہو۔ تمہیں کبھی کچھ نہیں ہونا چاہئے۔"
تابندہ کا دل چاہا، ان سے پوچھے۔ کیوں؟۔ آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟
لیکن اس نے سوچا۔ اسے ان سے کچھ نہیں پوچھنا چاہئے۔ وہ ان سے کیوں پوچھے؟ کچھ نہ کہنے کے باوجود وہ سب کچھ تو کہہ گئے ہیں۔ وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی۔ اور اپنی زندگی کے اس نئے انوکھے اور حسین موڑ کے متعلق سوچنے لگی۔
ہشام بھائی کی نگاہیں جب ایک بار دانستہ یا نادانستہ طور پر دل کے جذبوں کو عیاں کر چکیں۔ تو پھر راز...... راز نہ رہ سکا۔ آہستہ آہستہ گھر کے دوسرے افراد کو بھی ہشام بھائی کی چاہت کا علم ہو گیا۔
پھوپھی جان اس بات سے اگر ایک طرف خوش تھیں تو دوسری طرف پریشان بھی...... ہشام بھائی ان کے بیٹے ہوتے تو وہ تابندہ کو اور انہیں شادی کے بندھن میں کل کا جکڑتا آج ہی جکڑ دیتیں لیکن جیٹھانی کی اولاد پہ ان کا حق بھلا کتنا ہو سکتا تھا؟ مشکل یہ تھی کہ وہ اس سلسلے میں اپنی جیٹھانی کو کوئی مشورہ بھی نہیں دے سکتی تھیں۔ کیونکہ ان کے علم میں یہ بات تھی کہ اپنے بھائی کی بیٹی ثمینہ کو انہوں نے ہشام بھائی کے لئے پسند کر لیا تھا۔ اور یہ بات گھر کے باقی افراد کو بھی معلوم تھی۔
لیکن اب حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا۔ اس نے انہیں الجھن میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت زبان سے کوئی بات نکالنا بھی مناسب نہیں تھا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے وہ خوش آئند لمحوں کے خواب دیکھ رہی تھیں۔
پھر...... وقت کا ہر لمحہ ہشام بھائی کو تابندہ کے قریب کرتا گیا۔ اور تابندہ کی سوچیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ وہ ہشام بھائی کو پسند کرنے کے باوجود یہ نہ سمجھ سکی کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں اس نے تو اپنے آپ کو چپ چاپ وقت کی لہروں پہ بہنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اسے اس حقیقت کا علم تو نہیں تھا کہ ہشام بھائی کی امی نے ان کے لئے ثمینہ کو پسند کر لیا تھا۔ مگر ہشام بھائی کے لئے

ثمینہ کی نگاہوں میں چھپی ہوئی محبت کا اسے اچھی طرح علم تھا، لیکن وہ اس سے بھی بے خبر نہیں تھی کہ ہشام بھائی کو اس کی رتی برابر پروا نہ تھی۔
ایک دن ایسا بھی آیا۔ جب تابندہ کو بھی ہشام بھائی کی امی کی خواہش کا علم ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سینے میں کوئی چیز ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی ہو اس روز اسے پہلی بار احساس ہوا کہ انجانے میں اس کے قدم اسے غلط منزل تک لے آئے تھے اور وہ چلتے چلتے اتنی دور تک آ پہنچی تھی کہ اب واپس پلٹ جانا اسے اپنے اختیار کی بات نہیں معلوم ہو رہی تھی، منزل تک پہنچ جانے کے بعد لوٹ جانے کا احساس بہت تکلیف دہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایسا کرنے کے لئے مجبور تھی۔
اس نے سوچا...... درد کا احساس چاہے جتنا بھی شدید ہو دل چاہے یا نہ چاہے مجھے واپس جانا ہی پڑے گا۔ لغزش مجھ سے ہوئی ہے تو خمیازہ بھی مجھے ہی بھگتنا پڑے گا۔ مجھے کیا حق پہنچتا تھا کہ میں کچھ سوچے سمجھے بغیر ان راہوں کی طرف چلی آئی جو کسی اور کی منزل تک لے جاتی ہیں۔ ہشام بھائی میری نہیں ثمینہ کی منزل ہیں...... وہ میرے خوابوں کی نہیں...... ثمینہ کے خوابوں کی تعبیر ہیں میں اپنی پلکوں پر یہ جھوٹے خواب کیوں سجائے بیٹھی ہوں؟ میں...... یہ کن بلندیوں کو چھو لینے کی کوشش کر بیٹھی ہوں؟ میں بادلوں کو چھو لینے کی تمنا کیوں کر بیٹھی ہوں؟
اس کی زندگی کی وہ پہلی رات تھی، جو اس نے تمام تقریباً جاگتے ہوئے گزار دی۔ ہشام بھائی کے متعلق اس نے پہلے بھی بار بار سوچا تھا، بہت سوچا تھا۔ اور بڑے پیار سے سوچا تھا۔ لیکن اتنی بے تابی اور اتنی شدت سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا۔ کئی بار اس کے دل نے اسے یہ مشورہ دیا کہ دوسروں کی پروا نہ کرو، صرف اپنے بارے میں سوچو، یہ بھول جاؤ کہ ثمینہ کیا چاہتی ہے؟ یہ سوچو کہ تم کیا چاہتی ہو؟ اس بات کو فراموش کر دو کہ ثمینہ ہشام بھائی کو پسند کرتی ہے یہ یاد رکھو کہ ہشام بھائی تمہیں چاہتے ہیں، کسی چیز کو پا کر دانستہ کھو دینا عقل مندی نہیں۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید دل کے اس مشورے کو قبول کر لیتی، لیکن اس پر تو بوا کی تربیت کا کچھ ایسا اثر تھا کہ اپنی ذات سے دوسروں کو تکلیف پہنچا کر وہ خوش ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے کو آنسوؤں کے سمندر میں ڈبو کو خود قہقہے نہیں لگا سکتی تھی۔ ہاں، یہ ضرور کر سکتی تھی کہ اپنے ارمانوں کی راکھ کے ڈھیر پر دوسرے کے پیار کا محل تعمیر کر دے۔
جب دل نے غلط راہ دکھائی تو جانے کہاں سے؟ جانے کدھر سے بوا کی نرم، میٹھی اور پر شفقت آواز آئی۔ "بیٹا، کسی کا حق مارنا بہت بری بات ہے۔"
یہ تو اسے یاد نہ آ سکا کہ بوا نے یہ ڈائیلاگ کس موقع پر بولا تھا۔ لیکن بہر حال، بوا کی نصیحتوں میں

سے ایک نصیحت یہ بھی تھی جسے بھلانا اس کے بس کی بات نہیں تھی...... صبح ہونے تک اس نے قطعی فیصلہ کرلیا کہ وہ ہشام بھائی اور ثمینہ کے راستے سے ہٹ جائے گی- فیصلہ کرنے کو تو اس نے کرلیا، لیکن دل کی جو حالت تھی اسے باوجود کوشش کے وہ دوسرے کی نظروں سے چھپا نہ سکی- باقی لوگوں کو اس نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر ٹال دیا- مگر ہشام بھائی اس کی باتوں میں نہ آسکے-

رات کو دیر تک جاگنے کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ صبح اس کی آنکھ ہی نہ کھل سکی- ناشتے کی میز پر اسے موجود نہ پا کر ہشام بھائی کو فکر ہوئی انہوں نے کسی سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا- ناشتے کے بعد اس کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے انہوں نے دروازے پر دستک دی- تابندہ اسی وقت سو کر اٹھی تھی اور بستر پر بیٹھی ہوئی کسلمندی سے پاؤں ہلا رہی تھی دستک کی آواز سن کر وہ آنکھیں ملتی ہوئی دروازے تک آئی...... دروازہ کھولتے ہی جونہی اس کی نظر ہشام بھائی پر پڑی وہ انہیں سلام کرنا ہی بھول گئی-

''ابھی سو کر اٹھی ہو؟''

''جی-''

تابندہ کی پلکیں جھک گئیں' جانے کس خیال کے تحت-

''کیوں؟''

''رات کو نیند دیر سے آئی تھی-''

''وجہ؟''

''معلوم نہیں-''

''خوب''

ہشام بھائی مسکرائے-

تابندہ نے کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھا اور خاموش رہی-

''پھر؟ اب کیا ارادہ ہے؟ کالج نہیں جانا؟''

''سوچوں گی-''

''آج تمہاری ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی-''

ہشام بھائی نے یہ جملہ یونہی کہہ دیا تھا، لیکن اس پر تابندہ جس انداز سے ''جی'' کر کے چونکی- اس نے ہشام بھائی کو سوچنے پر مجبور کر دیا مگر اس وقت انہیں ویسے ہی دیر ہو رہی تھی-- وہ یہ سوچ کر کہ دوپہر کو اس سے تفصیلی بات کریں گے- اسے ناشتہ کرنے کے لئے کہہ کر چلے گئے-- دوپہر کو تابندہ سے ان کی ملاقات ہی نہ ہو سکی- وہ کلینک سے واپس آئے تو تابندہ سو رہی تھی- شام کو وہ پھر

کلینک چلے گئے تابندہ معلوم نہیں کہاں مصروف تھی- واپسی پر گھر پہنچنے تک تاریکی پھیل چکی تھی- گھر میں سناٹا سا تھا- ملازم سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ سوائے بڑی بیگم صاب' چھوٹی بیگم صاب اور تابندہ بی بی کے اور کوئی نہیں ہے- ہشام بھائی نے جونہی تابندہ کے کمرے کی طرف جانے کے لئے قدم بڑھائے تو ملازم جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے بولا-

''اور ہاں ڈاکٹر صاب، وہ شائستہ بٹیا بھی ہیں-''

''اچھا، وہ نہیں گئیں؟''

''نہیں جی، انہیں آج ہی کوئی کتاب ختم کرنی ہے-''

ملازم نے دوسروں سے سنا ہوا جملہ دہرا دیا-

ہشام بھائی مسکراتے ہوئے تابندہ کے کمرے کی طرف چل دیئے اس کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، پردے ایک طرف سرکے ہوئے تھے اور وہ خود دریچے میں جھکی ہوئی باہر دیکھ رہی تھی ہشام بھائی کمرے میں داخل ہو گئے- لیکن اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا...... وہ قریب جا کر کھڑے ہو گئے- تو تابندہ نے بہت مدھم آواز میں سلام کیا- انہوں نے سر کے خفیف سے اشارے سے جواب دیا اور چند لمحے خاموش کھڑے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے رہے- تابندہ ان کی نگاہوں کی گرمی اپنے چہرے پر محسوس کر کے کچھ نروس سی ہو گئی-

''تم نہیں گئیں؟''

ہشام بھائی نے پوچھا-

''نہیں-''

تابندہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا-

''کیوں؟''

''دل نہیں چاہا-''

''دل نہیں چاہا؟'' ہشام بھائی زیر لب بولے-

تابندہ نے کوئی جواب نہیں دیا-

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم صبح سے نارمل نہیں ہو-''

ہشام بھائی نے کہا-

''جی! نہیں تو-''

تابندہ نے قدرے گھبرا کر کہا-

''تم مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکتیں۔''

ہشام بھائی نے کہا۔

''جی!''

تابندہ نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

''تمہارا چہرہ تو آئینہ ہے، بہت صاف وشفاف!'' ہشام بھائی کی نگاہوں میں اس کے لئے پیار ہی پیار تھا۔

تابندہ نے ایک لمحے کے لئے ان کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

''مجھے بتاؤ کیا بات ہے؟''

ہشام بھائی نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔''

تابندہ نے کہا۔

ہشام بھائی نے چند سکینڈ کے لئے کچھ سوچا، پھر کچھ کہے بغیر کمرے سے باہر جانے لگے۔ تابندہ نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور قدرے اونچی آواز سے انہیں پکارا۔ ہشام بھائی مڑ کر دیکھے بغیر کمرے سے باہر نکل گئے۔ تابندہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی۔

''ناراض ہو گئے ہیں؟''

تابندہ رو دینے کے قریب تھی۔

''نہیں۔''

ہشام بھائی نے کہا۔

''پھر آپ اس طرح کیوں چل دیئے؟''

''تمہارا موڈ خراب معلوم ہوتا ہے۔''

''آپ کو...... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

تابندہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تم صبح سے پریشان ہو اور...... اداس بھی، میرے پوچھنے کے باوجود تم نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے تو پھر......''

انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

تابندہ ان کے چہرے پر نگاہیں جمائے کھڑی رہی۔

ہشام بھائی نے بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کی طرف قدرے جھکتے ہوئے

بولے۔

''تمہارے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن اپنے متعلق جانتا ہوں کہ تم سے کوئی بات چھپانا میں اچھا نہیں سمجھتا۔''

تابندہ کی نگاہیں ہشام بھائی کے چہرے سے پھر بھی نہ ہٹ سکیں۔

''شاباش، جلدی سے بتا دو کیا بات ہے؟''

ہشام بھائی نے اس انداز سے کہا جیسے وہ اپنے ٹانگ برابر کسی بچی سے مخاطب ہوں۔ ان کے لہجے میں کچھ اتنی اپنائیت اور اتنا پیار تھا کہ تابندہ کا پریشان اور اداس دل بھر آیا۔ دل کا سارا درد آنکھوں میں سمٹ آیا۔ اور آنکھیں چھلک پڑنے کو بیتاب ہو گئیں۔ اپنے آنسوؤں کو ہشام بھائی کی نگاہوں سے چھپانے کی خاطر وہ رخ موڑ کر کھڑی ہو گئی۔ اور پھر دوسرے ہی لمحے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

'عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔''

ہشام بھائی پریشان ہو کر زیر لب بولے اور اس کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہو گئے۔ تابندہ دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور آنسو رخساروں پر پھیل رہے تھے۔

ہشام بھائی چند لمحے چپ چاپ کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے، پھر انگلیوں سے اس کے بہتے ہوئے آنسو پونچھ دیئے۔

''تم اس وقت بہت اداس ہو، آؤ کہیں گھوم کر آتے ہیں۔''

ہشام بھائی نے کہا۔

''نہیں۔''

تابندہ نے کہا۔

''کیوں؟''

''میں اپنے گھر واپس جاؤں گی۔''

تابندہ کا انداز بالکل بچوں کا سا تھا۔

''کون سے گھر کا ذکر کر رہی ہو؟ تمہارا گھر یہی ہے۔''

ہشام بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

''نہیں، یہ میرا گھر نہیں ہے۔''

تابندہ کے لہجے میں درشتی تھی۔

''آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟''

ہشام بھائی اس کے لہجے کو محسوس کرتے ہوئے بولے۔

تابندہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"میری کوئی بات بری لگی تمہیں؟"

ہشام بھائی نے پوچھا۔

تابندہ نے چند سکینڈ کے لئے کچھ سوچا پھر دھیمی آواز میں بولی۔

"جی!"

"وہ بات بھی بتادو۔"

ہشام بھائی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"آپ نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی کہ ثمینہ سے آپ کی......"

"اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔"

ہشام بھائی اس کی بات کاٹ کر بولے......ان کی آنکھوں میں بڑی گہری سوچیں تھیں۔

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔"

تابندہ نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم سے جھوٹ بول کر مجھے کوئی ایوارڈ نہیں مل جائے گا۔"

ہشام بھائی نے دریچے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

تابندہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے سر جھکائے کھڑی رہی۔ کئی لمحے کمرے کی گمبھیر سی خاموشی اور سناٹے کی نذر ہوگئے۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم کھڑے تھے

پھر ہشام بھائی نے اس خاموشی اور سکوت کو جھنجوڑا اور بڑی نرم اور دھیمی آواز میں بولے۔

"دیکھو تابندہ! تمہیں اس بات کی پروا نہیں کرنی چاہئے کہ دوسرے لوگ کیا سوچتے اور کیا کہتے ہیں؟ تم یا میں نہ تو کسی کے خیالات پر پہرے بٹھا سکتے ہیں اور نہ اپنی مرضی سے کسی پر یہ پابندی عائد کرسکتے ہیں کہ وہ فلاں سے محبت کرے اور فلاں سے نہ کرے۔"

ہشام بھائی ایک لمحے کے لئے رکے۔

"اگر ثمینہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہے تو میں بھی......"

ہشام بھائی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اور اگر تم صاف گوئی کو برا نہ سمجھو تو میں یہ کہوں گا کہ میں اس قسم کے معاملات میں ایثار اور قربانی کا قائل نہیں ہوں۔ مجھ میں اتنی بلندیوں کو چھو لینے کی ہمت قطعی نہیں ہے۔"

ہشام بھائی نے تابندہ کی لرزتی ہوئی پلکوں کی طرف دیکھا۔

"اور نہ ہی میں تمہیں اس بات کی اجازت دوں گا کہ اس قسم کے فضول خیالات کو دل و دماغ میں جگہ دو۔"

ہشام بھائی نے کہا۔

"جی!"

تابندہ نے حیرت زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں! مجھے معلوم ہے تم جیسی بے وقوف لڑکیاں اکثر اس قسم کی حماقتیں کیا کرتی ہیں۔"

ہشام بھائی کے ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ تھی۔

پھر ہشام بھائی نے اسے اپنے اور ثمینہ کے بارے میں صحیح صورت حال سے باخبر کرتے ہوئے کہا۔

"میں کسی کی پسند اور کسی کے مشورے کا پابند نہیں ہوں۔ چاہے وہ امی ہوں یا کوئی دوسرا۔"

تابندہ خاموش کھڑی رہی۔

"اب تم اپنی بات کرو، اگر مجھ پر اعتماد کرسکتی ہو، تو ٹھیک ہے، ورنہ جو تم مناسب سمجھو، کرو۔"

تابندہ نے ان کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

"اگر اس سلسلے میں تمہاری کوئی مجبوری ہو تو مجھے ابھی بتادو۔"

ہشام بھائی کی پیشانی پر گہری گہری سلوٹیں نمودار ہوئیں۔

تابندہ پھر بھی خاموش رہی۔

"میں ایک دفعہ کسی کی طرف قدم بڑھانے کے بعد خود کبھی پیچھے نہیں ہٹاتا۔"

ہشام بھائی کے لہجے کی صداقت ان کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

"تم بھی تو کچھ بولو، یوں چپ چاپ رہنے سے کام نہیں چلے گا۔"

ہشام بھائی نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

"آپ کی سب باتیں اپنی جگہ درست سہی، لیکن میں...... میں کسی کا حق نہیں مار سکتی۔"

تابندہ نے کہا۔

"حق؟ کس کا حق؟"

"ثمینہ کا۔"

"کیوں؟ آخر ثمینہ کس بات کی حق دار ہے؟"

"دیکھئے نا! آپ دونوں کا برسوں کا ساتھ ہے بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، آپ کے دل میں نہ سہی، ثمینہ کے دل میں تو آپ کی......"

''احمقانہ باتیں مت کرو۔''
ہشام بھائی درشت لہجے میں بولے۔
''بوا کہتی تھیں کہ کسی کا حق مارنا بہت بری بات ہے۔''
تابندہ نے انتہائی معصومیت سے کہا۔
''تمہارے ساتھ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ تمہیں بوا کی نصیحتوں نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔''
ہشام بھائی مسکرائے۔
''بوا کوئی غلط تو نہیں کہتی تھیں۔''
تابندہ نے جلدی سے کہا۔
''یہ سب تو میں نہیں جانتا کہ بوا غلط کہتی تھیں یا صحیح، لیکن یہ مجھے ضرور معلوم ہے کہ تم کسی کا حق نہیں مار رہی ہو۔''
ہشام بھائی نے کہا۔
''دیکھیے نا ہشام بھائی! ثمینہ تو......''
''جی ہاں، دکھایئے!''
ہشام بھائی زیر لب مسکرائے۔
تابندہ جھینپ کر رہ گئی۔
''جی فرمایئے۔''
ہشام بھائی اس کے جھینپنے پر محظوظ ہو کر بولے۔
''کچھ نہیں۔''
تابندہ اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے بولی۔
''نہیں کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہیے اور دوسرے یہ کہ اگر اجازت ہو تو میں بیٹھ جاؤں، کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں۔''
''ضرور بیٹھیے، بلکہ آپ کو تو بہت پہلے بیٹھ جانا چاہیے تھا۔''
تابندہ نے کرسی ان کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔
''تمہارا رونا دیکھ کر میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔''
ہشام بھائی تھکے تھکے انداز میں کرسی پر بیٹھ گئے۔
''اور جناب، بڑی مہربانی ہوگی میرے حال پر، اگر آپ بھی تشریف رکھیں۔''
ہشام بھائی مسکرائے۔

تابندہ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
''دیکھو بھئی تابندہ بیگم! میں بہت کم کسی کی پروا کیا کرتا ہوں۔ امی کے یا دوسرے لوگوں کے فیصلے اور ان کی پسند اپنی جگہ، مجھے کسی سے کوئی غرض نہیں، سوائے تمہارے۔''
ہشام بھائی لمحے بھر کے لئے رکے اور تابندہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بولے۔
''میں نے بہت سوچنے سمجھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں تم سے شادی کروں گا اور میرا دل و دماغ دونوں اس فیصلے پر مطمئن ہیں۔''
ہشام بھائی نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔
تابندہ کی اتنی ہمت ہی نہ ہو سکی کہ وہ ان سے نظریں ملا سکے۔ سر جھکائے فرش کی طرف دیکھتی رہی۔
''اگر تمہیں میرے فیصلے پر کوئی اعتراض ہے تو وہ بھی بتا دو۔''
ہشام بھائی نے کہا۔
تابندہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔
''اس وقت خاموشی اختیار کرنا بہت غلط بات ہے۔''
ہشام بھائی نے کہا۔
''میں آپ کا فیصلہ سن کر سخت خوفزدہ ہو گئی ہوں۔''
تابندہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
''کیوں؟ اس میں خوفزدہ ہونے کی کیا بات ہے؟''
ہشام بھائی سنجیدگی سے بولے۔
''میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے گھر میں کوئی ہنگامہ کھڑا ہو۔''
تابندہ نے کہا۔
''بس! اس کے علاوہ تو کوئی بات نہیں؟''
ہشام بھائی نے پوچھا۔
تابندہ نے انکار میں سر ہلا دیا۔
''اس کی تم فکر مت کرو، اول تو اس کے زیادہ امکانات نہیں ہیں اور اگر ہوں بھی تو میں ہر بات کا مقابلہ تنہا کروں گا۔''
ہشام بھائی مطمئن انداز سے بولے۔
تابندہ کی نگاہیں اوپر اٹھیں تو ہشام بھائی نے دیکھا اس کی آنکھوں میں بڑی گہری سوچیں تھیں۔

"اب کیا پریشانی ہے؟"

ہشام بھائی مسکرائے-

"جی، کچھ نہیں-"

تابندہ نے کہا-

"اچھا، اب ایک بات اور بتادو-"

ہشام بھائی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی-

"پوچھیے-"

تابندہ نے کہا-

"میں تمہیں برا تو نہیں لگتا-"

تابندہ کے لئے یہ بات بالکل غیر متوقع تھی- ہشام بھائی کے اس سوال پر وہ ایسی سٹپٹائی کہ اس کا سر کچھ زیادہ ہی جھک گیا-

ہشام بھائی کے دو تین دفعہ پوچھنے پر بھی جب اس نے جواب دینا تو درکنار ان کی طرف دیکھا بھی نہیں، تو ہشام بھائی اس کی طرف قدرے جھکتے ہوئے بولے-

"اگر میں تمہیں اچھا نہیں لگتا تو بھی کیا فرق پڑتا ہے، تم مجھے بہرحال بہت اچھی لگتی ہو، بہت ہی اچھی-"

ہشام بھائی یہ کہہ کر مسکرائے اور کمرے سے باہر چلے گئے-

پھر بہت سارے لمحات بڑی تیزی اور بڑی خاموشی سے وقت کے گہرے سمندر میں ڈوب گئے-

تابندہ دل میں خوفزدہ ہونے کے باوجود ہشام بھائی کے لئے اپنی سوچوں کے انداز بدل نہ سکی- وہ ثمینہ کی نگاہوں میں اپنے لئے غصہ اور ملامت دیکھتی تو اپنے آپ کو مجرم سمجھنے لگتی- اور دل میں قطعی فیصلہ کرلیتی کہ چاہے وہ ہشام بھائی کے لئے اپنی سوچوں کے انداز بدل نہ سکے، لیکن وہ انہیں اپنی زندگی کا ساتھی ہرگز نہیں بنائے گی- اگر اس نے ایسا کیا تو وہ اپنے ضمیر کی خلش کہاں لے جائے گی؟ لیکن اس کا ہر فیصلہ اور ہر ارادہ ریت کے گھروندے کی مانند ڈھے جاتا- جب ہشام بھائی اسے خاموش اور کھویا کھویا دیکھ کر اسے مخصوص نرم اور محبت بھرے لہجے میں سمجھانے بیٹھ جاتے- اور جب آخر میں وہ یہ جملہ کہتے-

"میں سب جانتا ہوں میں تمہیں اچھا نہیں لگتا-"

تو اس کی پلکیں خود بخود بھیگ جاتیں- ہشام بھائی کے اس جملے سے اسے بہت دکھ ہوتا تھا- ہشام بھائی اس کے لئے کیا تھے؟ وہ اسے کیسے لگتے تھے؟ اس کا اندازہ سوائے اس کے اور کسی کو

نہیں ہوسکتا تھا، کوئی کسی کے دل کی گہرائیوں میں کب جھانک سکا ہے؟

تابندہ کا خوف اور اس کے اندیشے غلط ثابت نہ ہوئے گھر میں جس افسانے نے جنم لیا تھا، اس کے متعلق اڑتی ہوئی خبر ہشام بھائی کی امی کے کانوں تک بھی پہنچی- شبہ تو انہیں پہلے ہی ہوا تھا- لیکن جب ان کے شبے نے یقین کی صورت اختیار کرلی تو وہ ہنگامہ بپا ہو ہی گیا جس کا تابندہ کو بہت پہلے سے اندازہ تھا مگر ہشام بھائی، تابندہ اور دوسرے لوگوں کے درمیان ایک آہنی دیوار بن کر کھڑے ہوگئے- ہر مخالفت اور ہر سختی کا انہوں نے تن تنہا مقابلہ کیا- مخالفت کی لہریں ان کی ضد اور ان کے اٹل فیصلے کی مضبوط چٹان سے ٹکرا ٹکرا کر اپنا سر پھوڑتی رہیں اور جیت ہشام بھائی کی ہوئی-

ہشام بھائی کی امی کو ان سے بہت پیار تھا- اور تابندہ کو بھی انہوں نے کبھی ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا- حقیقت تو یہ تھی کہ تابندہ میں سرے سے ایسی کوئی بات تھی ہی نہیں جس کی وجہ سے کوئی شخص اس پر ناپسندیدگی کی نظر ڈالتا- اس پر نگاہ پڑتے ہی دیکھنے والے کو اس پر پیار آتا تھا- ایمان کی بات تو یہ تھی کہ گھر میں اتنا بھی ہنگامہ نہ ہوا ہوتا- اگر "زبان" کا چکر بیچ میں نہ ہوتا- مارے غصے کے ہشام بھائی کی امی اسی لئے تو بپھر اٹھی تھیں کہ میں اپنے بھائی بھاوج کو زبان دے چکی ہوں- ایک دفعہ نہیں دس دفعہ ان سے کہہ چکی ہوں کہ ثمینہ کے ایم-اے کرتے ہی اسے بہو بنا کرلے جاؤں گی- اب زبان سے پھر جانا کہاں کی شرافت ہے- لیکن جب ہشام بھائی نے یہ دلیل دی کہ آپ نے اس سلسلے میں کبھی مجھ سے واضح بات ہی نہیں کی، تو قصور کس کا ہوا؟ دوسرے لوگوں نے بھی ہشام بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی- ان دوسرے لوگوں میں پھوپھی جان پیش پیش تھیں- پھر ہشام بھائی کی امی کو بھی خاموش ہوتے ہی بن پڑی-

طوفان آکر گزر گیا، ہواؤں کے رخ بدل گئے، تو زندگی میں بھی ایک سکون سا آگیا- بس! اب ہشام بھائی کو انتظار تھا تو اس بات کا کہ ان کی چچی اماں، یعنی تابندہ کی پھوپھی جان اپنے بھائی سے ان کی مرضی معلوم کرلیں- پھوپھی جان نے خط وکتابت کے ذریعے اس قسم کے معاملات کو طے کرنا مناسب نہ سمجھا- پھر...... اس معاملے میں ایسی جلدی بھی ان کے خیال میں مناسب نہیں تھی- تابندہ کا بی-اے کا آخری سال تھا- پھوپھی جان کی مرضی یہ تھی کہ وہ ایم-اے نہ سہی، کم از کم بی-اے تو کرلے-

ہشام بھائی گھر میں ہونے والے سب ہنگاموں کو سرد کرنے کے بعد بالکل مطمئن تھے- انہیں تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تابندہ کے اور ان کے درمیان اب کوئی فاصلہ ہی نہیں ہے اور یہ حقیقت بھی تھی ان کے دل و دماغ ایک دوسرے سے اس قدر قریب تھے کہ ہر دوری اور ہر فاصلے کا احساس مٹ چکا تھا- تابندہ نے بی-اے فائنل کا امتحان پاس کیا تو اسے ابا میاں کی آمد کی خوش خبری ملی-

ان کا مختصر سا خط اس نے کئی بار پڑھا اور دل خوش کن خیالات کے ساتھ ساتھ جانے کیوں مایوسی کی ایک ہلکی سی لہر کے احساس نے اسے کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا- باوجود کوشش کے وہ سمجھ نہ سکی کہ خوشی کے ان لمحات میں دل پر یہ بوجھ سا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ اب...... جبکہ منزل قریب آ چکی ہے تو کسی ٹھوکر کے خیال سے دل کیوں کانپ اٹھا ہے؟ اب جب کہ کشتی ساحل پر پہنچ چکی ہے تو مجھے کسی انجانے سے طوفان کا خیال کیوں خوفزدہ کر رہا ہے-

اس کی طویل سوچیں اس کی ذہنی پریشانی کو کم نہ کر سکیں اور نہ اسے اس کے کسی سوال کا جواب دے سکیں- انہی لامتناہی سوچوں میں اس کے شب و روز بڑی خاموشی سے گزرتے رہے- اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا جب اس نے بھیگی آنکھوں سے ابا میاں کا استقبال کیا ابا میاں کی آنکھوں میں اس کے لئے بے پناہ محبت تھی- تابندہ کو احساس ہوا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مطمئن اور پرسکون تھے- پھوپھی جان ان پر واری صدقے ہوئی جا رہی تھیں اور بار بار اصرار کر رہی تھیں کہ کم از کم ایک مہینہ ٹھہرو- لیکن ان کا جواب سن کر سخت مایوس سی ہوئیں- تابندہ بھی یہ سن کر ایک دم اداس ہو گئی کہ ابا میاں صرف ایک ہفتے کے لئے آئے ہیں اور اسے بھی ساتھ لے کر جائیں گے- دو سال کا عرصہ ایسا تو نہیں تھا کہ اسے اس گھر سے اور گھر والوں سے کوئی انسیت نہ ہوتی، پھر اسے گھر کے لوگوں نے پیار و محبت سے بھی اس قدر نوازا تھا کہ ان سے دوری کا احساس ہی اس کے لئے تکلیف دہ تھا-

ابا میاں کے آنے کے دوسرے ہی دن سے گھر کے بزرگوں میں کھسر پھسر شروع ہو گئی- معلوم نہیں ایسی کون سی باتیں اور ایسے کون سے مشورے تھے جو کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آتے تھے- ہاں! ایک بات تابندہ نے ضرور محسوس کی کہ ابا میاں ہر وقت پریشان اور فکرمند رہتے تھے- پھر...... ایک شام...... جب تابندہ اپنے کمرے میں بیٹھی شائستہ آپا کا سوئیٹر بن رہی تھی تو ابا میاں اندر چلے آئے- وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی-

"بیٹھو، بیٹھو-"

ابا میاں نے کہا اور اس کے کمرے کا جائزہ لینے لگے- پھر اس کی کتابوں کے شیلف کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے- تابندہ کو احساس ہوا کہ ابا میاں اس وقت ضرورت سے زیادہ ہی پریشان ہیں اور یہ کہ وہ اس کی طرف دیکھنے سے بھی کترا رہے ہیں- تابندہ چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی- کئی لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے، تو ابا میاں نے کھنکھار کر گلا صاف کی اور بغیر کسی تمہید کے بولے-

"بیٹے، وہ بات یہ ہے کہ میں نے تمہارا رشتہ طے کر دیا ہے محمود رشتے میں تمہاری امی یعنی رخسانہ کا بھانجا ہے' چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہے، شریف ہے اور خوبصورت بھی، لیکن......"

ابا میاں ایک لمحے کے لئے رکے-:

"لیکن مجھے یہاں آ کر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ہشام......"

ابا میاں نے بات ادھوری چھوڑ کر دریچے سے باہر دیکھا...... "دراصل میرا ذہن اس بات کی طرف گیا ہی نہیں تھا کہ جہاں تم رہ رہی ہو وہاں بہت سے اچھے اچھے لڑکے موجود ہیں، ان میں سے بھی کسی کی نظر انتخاب تم پر پڑ سکتی ہے، ورنہ میں اتنی جلد بازی سے کام نہ لیتا-"

ابا میاں نے بک شیلف سے دروازے تک کا ایک چکر لگایا اور غیر ارادی طور پر اپنے بالوں پر دو تین مرتبہ ہاتھ پھیرا-

"دراصل رخسانہ کی بہت خواہش ہے کہ...... اس نے تو بہت جھجکتے ہوئے یہ بات کہی تھی، لیکن میں نے پورے اعتماد کے ساتھ اسے یقین دلا دیا-"

ابا میاں نے کہا اور سرسری سی نگاہ تابندہ پر ڈالی-

"اب فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے اور تمہیں اختیار ہے کہ جس کے حق میں چاہو فیصلہ کر لو لیکن......"

ابا میاں ایک لمحے کے لئے رکے-

"لیکن...... میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ بعض رشتے بہت نازک ہوتے ہیں- صرف ایک دفعہ کی لغزش سے زندگی بھر کے لئے دل میں گرہ پڑ جاتی ہے-"

"میرا خیال ہے مجھے مزید کچھ کہنے کی ضرورت نہیں...... تم خود سمجھدار ہو-" ابا میاں نے قدرے مدھم آواز سے کہا اور بڑی تیزی سے باہر چلے گئے-

ابا میاں چلے گئے اور تابندہ دروازے کے ہلتے ہوئے پردے پر نظریں جمائے ساکت بیٹھی رہ گئی- اسے اپنے دماغ پر ہتھوڑے سے برستے معلوم ہوئے- کچھ سوچنا چاہا تو سوچ نہ سکی- رونا چاہا تو رو نہ سکی- اسے اپنے چاروں طرف ایک عجیب سا شور سنائی دے رہا تھا- تیز آندھیوں کا شور...... چنگھاڑتے ہوئے مہیب طوفانوں کا شور...... اور اپنی ناتمام آرزوؤں کے ماتم کا شور......! اڑتے ہوئے بگولوں کی دھند میں سب کچھ دھندلا گیا تھا- طوفان کی ہیبت ناک موجوں کے شور میں اسے کوئی آواز نہیں سنائی دیتی تھی-

اسے نہیں معلوم اس نے وہ ساری رات کس طرح گزاری؟ دوسرے روز صبح ناشتہ کرنے کے بعد وہ پڑھی ہوئی کتابوں اور رسالوں کا ڈھیر سامنے رکھے دوسروں کو فریب دینے کی کوشش کرتی رہی- کبھی ایک رسالہ کھول کر اس پر نظریں جما کر بیٹھ جاتی کبھی دوسرا- نظریں رسالے کے صفحات پر تھیں اور دماغ جانے کہاں تھا ابا میاں نے اسے فیصلہ کرنے کا پورا پورا اختیار دے دیا تھا، پھر بھی وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی- دل، دماغ اور ضمیر کے درمیان اتنی شدید جنگ جاری تھی کہ اسے اپنا

وجود پس کر ریزہ ریزہ ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اسے پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی میں بعض اوقات اتنے کٹھن لمحات بھی آتے ہیں جب بے اختیار مرجانے کو دل چاہتا ہے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی کہ ہشام بھائی سے سامنا ہو گیا۔ انہوں نے قریب رک کر بہت آہستہ سے اسے پکارا۔ ''تابندہ۔''

''جی۔''

تابندہ نے بڑی مشکل سے ان سے نظریں ملائیں۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟''

''نہیں، میرے سر میں بڑا شدید درد ہے۔ آپ مجھے سر درد کی کوئی گولی دے دیجئے۔''

تابندہ نے کہا۔

''اچھا، تم اپنے کمرے میں چلو، میں ابھی لاتا ہوں۔''

ہشام بھائی نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

سر درد کی گولی کھا کر وہ چادر تان کر لیٹ گئی۔ سب کو یہ امپریشن دینے کی کوشش کرتی رہی کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے۔ لیکن دماغ میں اتنے خیالات تھے اور اتنی سوچیں تھیں کہ اس کے لئے سونا ناممکن سی بات تھی۔ ابامیاں کے جملے رہ رہ کر اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

اس نے سوچا...... ابامیاں ٹھیک کہتے ہیں، بعض رشتے بہت نازک ہوتے ہیں اور...... اور اعتماد کی دیوار اگر ایک مرتبہ گر جائے، تو پھر وہ کبھی نہیں تعمیر کی جا سکتی۔

لیکن...... جب ابامیاں نے اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے کا اختیار مجھے دے دیا ہے تو پھر میں ان سب باتوں کی پروا کیوں کروں؟

اس کے دل نے اسے بغاوت پر اکسایا۔

لیکن وہ جانتی کہ وہ ایسا کبھی نہیں کر سکے گی۔ بوا کی نصیحتوں کو اگر اس نے بھلا دیا ہوتا تو شاید وہ ایسا کر گزرتی مگر بوا کی تربیت کے نقوش اتنے گہرے تھے کہ انہیں آسانی سے نہیں مٹایا جا سکتا تھا۔ ان کی تربیت نے اس کی فطرت میں جو سادگی اور اطاعت شعاری پیدا کر دی تھی، وہ اسے کوئی غلط قدم اٹھانے سے پہلے ہی خبردار کر دیا کرتی تھی۔

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جب سے ابامیاں نے رخسانہ بیگم سے شادی کی تھی، بوا اٹھتے بیٹھتے اولاد اور والدین کے حقوق و فرائض کے موضوع پر لمبے لمبے لیکچر دیا کرتی تھیں۔

''دیکھو بٹیا، ماں باپ کے دل کو کبھی تکلیف نہیں پہنچانی چاہیے۔''

جانے کدھر سے بوا کی آواز اس کے کانوں میں آئی اور سفید جھک کپڑوں میں لپٹا ہوا ان کا نکھرا

ستھرا مقدس سا وجود تابندہ کی نگاہوں کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

لیکن...... اس نے سوچا، جب ابامیاں نے مجھے اپنی مرضی سے فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا ہے تو پھر ان کے دل کو دکھ پہنچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟

اس نے دوبارہ سوچا۔

مسلسل سوچتے سوچتے جب اس کا دماغ بالکل تھک گیا تو وہ چادر ایک طرف پھینک کر اٹھ بیٹھی اور شائستہ آپا کا ادھورا سویٹر اٹھا کر بننے لگی۔

شام کی چائے کے بعد جب وہ باہر لان میں بیٹھی تو تھوڑی دیر بعد ابامیاں بھی ادھر ہی آ گئے۔ تابندہ کا دل ایک لمحے کے لئے بڑی زور سے دھڑکا، مگر دوسرے ہی لمحے وہ پرسکون ہو گئی ابامیاں اس کے سامنے بیٹھے تو اس نے ایک سرسری سی نگاہ ان پر ڈالی اس نے محسوس کیا کہ ابامیاں کی نگاہوں میں استفہامیہ سی کیفیت ہے۔ اس نے سوچا کہیں وہ اس سے اس کے فیصلے کے متعلق نہ پوچھ بیٹھیں۔ اگر ابامیاں کچھ پوچھ بیٹھے تو شاید اس کے لئے جواب دینا بھی مشکل ہو جاتا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی انہیں سب کچھ صاف صاف بتا دے گی۔ چند سیکنڈ کی کوشش کے بعد اس نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور دھیمی آواز میں بولی۔

''ابامیاں، آپ میرے بارے میں جو کچھ بھی فیصلہ کر چکے ہیں میں اس پر مطمئن ہوں۔''

ابامیاں نے ایک لمبی سی ''ہوں'' کر کے بڑے مطمئن انداز سے سر ہلا دیا اور تابندہ نے آنکھوں میں امنڈ آنے والے آنسوؤں کو پلکیں جھپکا کر پی لیا۔ وہ بمشکل پانچ منٹ کے لئے وہاں رکی اور پھر اپنی نٹنگ سنبھال کر کمرے میں چلی آئی۔

اور پھر...... وہ اس وقت تک کمرے سے باہر نہیں نکلی، جب تک ہشام بھائی کلینک سے واپس نہیں آ گئے اس نے کمرے کے دریچے میں جھکے جھکے دیکھا، وہ پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے بڑے تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ ان کا سر قدرے جھکا ہوا تھا۔ تابندہ نے دریچے کی چوکھٹ کو بڑی مضبوطی سے تھام لیا۔ بے شمار لمحے سوچوں کی خاموش سونی رہگزر پہ چلتے چلے گزر گئے۔ اس کے دل سے بار بار یہ آواز آ رہی تھی...... تابندہ، تم نے تصویر کے صرف ایک رخ کو دیکھا ہے...... تم نے ابامیاں کے دکھ کا احساس تو کر لیا لیکن ہشام بھائی کے درد کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں۔ تم سمجھتی ہو ہشام بھائی کو تمہارے اس فیصلے سے بہت خوشی ہو گی؟ یا ان کے دل پر اس بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہو گا؟ تم یہ سمجھ بیٹھی ہو کہ ہشام بھائی کے سینے میں دل نہیں پتھر کا ٹکڑا ہے؟

لیکن پھر...... میں کیا کرتی؟ بیک وقت دو راہوں پر تو کوئی بھی نہیں چل سکتا۔ کسی ایک ہی راہ کا

انتخاب کر سکتی تھی- اب میں نے جس راہ پر چلنے کا عزم کیا ہے اس سے تو بہت سے دلوں کو خوشی ہو گی...... ثمینہ، ابا میاں، رخسانہ بیگم ثمینہ کے سب گھر والے اور ہشام بھائی کی امی...... دوسری راہ پر چل کر تو میں صرف اپنے اور ہشام بھائی کے دل کو خوش کر سکتی تھی...... اس نے سوچا اور اس کے قدم ہشام بھائی کے کمرے کی طرف اٹھ گئے-

دروازے کا پردہ ایک طرف سرکا ہوا تھا- سامنے ہی ہشام بھائی ایزی چیئر پر نیم دراز تھے، ان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر ایسی کیفیت تھی جو اس سے پہلے تابندہ نے ان کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھی تھی- تابندہ دروازے کے قریب رک کر ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اندر جائے یا واپس لوٹ جائے کہ ہشام بھائی نے آنکھیں کھول دیں- تابندہ کو وہاں کھڑا دیکھ کر ان کی آنکھوں میں حیرت سی نمودار ہوئی، پھر ہونٹوں پر بڑی مدھم سی مسکراہٹ چراغ کی لو کی مانند تھرتھرائی وہ اٹھ کر دروازے تک آئے اور تابندہ کے سوگوار چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے-

''کب سے کھڑی ہو؟ اندر کیوں نہیں آ گئیں؟''

ان کی آواز میں بہت نرمی اور چاہت تھی-

تابندہ نے ان کی بات کا جواب دینا چاہا، لیکن جانے کیوں آواز ہی نہ نکل سکی-

''اندر آ جاؤ-''

ہشام بھائی نے کہا-

تابندہ اندر آئی تو ہشام بھائی نے پردہ برابر کر دیا-

تابندہ اندر آ کر بھی کھڑی رہی تو ہشام بھائی بے ساختہ مسکرا دیئے-

''بیٹھ جانے کے لئے درخواست کروں یا حکم دوں؟''

ہشام بھائی اپنے بستر پر بیٹھتے ہوئے بولے-

''جی!''

تابندہ جانے کن سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی-

''تم مہمان ہو؟''

ہشام بھائی نے پوچھا-

''جی نہیں، نہیں تو-''

تابندہ گڑبڑا گئی-

''پھر یہ انداز؟''

ہشام بھائی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی-

تابندہ جھینپ کر رہ گئی اور آہستہ سے کرسی سرکا کر بیٹھ گئی-

''ہوں...... اب بات کرو-''

ہشام بھائی نے کہا-

تابندہ نے محسوس کیا کہ ہشام بھائی کے لہجے میں وہ شگفتگی نہیں جو ان کی طبیعت کی خصوصیت ہے-

''یہ تم نے صبح سے اپنی حالت کیا بنا رکھی ہے؟''

ہشام بھائی نے کہا-

''میری طبیعت ٹھیک نہیں-''

تابندہ نے کہا-

''ہاں، واقعی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں، اور کیوں ٹھیک نہیں؟ اس کا سبب بھی مجھے معلوم ہے-''

ہشام بھائی نے معنی خیز انداز سے اس کی طرف دیکھا-

''جی!؟''

تابندہ نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا-

''ویسے تابندہ بیگم، یہ بڑے افسوس کی بات ہے-''

ہشام بھائی نے کہا-

تابندہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہوئی-

''مجھے کبھی تمہاری کسی بات سے تکلیف نہیں پہنچی لیکن اب تم نے مجھے اتنا دکھ پہنچایا ہے کہ......''

ہشام بھائی نے بات ادھوری چھوڑ دی-

تابندہ پہلے ہی پریشان تھی- ہشام بھائی کی ان الجھی الجھی باتوں پر اس کا دکھ سے لبریز دل صبر وضبط کے بندھن کا دامن چھوڑ بیٹھا-

''ہشام بھائی، جو کچھ کہنا ہو جلدی کہئے، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں-'' تابندہ نے بھیگی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا- اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر ایک دم رو پڑی-

ہشام بھائی نے اس کی طرف دیکھا...... ایسی نگاہوں سے...... جن میں سوائے درد و کرب کے اور کچھ نہیں تھا-

''سنو تابندہ بیگم! مجھے تم سے یہ گلہ ہے کہ تم نے مجھے کل ہی حقیقت سے باخبر کیوں نہ کر دیا؟ کل سے اب تک تم تنہا ہی سوچ سوچ کر جلتی اور کڑھتی رہی ہو، یہ غم تو ہم دونوں کے لئے مشترک ہے- کیا اس کے بارے میں سوچنے کے ہم دونوں یکساں طور پر حق دار نہیں؟''

ہشام بھائی دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکا کر قدرے آگے جھکے ہوئے تھے-

تابندہ نے دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا کر شبنمی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا- اس کی آنکھوں میں دکھ بھی تھا اور حیرت بھی-

''مجھے تو آج شام کو یہ بات معلوم ہوئی، تم سوچ سکتی ہو کہ میں نے اپنے مریضوں کی خاطر کتنی مشکلوں سے اپنے آپ کو سنبھالا ہوگا؟''

ہشام بھائی نے کہا-

تابندہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا- وہ تو یہ سمجھے ہوئے تھی کہ ہشام بھائی کو سرے سے اس بات کی خبر ہی نہیں ہوگی-

''لیکن میں...... صرف ایک بات کی وجہ سے قدرے مطمئن بھی ہوں کہ تمہارے ابا میاں نے رشتہ طے کر دینے کے باوجود اب بھی فیصلہ کرنے کا اختیار تمہیں دیا ہے-''

ہشام بھائی نے کہا-

تابندہ سر جھکائے بیٹھی رہی اس کی پلکوں کے سائے بھیگے ہوئے رخساروں پر کانپتے رہے- خاموش لمحوں کا ایک کارواں گزر گیا، لیکن تابندہ کے ہونٹوں کو جنبش نہ ہوئی اور...... ہشام بھائی کی کیفیت یہ تھی کہ آنکھوں میں پیار کا ایک جہان بسائے تابندہ کی طرف دیکھ رہے تھے-

''کیا تم کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں؟''

ہشام بھائی نے پوچھا-

تابندہ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے...... اس کا دل فرطِ غم کی تاب نہ لا کر پھٹ جائے گا- اس نے سوچا- وہ ہشام بھائی کو کیسے بتائے کہ وہ نہ صرف فیصلہ کر چکی ہے بلکہ اپنے فیصلے سے ابا میاں کو آگاہ بھی کر چکی ہے- ہشام بھائی کی سادگی اور اپنی بے بسی پر اس کی آنکھوں میں آنسو کچھ اس تیزی سے امنڈ آئے کہ وہ انہیں بہہ جانے سے نہ روک سکی اس نے ہونٹوں کو دانتوں تلے دبا کر بڑی مشکل سے اپنی سسکیوں کو روکا-

ہشام بھائی اس کا جواب سننے کے لئے منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے- لیکن تابندہ جواب دیتی تو کس طرح؟ ہشام بھائی نے چند سیکنڈ کے توقف کے بعد دوبارہ اپنا سوال دہرایا- تابندہ نے سوچا، وہ کیسے اپنے آپ میں اتنی ہمت پیدا کرے؟ لیکن ان کے سوال کا جواب بہرحال دینا ہی تھا- دو تین منٹ کی خاموشی کے بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو اس نے آہستہ سے کہا-

''ہشام بھائی- میں نے فیصلہ کر لیا ہے-''

''اچھا، کیا فیصلہ کیا؟''

ہشام بھائی نے امید و بیم کی سی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا-

''مجھے...... مجھے افسوس ہے کہ میں نے فیصلہ آپ کے حق میں نہیں کیا-''

تابندہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا- اتنی جرات ہی کہاں باقی رہ گئی تھی اس میں؟ اگر وہ ہشام بھائی کے چہرے کی طرف دیکھتی تو اسے اندازہ ہوتا کہ وہاں تو ایک طوفان آ کر گزر گیا تھا- پھر...... بہت سارے لمحے منجمد سناٹوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے گزر گئے- ہشام بھائی سر جھکائے ہوئے جانے کن سوچوں میں گم تھے اور تابندہ کے آنسو وقفے وقفے سے اس کے رخساروں پر سے پھسلتے ہوئے اس کے آنچل میں جذب ہو رہے تھے- باہر...... نومبر کی خنک، خوشگوار رات دھیرے دھیرے، سہمے سہمے انداز سے قدم رکھتی ہر شے کو اپنی پھیلی ہوئی بانہوں میں سمیٹ رہی تھی- چاند بادام کے خوبصورت گھنے درخت سے قدرے بلند ہو گیا تھا- اور چنبیلی کی خوشبو میں بسی ہوئی ہوائیں مدھم انداز سے چلتے چلتے ایک دم ساکت ہو گئی تھیں-

ہشام بھائی کی طویل سانس نے کمرے کی خاموشی کو دھیرے سے جھنجوڑا- انہوں نے غیر ارادی طور پر اپنے بالوں پر دو تین مرتبہ ہاتھ پھیرا اور تابندہ کی طرف دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے کمرے میں مختصر سی خالی جگہ میں دو تین چکر لگائے، دو ایک سیکنڈ کے لئے تابندہ کے قریب ٹھہرے اور پھر دریچے میں جا کر کھڑے ہو گئے- دریچے کے باہر لگی ہوئی رات کی رانی کی نرم و نازک پتی کو توڑ کر بڑی بے دردی سے انگلیوں سے مسل دیا- ان کا دماغ اس وقت بالکل کام نہیں کر رہا تھا- اور دل کچھ اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ وہ اس کے دھڑکنے کی صدا صاف سن رہے تھے-

تابندہ نے گردن موڑ کر ہشام بھائی کی طرف دیکھا اور ان کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی- ہشام بھائی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا-

''ہشام بھائی!''

تابندہ نے بڑی ہمت کر کے انہیں پکارا-

''ہوں-''

ہشام بھائی نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا-

''مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں، لیکن......''

''تم سی احمق لڑکی سے ناراض ہو کر مجھے کچھ نہیں مل جائے گا-''

ہشام بھائی نے کہا- ان کی آنکھوں میں اب بھی اس کے لئے بے پناہ پیار تھا-

''پھر آپ اتنے خاموش کیوں ہیں؟''

تابندہ نے سہمے ہوئے انداز سے ان کی طرف دیکھا-

''تابندہ بیگم! تمہارے فیصلے نے مجھے کچھ کہنے کے قابل ہی کب چھوڑا ہے؟''

ہشام بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا یہ فیصلہ بدلا نہیں جا سکتا؟''

ہشام بھائی نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''میں نے...... میں نے تو ابا میاں کو بھی......''

''خوب! یعنی اپنی حماقت کا ثبوت دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔''

ہشام بھائی اس کی بات کاٹ کر بولے۔

''جی! میں نے تو کوئی حماقت نہیں کی۔''

تابندہ نے انتہائی معصومیت سے کہا۔

ہشام بھائی کو اس کی معصومیت پر بے ساختہ پیار آ گیا۔

''تم نے مجھ سے مشورہ لئے بغیر اپنے اور میرے بارے میں اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔''

تابندہ کا جھکا ہوا سر اور زیادہ جھک گیا۔

''جب کہ تمہیں فیصلہ کرنے کی آزادی بھی تھی پھر بھی تم نے......''

''آپ کو نہیں معلوم ہشام بھائی......''

تابندہ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے کیا نہیں معلوم؟''

ہشام بھائی نے پوچھا۔

''ابا میاں نے کہا تھا کہ بعض رشتے بہت نازک ہوتے ہیں......''

تابندہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''یعنی؟ کون سا رشتہ؟''

''شاید...... ابا میاں کی مراد میرے اور رخسانہ بیگم کے رشتے سے تھی۔'' تابندہ نے کہا۔

''رخسانہ بیگم!''

ہشام بھائی زیر لب مسکرائے۔

''جی!''

تابندہ ان کا مطلب نہ سمجھتے ہوئے بولی۔

''بے وقوف، وہ تمہاری امی لگتی ہیں۔''

ہشام بھائی اپنی دلی کیفیت چند لمحوں کے لئے بھول گئے۔

''جی ہاں، یہ تو مجھے معلوم ہے، لیکن...... میں نے تو آج تک انہیں دیکھا بھی نہیں۔''

''دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

ہشام بھائی نے کہا۔

''بس! صرف اس 'نازک رشتے' کا خیال کر کے تم نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟''

ہشام بھائی نے کہا۔

''نہیں۔ ایک وجہ اور بھی ہے۔''

''وہ بھی بتا دو۔''

''میں ابا میاں کے دل کو کوئی تکلیف پہنچانا نہیں چاہتی تھی۔''

''کیوں؟''

تابندہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

ہشام بھائی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کیونکہ بوا کہتی تھیں ماں باپ کا دل کبھی نہیں دکھانا چاہئے۔''

تابندہ نے کہا۔

ہشام بھائی اس کی یہ بات سن کر مسکرائے اور بولے۔

''میری بدقسمتی یہ ہے کہ بوا نے مجھے اور میں نے بوا کو نہیں دیکھا، ورنہ یقیناً بوا یہ نصیحت بھی کر جاتیں کہ تمہیں میرا دل بھی نہیں دکھانا چاہئے۔''

''آپ کا دل؟''

تابندہ نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں، میرا دل! تمہارا خیال ہے کہ میرا دل تمہارے فیصلے پر بالکل نہیں دکھا؟''

ہشام بھائی نے کہا۔

''ہشام بھائی۔ میں کیا کروں؟ میں کیا کروں؟ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ایک دن یوں بھی ہو جائے گا۔''

تابندہ نے بڑی بے بسی سے ان کی طرف دیکھا۔

''ہوں، سوچا تو میں نے بھی نہیں تھا۔ لیکن بہرحال، ہونے والی بات اب ہو چکی ہے اور ہم

دونوں کو ہی زندگی کسی نہ کسی طرح گزارنی ہے۔" ہشام بھائی ایک لمحے کے لئے رکے۔

"مجھے اعتراف ہے کہ میں...... آگے...... بہت آگے تک بڑھ آیا ہوں، لیکن مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں اسی قدر پیچھے ہٹ جاؤں۔ دکھ بہرحال مجھے ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ دل کا درد ایک خلش بن کر زندگی بھر......"

ہشام بھائی نے بات ادھوری چھوڑ کر تابندہ کے اداس چہرے کی طرف دیکھا۔

ہشام بھائی خاموش ہوئے تو تابندہ نے ان کی طرف دیکھا، کچھ کہنے کے لئے لب کھولے، مگر جانے کیا سوچ کر خاموش رہی۔

"بہرکیف، تم اپنے دل کو مضبوط رکھو، میری پروا نہ کرو، میں تمہاری خوشی میں خوش ہوں۔"

ہشام بھائی نے کہنے کو یہ بات مسکرا کر کہی، لیکن ان کا دل...... اگر کوئی دیکھ سکتا کہ وہاں تو چیخوں اور آہ و فغاں کا ایک ہجوم تھا۔

"ہشام بھائی!"

تابندہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"ہاں!" ہشام بھائی اپنی سوچوں سے چونک کر بولے۔

"شاید...... شاید آپ میری منزل نہیں تھے، دوسروں کی منزل کو پالینے کی تمنا ایک جرم ہے اور......"

تابندہ کی آنکھیں ایک بار پھر جھلملا اٹھیں اور گلے میں کوئی چیز پھنسی ہوئی معلوم ہوئی اپنی کیفیت پر قابو پا کر وہ ایک سیکنڈ بعد بولی۔

"اور زندگی میں جرم تمنا کی اس سے بڑی سزا کسی کو کیا مل سکتی ہے کہ وہ زندہ رہے اور زندگی سے پیار نہ ہو۔"

تابندہ نے بڑی مشکل سے اپنا جملہ پورا کیا اور پلکوں پہ جھلملاتے ہوئے چراغوں کو آنچل میں چھپالیا۔

"تابندہ؟"

ہشام بھائی نے والہانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا، اور شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری منزل نہ سہی لیکن نشان راہ منزل تو ہوں، میرے لئے یہی بہت بڑی بات ہے۔"

تابندہ نے انتہائی دکھ سے ان کی طرف دیکھا اور اس کے آنسو ایک بار پھر بڑی تیزی سے بہہ نکلے۔

❖ ○ ◆ ○ ❖

سناٹے گونجتے ہیں

ستمبر 1979ء

پورے ایک ہفتے بعد آج صبح ہی افشاں آئی تھی اور شام ڈھلنے سے پہلے واپس چلی گئی۔ عثمان احمد کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا آ کر گزر گیا ہو۔

اس کے آتے ہی انھیں یوں لگتا تھا جیسے ایک دم ہی بہت سارے ہنگامے جاگ اٹھے ہوں۔ اس کی موجودگی سے انھیں گھر میں کیسی بھرپور رونق کا احساس ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ ان سے بہت کم بات کرتی تھی۔ اس کی زیادہ تر کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ انہیں مخاطب نہ کرے۔ وہ خود سوچ سوچ کر اس سے کوئی نہ کوئی بات کرتے مگر وہ ان کی ہر بات کا بہت مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتی تھی۔

ان کا کتنا دل چاہتا تھا کہ افشاں ان سے بہت ساری باتیں کرے، کچھ اپنی کہے، کچھ ان کی سنے۔

مگر اس کے پاس تو جیسے کہنے سننے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں یا پھر وہ کچھ کہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

وہ آ کر بہت رسمی سے انداز میں انہیں سلام کرتی، ان کی خیریت پوچھتی اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔

اس کا یہ اجنبی اجنبی سا انداز ان کے دل کو بہت تکلیف دیتا تھا۔ اپنے کمرے میں گھسی ہوئی

معلوم نہیں وہ کیا کیا کرتی تھی دوپہر کے کھانے کے وقت ان کی ملاقات ہوتی - وہ بڑی محبت سے ایک ایک ڈش اٹھا کر اس کے سامنے رکھتے، اصرار کر کے اسے کھلاتے - اکثر اوقات خود سالن نکال کر اس کی پلیٹ میں ڈالتے -

''آپ رہنے دیجیے میں خود لے لوں گی -''

''بس' اتنا کافی ہے -''

''مجھے زیادہ بھوک نہیں ہے -''

''آپ خود بھی تو کھائیے -''

یہ اور اسی قسم کے چند دوسرے جملے وہ سیدھے سپاٹ سے لہجے میں کہتی اور سر جھکائے کھانے میں مصروف رہتی - اس کے کسی بھی انداز سے خوشی ظاہر نہیں ہوتی تھی -

اور وہ خود...... کتنی محبت بھری نگاہوں سے اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتے رہتے تھے -

پورا ہفتہ وہ انگلیوں پر دن گن گن کر گزارتے تھے اور جس روز اسے آنا ہوتا تھا وہ خانساماں سے کہہ کر اچھی اچھی ڈشز تیار کرواتے تھے، زیادہ تر اس کی من پسند چیزیں پکواتے تھے -

ان کا کتنا دل چاہتا تھا کہ ویک اینڈ پر وہ فاخرہ آپا - انجم بھائی، زلفی بھائی یا گلنار بیگم کے گھر جانے کے بجائے سیدھی وہاں آئے - اس جگہ جو اس کی اپنی تھی - اس گھر میں رہے جو اس کا اپنا تھا مگر وہ ایسا کبھی نہیں کرتی تھی - ہمیشہ اگلے دن صبح...... نو دس بجے کے قریب آتی اور شام ڈھلنے سے پہلے ہی واپس چلی جاتی -

انھیں بہت افسوس ہوتا تھا، ان کا دل دکھ کر رہ جاتا تھا - آخر وہ ایسا کیوں کرتی تھی؟ اپنا گھر چھوڑ کر دوسروں کے گھر جا کر رہنے میں اسے کیا ملتا تھا؟

پہلے بھی تو وہ اسی گھر میں رہتی تھی - پھر اب ایسی کون سی بات ہو گئی تھی؟

ان چند مہینوں میں ایسی کون سی تبدیلی آ گئی تھی؟

اس معاملے پر وہ جتنا بھی سوچتے، دل کی اداسی اسی قدر بڑھتی جاتی پھر وہ یہ سوچ کر شکر ادا کرتے کہ چلو یہ بھی غنیمت ہے - وہ چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی، آ تو جاتی ہے اس گھر میں، اگر وہ بالکل ہی نہ آتی تو وہ کیا کر لیتے -

وہ چند گھنٹے ان کے لیے بڑی خوشی اور بہت مسرت کے ہوتے تھے - وہ ان کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھتی تھی - ان سے زیادہ باتیں بھی نہیں کرتی تھی -

لیکن پھر بھی...... اس کی موجودگی کا احساس انہیں طمانیت بخشتا تھا -

وہ اپنے کمرے میں ہوتی تھی لیکن اس کی چوڑیوں کی مترنم جھنکار ان کے کانوں میں گونجتی رہتی

تھی -

ایک طرف احساس خوشی اور احساس مسرت -

اور دوسری طرف...... یہ خیال کہ وہ پھر واپس چلی جائے گی پورے ایک ہفتے تک وہ اس کی صورت دیکھنے کو ترستے رہیں گے پھر وہ خود ہوں گے اور ان کی تنہائیاں -

یہ گھر ہو گا اور اس میں گونجتے ہوئے سناٹے -

خوشی کی یہ گھڑیاں کتنی تھوڑی ہوتی تھیں -

مسرت کے یہ لمحے کتنے مختصر ہوتے تھے -

مگر وہ کتنے بے بس تھے اس معاملے میں -

دل چاہتے ہوئے بھی وہ اسے اس گھر میں رہنے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے -

اس کی خوشی کے سامنے ان کی خواہش کی اہمیت ہی بھلا کتنی تھی؟

ہاسٹل میں رہنا اس کی خوشی تھی اور اس کی خوشی تو انہیں دنیا میں ہر شے سے بڑھ کر عزیز تھی -

وہ اس کی خوشی کو اپنی خواہش اور اپنی آرزو پر قربان تو نہیں کر سکتے تھے -

مگر کبھی کبھی وہ یہ ضرور سوچتے تھے کہ افشاں کو ان کی تنہائی کا ذرا بھی خیال نہیں آتا؟

اسے اس گھر سے جاتے ہوئے یہ احساس بالکل نہیں ہوتا کہ وہ اپنے پیچھے کیسے سناٹے چھوڑ کر جا رہی ہے؟

آج بھی اس وقت سے جب سے اسے ہاسٹل چھوڑ کر آئے تھے وہ یہی سوچے جا رہے تھے -

گاڑی جب گرلز ہاسٹل کے سامنے رکی تو اس نے اترنے سے پہلے کہا -

''اگلے ہفتے میں گھر نہیں آ سکوں گی -''

''کیوں؟'' وہ چونک پڑے -

فاروق بھائی نے پکنک کا پروگرام بنایا ہے -''

''اچھا! کس جگہ جانے کا پروگرام ہے؟''

''سینڈز پٹ''

''ہوں - اور کون کون جائے گا؟''

''سارے کزنز ہوں گے -''

انھوں نے امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا -

''تم جمعرات کو تو آ سکتی ہو، جمعہ کی صبح کو میں تمہیں فاخرہ آپا کے گھر چھوڑ آؤں گا -''

''نہیں، رات کو وہیں رہنے کا پروگرام ہے -''

''گویا جمعرات کی شام تم لوگ پکنک کے لیے چلے جاؤ گے؟''
انھوں نے دبے لفظوں میں کہا۔
''میرا خیال ہے رات کو ایسی جگہوں پر قیام کرنا مناسب نہیں ہے۔''
اس نے دھیرے سے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔
''آپ خوف زدہ ہیں؟''
''ہاں، ایسی جگہوں پر بعض اوقات بڑی خوفناک وارداتیں ہو جاتی ہیں۔''
''مگر ہم لوگ تو دس پندرہ افراد ہوں گے۔ دو تین بزرگ بھی یقیناً جائیں گے۔''
''اچھا!'' ان کے دل میں اداسی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔
گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے کہا۔
''آپ بھی ہم لوگوں کے ساتھ چلے چلتے۔''
کس قدر رسمی سا انداز تھا اس کا۔
نہ کوئی ضد نہ کوئی التجا۔
اور نہ کوئی اصرار۔
بہر حال اتنا بھی غنیمت تھا کہ اس نے ان سے کہا تو تھا چلنے کے لیے۔
اصرار نہیں کیا تھا تو کیا ہوا؟
وہ گاڑی کا دروازہ پکڑے ان کا جواب سننے کی منتظر تھی اور وہ اسٹیئرنگ پہ ہاتھ رکھے اپنی ہی سوچوں میں گم تھے۔
اس نے پھر کہا۔
''اگر آپ چلنا چاہیں تو میں فاروق بھائی وغیرہ سے کہہ دوں گی۔''
''اچھا میں سوچوں گا، پھر میں خود ہی ان لوگوں کو اطلاع کر دوں گا۔''
''ٹھیک ہے۔'' اس نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا اور خدا حافظ کہہ کر آگے بڑھ گئی۔
ایوان لیاقت میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک دفعہ پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور آہستہ سے ہاتھ ہلا کر اندر چلی گئی۔ انھوں نے بھی مسکرا کر ہاتھ ہلایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ واپسی میں راستہ انہیں بہت طویل معلوم ہوا۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے ان کا دل و دماغ بوجھل ہو چکا تھا۔
گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے وہ برآمدے میں آ گئے۔ افشاں کے کمرے کے بند دروازوں اور دریچوں پر نگاہ پڑتے ہی انھیں گھر کی ویرانی کا احساس ہوا۔ انھوں نے برآمدے میں رک کر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا، ریلنگ کے قریب جھک کر سگریٹ سلگایا اور وہیں کھڑے

کھڑے دو تین طویل کش لیے پھر اندر چلے آئے۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں وہ بلامقصد ہی چکر لگاتے رہے۔ باورچی خانے کے قریب سے گزرتے ہوئے انھوں نے دیکھا۔ خانساماں اور اس کی بیوی اطمینان سے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ایک دم پلٹ آئے۔ وہ دونوں انھیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔
''معلوم ہوتا ہے آج پھر تمہاری چھٹی ہے۔''
عثمان احمد نے کہا۔
''جی صاحب! افشاں بی بی رات کے لیے سالن تیار کر کے گئی ہیں۔''
خانساماں نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔
''اچھا۔ اور کیا پکایا ہے؟''
''ایک سویٹ ڈش بھی تیار کی ہے، پرسوں ہی اس کی ترکیب ایک رسالے میں پڑھی تھی۔''
''اچھا!'' عثمان احمد قدرے مسکرائے۔
''جی صاحب! انھیں معلوم ہے نا کہ آپ میٹھا بہت شوق سے کھاتے ہیں، اسی لیے وہ آئے دن نئے نئے تجربے کرتی رہتی ہیں۔''
''ہاں، وہ نئے نئے تجربے کرتی ہیں اور تمہارے عیش ہو جاتے ہیں۔''
عثمان احمد کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ خانساماں بھی اپنی بتیسی دکھلانے لگا۔
عثمان احمد نے کہا۔
''تم افشاں کو منع کیوں نہیں کرتے۔ وہ یہاں آرام کرنے آتی ہے اور تم اسے باورچی خانے میں......''
خانساماں جلدی سے بولا۔
''صاحب! میں تو بہت منع کرتا ہوں مگر وہ مانتی ہی نہیں'' خانساماں کی بیوی نے کہا۔
''صاحب جی! وہ کہتی ہیں کہ میں پورے ہفتے تو گھر سے دور رہتی ہوں۔ یہی تو ایک دن ملتا ہے مجھے گھر کا کام کرنے کا۔''
''ہوں۔'' عثمان احمد نے سگریٹ فرش پر ڈال کر پیروں سے ملتے ہوئے کہا اور باورچی خانے سے باہر آ گئے۔
''میں پورے ہفتے تو گھر سے دور رہتی ہوں۔''
خانساماں کی بیوی کی آواز کی بازگشت ان کا تعاقب کر رہی تھی۔

افشاں کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے انھوں نے دل ہی دل میں کہا۔

''تم سے کس نے کہا ہے افشاں! تم اپنے گھر سے دور رہو؟''

''یہ تمہاری اپنی خواہش اور تمہاری اپنی خوشی ہے۔''

بیڈ سائیڈ ٹیبل پر افشاں کی رنگین تصویر رکھی تھی، بیڈ کے نیچے اس کی سرخ چپلیں رکھی تھیں۔ اس کے کمرے میں رکھی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی نگاہ الماری پر پڑ گئی۔ الماری میں چابی لگی رہ گئی تھی۔ شاید وہ الماری بند کر کے چابی نکالنا بھول گئی تھی۔ الماری کے اندر لٹکے ہوئے دوپٹے کا ایک سرا دونوں پٹوں کے درمیان دب کر باہر نکل آیا تھا۔

انھوں نے قریب جا کر الماری کو چیک کیا تو انھیں معلوم ہوا وہ تو الماری کو لاک کرنا ہی بھول گئی تھی۔ انھوں نے الماری کھول کر دوپٹے کا سرا اندر کرنے کی کوشش کی تو کپڑوں کا ایک ڈھیر سا ان کے قدموں میں آ گرا۔ انھیں احساس ہوا۔ الماری میں کپڑے بڑی بے ترتیبی سے ٹھنسے ہوئے تھے۔ کپڑوں کے علاوہ اور بھی کئی الم غلم چیزیں بے تحاشا بھری ہوئی تھیں۔ اسی چکر میں کپڑے زمین پر آ گرے تھے۔ انھوں نے کپڑوں کا ڈھیر اسی طرح اٹھا کر الماری میں دوبارہ ٹھونسنے کی کوشش کی تو پرانی ڈائریاں زمین پر گر پڑیں۔ انھوں نے ڈائریاں بھی اٹھا کر الماری میں رکھ دیں، مگر پھر ایک دم ہی ان کا دل چاہا وہ اس کی ڈائری پڑھیں وہ ہاتھ آگے بڑھاتے بڑھاتے رک گئے۔ چار پانچ منٹ اسی تذبذب میں گزر گئے۔ ڈائری کھولیں یا نہ کھولیں۔

اسے پڑھیں یا نہ پڑھیں۔

پہلے انھوں نے یوں ہی ایک سرسری سی نگاہ ڈالی۔ مگر پھر دو، تین جگہ اپنا نام دیکھ کر ان کا تجسس بڑھ گیا اور وہ پڑھتے چلے گئے۔ وہ تمام اوراق جن میں ان کا ذکر تھا۔ یہ گزشتہ سال کی ڈائری تھی۔ نیا سال شروع ہوئے چار ہی مہینے تو ہوئے تھے نئے سال کی ڈائری یقیناً اس کے پاس ہوگی۔

الماری میں دو تین اور بھی ڈائریاں رکھی ہوئی تھیں مگر عثمان احمد کو اب نہ پرانی ڈائریاں پڑھنے کا تجسس تھا اور نہ موجودہ سال کی ڈائری پڑھنے کا۔

انھوں نے جو کچھ پڑھ لیا تھا وہی ان کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی تھا۔

جانے کتنے پردے سمٹ گئے تھے، ان کی نگاہوں کے سامنے سے جانے کتنے نقاب الٹ گئے تھے۔

اور وہ...... جسے وہ اپنا سرمایہ تصور کیے بیٹھے تھے۔

وہ...... جس کی ہر حرکت ان کے لیے حیران کن بھی تھی اور پریشان کن بھی۔

آج اپنے تمام تر جذبات اور احساسات کے ساتھ ان کے سامنے موجود تھی۔

بالکل ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح۔

اس کے جذبات واحساسات آج ان پر عیاں بھی ہوئے تو کس طرح؟

کیسی قیامت ڈھا گئے تھے ان کے دل ودماغ پر اس کے جذبات۔

کتنی تکلیف دہ باتیں تھیں۔

کیسے روح فرسا خیالات تھے۔

ان کے دماغ کی ساری رگیں کھینچی جا رہی تھیں۔

دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا جیسے دھڑک دھڑک کر بس اب ہمیشہ کے لیے رک ہی جائے گا۔

آج انھیں معلوم ہوا کہ افشاں کی وہ بیگانگی لاتعلقی کس لیے تھی؟

اس کے اور عثمان احمد کے درمیان اجنبیت کی وہ دیوار کس لیے کھڑی تھی۔

انھوں نے کتنا چاہا مگر اجنبیت کی دیوار کو گرا نہ سکے۔

انھوں نے کتنی کوشش کی مگر اپنے اور افشاں کے درمیان کی خلیج کو وہ پاٹ نہ سکے۔

ظاہر ہے کہ ان کے چاہنے سے اور ان کی کوششوں سے کیا ہو سکتا تھا۔

اس کے دل ودماغ میں تو شکوک، غلط فہمیوں اندیشوں اور وسوسوں کے ناگ پل رہے تھے۔

عثمان احمد اپنے دل کی تمام تر نیکیوں اور اپنے جذبات کی تمام تر پاکیزگیوں کے باوجود افشاں کے نزدیک کیا تھے؟

یہ تو انھیں آج ہی معلوم ہوا۔

انھوں نے اسی بے ترتیبی کے ساتھ ساری چیزیں الماری میں ٹھونسیں اور الماری لاک کیے بغیر چابی اسی طرح لگی چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گئے اور بے جان سے ہو کر بستر پر گر پڑے۔

ان کے ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی اور دل بے تحاشا دھڑکے جا رہا تھا۔

وہ ان لمحوں کو پچھتا رہے تھے جب انھوں نے افشاں کی الماری کھولی تھی۔

کاش وہ اس کی الماری نہ کھولتے اور اگر الماری کھول ہی لی تھی تو اس کی ڈائری نہ پڑھتے۔

انھوں نے سوچا......

اس قدر تکلیف دہ انکشاف تو نہ ہوتا ان پر۔ اس کے جذبات واحساسات ان پر عیاں تو نہ ہوتے۔

وہ اتنے بے سکون تو نہ ہوتے۔

اس وقت عثمان احمد کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان تمام کتابوں کو آگ لگا دیں۔ انھیں جلا کر راکھ کر

دیں- جنھیں پڑھ کر افشاں کے دل و دماغ نے سوچوں کا یہ انداز اپنایا تھا- یہ کتابیں اور کہانیاں ہی تو تھیں جنھوں نے افشاں کو ان سے اس قدر دور کر دیا تھا- یہ کیسی کہانیاں تھیں اور کیسے قصے تھے جنھیں پڑھ کر مقدس رشتوں پر سے بھی انسان کا اعتماد اٹھ جاتا ہے-

ان کے ارد گرد تیز و تند آندھیاں تھیں-

اڑتے ہوئے بگولے تھے-

ایک شور تھا جو کانوں کے پردے پھاڑے ڈال رہا تھا-

ایک تلاطم تھا-

ایک طوفان تھا جس میں ان کا وجود ایک بے بس تنکے کی مانند بہا جا رہا تھا-

لمحے سرکے، وقت گزرا تو وہ قدرے نارمل ہوئے- مگر پھر بھولی بسری یادوں نے انھیں آ گھیرا-

وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے- بستر کے قریب ہی ان کی اور عالیہ کی مشترکہ تصویر تھی- انھوں نے دونوں ہاتھوں میں تصویر تھام کر اپنے قریب کر لی، عالیہ کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی اور وہ خود کتنے مطمئن نظر آ رہے تھے-

انھوں نے زیر لب کہا-

''میں نے تم سے شادی کر کے بہت بڑا جرم کیا ہے عالیہ؟'' مگر تصویر بے زبان تھی- اس کے ہونٹوں پر کوئی جنبش نہ ہوئی انھوں نے دل ہی دل میں کہا-

''خداوندا! میں سچ مچ گناہگار ہوں؟''

انھوں نے تصویر ٹیبل پر رکھ دی اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے-

معلوم نہیں کیوں افشاں کے خیالات جان کر وہ خود اپنی نگاہوں میں گر گئے تھے-

وہ اپنے آپ کو بہت ہی حقیر محسوس کر رہے تھے-

حالانکہ وہ جانتے تھے وہ بے قصور ہیں- بالکل بے قصور مگر یہ شک کا ناگ اور اس کا زہر...... اپنا اثر کیے بغیر بھلا کب رہتے ہیں-

انھوں نے بستر پر لیٹے لیٹے دوسرا سگریٹ سلگایا اور دوسرا تکیہ بھی اٹھا کر سر کے نیچے رکھ لیا- دھوئیں کے مرغولے اور بلند ہوتے چلے گئے- انھوں نے لگاتار تین سگریٹ پھونک ڈالے- کمرے میں دھواں بھر گیا مگر انھوں نے اٹھ کر دریچے کے پٹ نہیں کھولے- وہ اسی طرح لیٹے رہے-

بیتی ہوئی گھڑیاں اور گزرے ہوئے لمحے انھیں آج پھر یاد آئے تھے-

وہ چودھویں کی رات تھی- اس روز...... صبح سے لے کر شام تک مسلسل بوندا باندی ہوتی رہی تھی-

پھر ایک دم ہی بادل اڑ گئے تھے، آسمان صاف ہو گیا تھا- کیسا صاف و شفاف نیلا آسمان نکل آیا تھا- بادل چھٹ جانے کے بعد، ہر چیز دھل کر نکھر آئی تھی- تارے نکلے تو وہ بھی گزشتہ دنوں کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی چمکیلے تھے اور چاند...... اس کی چھب تو قابل دید تھی — پیلا، گول، بڑا سا چاند...... چمکتا ہوا چاند، بھیگی ہوئی ہواؤں میں گیلے پتوں، ٹہنیوں اور پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی- ہوا کے سبک رفتار جھونکے گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اڑائے لیے پھر رہے تھے-

عثمان احمد معمول کے مطابق اس روز بھی دیر سے آئے تھے- گیٹ سے اندر داخل ہونے سے پہلے انھوں نے کیچڑ مٹی سے بھرے ہوئے جوتوں کو خوب زور زور سے رگڑ رگڑ کر صاف کیا اور پھر بلا ارادہ ان کی نگاہ اوپر اٹھ گئی- ان کی بہنیں نسرین اور پروین چھت پہ کھڑی تھیں-

ان کے ساتھ ایک چہرہ اور بھی نظر آ رہا تھا- ایک اجنبی چہرہ- ایک نامانوس چہرہ- چاند کی طرح جگمگاتا ہوا سمٹ آیا-

دو، ایک سیکنڈ تک وہ پلکیں جھپکائے بغیر اوپر ہی دیکھتے رہے- ان کی بہن پروین نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا- وہ جواب میں ہاتھ بھی نہ ہلا سکے دل ہی دل میں اس نامانوس چہرے کے متعلق سوچتے ہوئے اندر چلے گئے- سامنے ہی انھیں امی (سرور جہاں) نظر آئیں- ان کے قریب بیٹھتے ہوئے عثمان احمد نے بڑی رازداری سے پوچھا-

''کون آیا ہے امی؟''

''تمہیں کیسے معلوم کہ کوئی آیا ہے؟'' سرور جہاں مسکرائیں-

''اوپر چھت پہ نسرین اور پروین کے ساتھ کوئی لڑکی کھڑی ہے-''

''اچھا تو یوں کہو، باہر سے ہی دیکھ لیا- میں بھی حیران تھی کہ گھر میں گھستے ہی تمہیں خبر ہو گئی-''

''جی، تو بتایا نہیں آپ نے، کون ہے؟''

''عالیہ ہے-''

''کون عالیہ؟''

''تمہارے عرفان چچا کی بیٹی-''

''عرفان چچا آئے ہوئے ہیں پشاور سے؟''

''نہیں، وہ تو نہیں آئے-''

''پھر؟''

''شاہ رخ گئے ہوئے تھے اپنے ماں باپ سے ملنے- انھیں کے ساتھ آئی ہے-''

''شاہ رخ بھائی کب واپس آئے؟''

''ایک ہفتہ ہوا-''

''اس کا مطلب ہے آج وہ بھی آئے تھے-''

''ہاں، سہ پہر کو آئے تھے، تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے-''

''تو یہ محترمہ واپس کس کے ساتھ جائیں گی؟''

سرور جہاں نے اپنے بیٹے کا یہ جملہ سن کر قدرے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور بولیں-

''تم کیوں فکر مند ہو رہے ہو؟ اس کا بھائی آ کر خود ہی لے جائے گا-''

''تو گویا شاہ رخ بھائی ابھی دوبارہ آئیں گے-''

''ہاں، تمہیں یہ فکر لگ گئی کہ کہیں تمہیں نہ چھوڑنا پڑے-''

عثمان احمد مسکرا کر بولے

''نہیں، یہ بات نہیں تھی- میں نے تو ویسے ہی پوچھا تھا-''

سرور جہاں زیر لب مسکراتی رہیں- پھر بولیں-

''تمہیں تو عالیہ یاد بھی نہیں ہوگی-''

''نہیں، مجھے نہیں یاد-''

''بہت چھوٹی سی تھی جب ایک دفعہ آئی تھی-''

''اچھا-'' وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے آئے-

نسرین نے یا پروین نے ان کا سفید کرتا پاجامہ استری کر کے ہینگر میں لٹکا دیا تھا- انھوں نے غسل کر کے کپڑے تبدیل کیے، اور باہر نکلنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ عالیہ ان کی بہنوں کے ساتھ کمرے میں آ گئی- عثمان احمد کی نگاہ جونہی اس کی طرف اٹھی اس نے اپنی نرم اور دھیمی آواز میں کہا ''آداب-''

عثمان احمد نے سر کے خفیف سے اشارے سے جواب دیا-

نسرین نے کہا-

''عثمان بھائی یہ عالیہ ہیں-''

وہ دھیرے سے مسکرا کر بولے-

''ہاں مجھے معلوم ہے یہ عالیہ عرفان ہیں-''

نسرین اور پروین ان کی بات سن کر مسکرائیں- عالیہ نے بھی پلکیں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا مگر بولی کچھ نہیں-

پروین نے کہا-

''اس کا مطلب ہے آپ پہلے ہی عالیہ کے بارے میں انکوائری کر چکے ہیں-''

''ہو سکتا ہے میرے انکوائری کیے بغیر خود ہی معلومات فراہم کر دی گئی ہوں-''

نسرین نے کہا-

''اچھا چلیے- یونہی سہی، لیکن یہ بتائیے آپ تھے کہاں دوپہر سے......؟''

''بڑا ضروری کام تھا- اسی میں پھنسا ہوا تھا-''

''پتہ بھی ہے ہم لوگ آپ کا بڑا زبردست انتظار کر رہے تھے-''

''کیوں؟''

''آپ ہوتے تو ہم تینوں کو سیر کرانے لے جاتے، کتنا اچھا موسم تھا-''

''پھر کسی روز سہی- ابھی تو عالیہ رہیں گی کراچی میں-''

پروین نے کہا-

''عالیہ تو اب مستقل کراچی میں ہی رہیں گی-''

''اچھا!''

''جی! یہ یہیں پر یونیورسٹی میں ایڈمشن لیں گی-''

''پھر انہیں اطمینان سے سیر کراتی رہنا-''

عثمان احمد نے دیکھا- عالیہ خاموش بیٹھی ان کے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی- پھر تھوڑی دیر بعد شاہ رخ بھائی آ گئے- ان کے ساتھ سمیرا بھابھی بھی تھیں- عالیہ پروین اور نسرین کے ساتھ ڈرائنگ روم میں چلی گئی- وہ بھی شاہ رخ بھائی سے ملنے ڈرائنگ روم میں چلے گئے- چلتے وقت شاہ رخ بھائی نے ان سے شکوہ کیا-

''تم تو شکل ہی نہیں دکھاتے عثمان- آ جایا کرو کبھی-''

عثمان احمد شرمندہ ہو گئے- وہ سچ مچ کبھی بھولے بھٹکے ہی شاہ رخ بھائی کے گھر جایا کرتے تھے- جھینپ کر بولے-

''بس کچھ ایسی ہی مصروفیت رہتی ہے-''

''اپنی مصروفیت میں سے تھوڑا سا وقت ہمارے لیے بھی نکال لیا کرو-''

''میں آؤں گا کسی دن'' عثمان احمد نے کہا-

سمیرا بھابھی مسکرا کر بولیں-

''پھر کس دن انتظار کریں تمہارا؟''

''کوئی خاص دن تو مقرر نہیں کر سکتا، کسی بھی دن آ جاؤں گا-''

اور پھر تین چار روز بعد ہی عثمان احمد شاہ رخ بھائی کے گھر جا پہنچے- اس روز بھی موسم صبح ہی سے ابر آلود تھا- صبح سے کئی دفعہ ہلکی ہلکی بوندیں پڑ چکی تھیں- عالیہ لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی شاید موسم سے ہی لطف اندوز ہو رہی تھی- ہوا کے جھونکوں سے اڑتا ہوا اس کا سبز آنچل بے قابو ہوا جا رہا تھا- ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہوئے کہا-

''صاحب اور بیگم صاحبہ تو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی گئے ہیں-''

''اچھا! کب تک واپس آ جائیں گے؟''

''جی، مجھے تو معلوم نہیں، عالیہ بی بی کو معلوم ہوگا-''

''ہوں-''...... عثمان احمد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ایک طویل سانس لی-

ملازم نے باہر جاتے ہوئے کہا-

''میں ابھی عالیہ بی بی کو بھیجتا ہوں-''

تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم کے باہر چوڑیوں کی کھنک سنائی دی اور عالیہ پردہ ہٹا کر اندر آ گئی-

''آداب!'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا-

عثمان احمد نے آہستہ سے سر ہلایا- عالیہ نے ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا-

''بھائی جان اور بھابھی ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں-''

''اچھا! خیریت ہے؟''

''بھابھی کی طبیعت کچھ خراب ہے-''

عثمان احمد نے عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا-

''طبیعت تو مجھے تمہاری بھی خراب معلوم ہوتی ہے-''

زکام کی وجہ سے عالیہ کی ناک سرخ ہو رہی تھی- آنکھوں میں پانی بھرا ہوا تھا- سچ تو یہ تھا کہ وہ زکام کی وجہ سے کچھ اور خوبصورت لگ رہی تھی —— آنکھوں میں گلابی گلابی ڈورے تیر رہے تھے- چہرے پر ہلکی سی تمتماہٹ تھی- وہ چند سیکنڈ تک ٹکٹکی باندھے اس کی طرف دیکھتے رہے- عالیہ کچھ نروس سی ہو گئی- بے اختیار اس کی نگاہیں جھک گئیں-

عثمان احمد نے کہا-

''اور آپ تو خیریت سے ہیں نا؟''

''جی-'' جھکی پلکیں اوپر اٹھیں-

''غالباً نزلہ ہو رہا ہے آپ کو-''

''جی-'' اس نے رومال سے اپنی ناک رگڑتے ہوئے کہا-

''یہاں کا موسم آپ کو راس نہیں آیا-''

''ایسا ہی معلوم ہوتا ہے-'' وہ مسکرائی-

''پھر یہاں کس طرح رہ سکیں گی آپ؟''

''یہاں ایڈمشن لینا ہے تو ہر حال میں رہنا پڑے گا-''

''وہیں کیوں نہیں ایڈمشن لے لیا آپ نے؟''

''بھائی جان اور بھابھی کا اصرار تھا کہ میں ان کے ساتھ ہی رہوں-''

''کراچی پسند آیا آپ کو؟''

''ابھی تو میں پوری طرح نہیں گھومی ہوں، لیکن جتنا کچھ بھی دیکھا ہے اس کے لحاظ سے پسند آیا-''

پھر وہ کچھ دیر بیٹھ کر گھر جانے کے لیے اٹھے تو اسی وقت ملازم گرم گرم چائے لے آیا-

''میں چائے نہیں پیوں گا-'' عثمان احمد نے دریچے کے باہر دیکھتے ہوئے کہا-

''کیوں؟'' اس نے قدرے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا-

''میرا خیال ہے بارش آنے والی ہے- اگر میں تھوڑی دیر بھی یہاں رک گیا تو پھنس جاؤں گا-''

''کوئی بات نہیں، کبھی تو بارش رکے گی-''

''ہاں، مگر معلوم نہیں کب؟''

عالیہ کوئی جواب دیے بغیر پیالیوں میں چائے انڈیلنے لگی-

''ارے! آپ نے تو چائے بنانی بھی شروع کر دی-''

''جی، بس اب آپ چائے پی کر ہی جائیں-''

وہ دوبارہ بیٹھ گئے-

انھوں نے چائے ختم ہی کی تھی کہ بارش آ گئی-

عثمان احمد نے کہا-

''دیکھیے، میں نہیں کہتا تھا کہ بارش آ جائے گی-''

عالیہ ان کی بات سن کر مسکرائی اور اپنا کپ رکھ کر دریچے میں آ گئی- عثمان احمد صوفے کی پشت سے سر ٹکائے اس کی پشت پر بکھرے ہوئے بالوں کو دیکھتے رہے جو ربن کی قید سے آزاد ہونے کے لیے بے طرح مچل رہے تھے-

عالیہ نے ایک دم پلٹ کر عثمان احمد کی طرف دیکھا اور بولی......

''آپ کو بارش کیسی لگتی ہے-''

''آپ کو کیسی لگتی ہے؟''

''مجھے؟ مجھے تو بے پناہ اچھی لگتی ہے-''

عالیہ نے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا- اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت اور خوشی تھی-

اس نے پھر عثمان احمد سے پوچھا-

''آپ نے نہیں بتایا آپ کو بارش کیسی لگتی ہے-''

''مجھے بھی اچھی لگتی ہے-'' وہ مسکرائے-

''مگر آپ تو بہت آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں-''

''کیا مطلب؟''

''یہاں آ کر دیکھئے نا کتنا اچھا لگ رہا ہے-''

عثمان احمد اٹھ کر اس کے قریب آ گئے- عالیہ نے دریچے کے ایک سرے پر سرکتے ہوئے ان کے لیے جگہ بنائی-

عالیہ نے گردن کو قدرے خم دیتے ہوئے کہا-

''یہ سب کچھ آپ صوفے پر بیٹھے ہوئے تو نہیں دیکھ سکتے تھے-''

عثمان احمد نے سوچا-

کتنے معصوم اور سادہ انداز سے فری ہو گئی ہے وہ ان کے ساتھ- ورنہ وہ تو شاید پانچ، چھ ملاقاتوں کے بعد بھی وہیں رہتے جہاں روز اول تھے- عالیہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا-

''آیئے، باہر برآمدے میں نہ کھڑے ہو جائیں ہم دونوں-''

عثمان احمد نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا-

''تھوڑی دیر بعد آپ کہیں گی- باہر سڑک پر نہ کھڑے ہو جائیں ہم دونوں-''

وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی- ہنستے ہوئے اس کے رخساروں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے تھے-

عثمان احمد نے بڑی دلچسپی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور اس کے ساتھ برآمدے کی ریلنگ کے قریب کھڑے ہو گئے عالیہ نے ریلنگ کے سہارے جھک کر دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیئے اس کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک بھیگ گئے اور بالوں پر پانی کی ننھی بوندیں چمکنے لگیں-

عثمان احمد نے کہا-

''آپ غالباً بھول رہی ہیں کہ آپ کو شدید نزلہ ہے-''

''تو کیا ہوا-'' اس نے لاپرواہی سے کہا-

''اب یہ بھی بتانا پڑے گا کہ بارش میں بھیگنے سے طبیعت اور زیادہ خراب ہو سکتی ہے-''

''آپ تو بھائی جان کی طرح نصیحتیں کرنے لگے ہیں-''

اسی وقت بادل بڑی زور سے گرجے اور عالیہ سہم کر پیچھے ہٹ گئی-

''ڈر گئیں؟'' عثمان احمد مسکرائے-

''بہت خوف آتا ہے جب بادل گرجتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے-'' اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا-

پھر بارش بہت دیر تک نہیں رکی- وہ دونوں برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے باتیں کرتے رہے- عثمان احمد کو اندازہ ہوا...... خاصی باتونی تھی وہ...... پشاور شہر کی باتیں، اس کے موسم کی باتیں، اپنے کالج کی باتیں، سہیلیوں کی باتیں اور اپنے دوسرے بھائی بہنوں کی باتیں وہ اس طرح کر رہی تھی جیسے عثمان احمد سے اس کی بڑی پرانی واقفیت ہو-

اور جب عثمان احمد گھر جانے کے لیے اٹھے تو اس نے کہا-

''اب کی دفعہ جب آپ آئیں گے تو نسرین اور پروین کو بھی لایئے گا-''

''بہت بہتر اور کوئی حکم؟''

''نہیں، بس فی الحال اتنا ہی کافی ہے-'' اس نے بڑے اطمینان سے کہا-

عثمان احمد نے کہا-

''اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ عرض کروں؟''

''جی، اجازت ہے-''

''اب آپ کی باری ہے ہمارے گھر آنے کی-''

''اچھا، پھر میں ہی آ جاؤں گی-''

اس روز...... رات بھر وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی اور عثمان احمد کی آنکھیں بہت دیر تک بے خواب رہیں-

ساری رات دو چاند چمکتے رہے- ایک بہت اوپر...... بلندیوں پر......

نیلے چمکتے آکاش پر-

اور دوسرا...... ان کے گھر کی چھت پر-

ان کی بہنوں نسرین اور پروین کے بیچ-

جگمگاتا ہوا چاند-

بند پلکوں تلے بھی وہی چاند چمکتا تھا-

اور کھلی آنکھوں میں بھی اسی چاند کی جوت تھی۔

اور تقریباً ساری ہی رات......

دو صاف وشفاف ملائم ہاتھ کہنیوں تک بھیگتے رہے۔

کانچ کی سرخ وسنہری چوڑیوں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپکتا رہا۔ اور بالوں میں ڈھیروں نقرئی موتی جھلملاتے رہے۔

برستے ہوئے بادل۔

بھیگی ہوئی ہواؤں کے جھونکے۔

اڑتا ہوا سبز آنچل۔

وہ ایک لمحے کے لیے آنکھوں کو بند کر کے بچوں کے سے انداز میں بارش کے لیے پسندیدگی کا اظہار کرنا۔

کچھ لمحے، کچھ گھڑیاں اور کچھ باتیں۔

ہمیشہ کے لیے دلوں پر نقش ہو جاتے ہیں۔

کچھ چہرے وقت کی اڑتی ہوئی دھول میں بھی کبھی نہیں دبتے کچھ یادیں ذہن سے کبھی فراموش نہیں ہوتیں۔

لمحوں کا طویل ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔

کبھی کبھی برسوں گزر جاتے ہیں اور کچھ نہیں ہوتا۔

بس جیسے ہوا کا ایک جھونکا آ کر گزر جائے اور کچھ بھی نہ ہو۔

اور کبھی کبھی...... چند مختصر سے لمحے۔

گزرتے ہوئے وقت کا بہت تھوڑا سا حصہ ہمیں ایسی ایسی سوغاتیں دے جاتا ہے جن کے اچھوتے پن سے انکار ممکن ہی نہیں ہوتا۔

ایسے ہی لمحات، ایسی ہی گھڑیاں۔

عثمان احمد کی زندگی میں بھی بڑی خاموشی سے اور بالکل اچانک آ گئے تھے۔

انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کا سارا حسن اور ساری رعنائی اس مختصر سے وقت کی بانہوں میں سمٹ آئی ہو۔

بارش کی رم جھم سے ٹکراتی ہوئی آواز کی بازگشت انہیں سنائی دیتی رہی۔

''آپ کو بارش کیسی لگتی ہے؟''

''مجھے؟ مجھے تو بے پناہ اچھی لگتی ہے۔''

''یہاں آ کر دیکھیے نا! کتنا اچھا لگ رہا ہے۔''

وہ کروٹ بدل بدل کر سونے کی کوشش کرتے رہے مگر یہ کیسی رات آئی تھی ان کی زندگی میں؟

وہ حیران تھے...... بہت حیران۔

زندگی کے انداز یوں بھی بدل جایا کرتے ہیں۔

گزرتے ہوئے وقت کے لمحات کتنی خاموشی اور کتنی آہستگی سے انھیں ایک دوسرے کے قریب کر رہے تھے۔ مگر دونوں کتنے محتاط تھے، کوئی بھی تو اندازہ نہیں لگا سکا۔

چھٹیوں میں وہ اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے پشاور جا رہی تھی۔ عثمان احمد کی بہنوں نے انہیں بتایا تھا لیکن خود عالیہ نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ ویسے وہ خود بھی بہت روز سے شاہ رخ بھائی کے گھر نہیں گئے تھے۔ اس روز صدر میں انہیں عالیہ نظر آئی۔ وہ اپنے بھائی اور بھابھی کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی۔ سب سے پہلے عالیہ کی ہی نگاہ ان پر پڑی۔ اس نے شاہ رخ بھائی سے کہا۔ شاہ رخ بھائی نے ہاتھ کا اشارہ کر کے عثمان احمد کو اپنے قریب بلایا۔ واپسی پر وہ لوگ انہیں اپنے ساتھ ہی گھر لے آئے۔ شام کی چائے سب نے ساتھ ہی پی۔ شاہ رخ بھائی اور سمیرا بھابھی اپنے ایک دوست کی شادی کے سلسلے میں رات کے کھانے پر مدعو تھے۔

ان دونوں کے جانے کے بعد عثمان احمد عالیہ کے ساتھ باہر برآمدے میں ہی بیٹھ گئے۔

کئی منٹ گزر گئے۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے عثمان احمد نے محسوس کیا...... عالیہ کچھ چپ چپ سی تھی۔ وہ خود تو اس لیے خاموش تھے کہ وہ عالیہ کے بولنے کے منتظر تھے۔ کیونکہ ہمیشہ باتیں تو زیادہ تر وہی کیا کرتی تھی۔ وہ خود تو بیشتر اوقات صرف سنتے ہی رہتے تھے۔

آخر کار عثمان احمد کو ہی بولنا پڑا۔ انھوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''عالیہ! آج روزہ رکھا ہے تم نے؟''

اس نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''روزہ؟ کیسا روزہ؟''

''چپ شاہ کا روزہ۔''

وہ ایک دم کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی

''نہیں۔''

''پھر؟''

''پھر کچھ بھی نہیں۔''

عثمان احمد نے کہا

''سنا ہے لوگ چھٹیاں گزارنے پشاور جا رہے ہیں-''

''جی، ٹھیک سنا ہے-''

''ہم سے تو ذکر بھی نہیں کیا لوگوں نے-''

''لوگ اگر یہاں تشریف لاتے تو ان سے ذکر بھی کیا جاتا-'' وہ خلاف معمول بہت سنجیدہ تھی-

''کیا بہت دن ہو گئے ہیں مجھے یہاں آئے ہوئے؟''

''جی، آج پورے اکیس روز بعد آئے ہیں آپ-''

عثمان احمد دل ہی دل میں خوش ہوئے کہ اس نے ان کے نہ آنے کے دن انگلیوں پر شمار کر رکھے ہیں-

''تم بھی تو نہیں آئیں بہت دنوں سے-'' انھوں نے قصداً جھوٹ بولا-

''میں تو ابھی پانچ روز پہلے ہی گئی تھی- آپ خود ہی نہیں تھے-''

''اچھا!!''

''آپ سے ذکر نہیں کیا کسی نے؟''

''کیا تھا-''

''پھر اتنے انجان کیوں بن رہے ہیں؟''

''تفریحاً-''

تفریحاً اور کیا کچھ کرتے ہیں آپ؟''

''تم سے باتیں کرتا ہوں-''

عثمان احمد نے قصداً یہ جملہ کہہ کر اس کے تاثرات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی- عالیہ کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا اس کی آنکھوں میں دھواں سا لہرا گیا- اس نے پلکیں جھکا کر اپنی کیفیت کو چھپانے کی کوشش کی، لیکن عثمان کو سمجھنے کے لیے وہ دو تین لمحے ہی کافی تھے-

عثمان احمد نے محض اسے تنگ کرنے کے لیے کہا-

''تم بھی تفریحاً باتیں کرتی ہو نا مجھ سے؟''

ان کا یہ مذاق شاید عالیہ کے لیے نا قابل برداشت ہو گیا وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اندر جانے لگی- عثمان احمد اسے روکتے رہ گئے لیکن وہ اپنے کمرے میں چلی گئی- انہیں پہلی بار احساس ہوا کہ اس قدر باتونی اور اس قدر ہنسنے والی لڑکی اندر سے کتنی حساس ہے-

وہ اٹھ کر اس کے کمرے کی طرف چل دیئے- کئی دفعہ دستک دینے پر بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو انھوں نے قدرے بلند آواز سے کہا-

''بہتر ہو گا تم اندر آنے کی اجازت دے دو- ورنہ بغیر اجازت ہی اندر آنا پڑے گا-''

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گئے- وہ اپنا سوٹ کیس بستر پہ رکھے کپڑے تہ کر کے رکھ رہی تھی-

عثمان احمد اس کے قریب رک کر بولے

''بڑے زوروں میں تیاری ہو رہی ہے جانے کی-''

اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا

''بہتر ہو گا اس وقت آپ اپنے گھر چلے جائیں-''

''کیوں؟ موڈ نہیں ہے باتیں کرنے کا؟''

''ہاں-''

اداس ہو رہی ہو؟''

''ہاں-'' اس نے سر ہلایا-

''اداسی کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی-''

وہ خاموش رہی-

''تمہیں تو خوش ہونا چاہیے اپنے گھر والوں سے ملنے جا رہی ہو-''

وہ سر جھکائے اپنے کپڑے تہ کرتی رہی-

''شاہ رخ بھائی اور بھابھی یاد آئیں گی؟''

اس نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا-

''اچھا تو پھر عبدالغفور کی یاد ستائے گی-'' انھوں نے شاہ رخ بھائی کے ملازم کا نام لیا-

عالیہ ایک دم ہنس پڑی-

عثمان احمد نے کہا

''دیکھا! کیسا صحیح اندازہ لگایا میں نے-''

''آپ پاگل ہو گئے ہیں بالکل-'' اس نے جھینپ کر کہا-

''اچھا تو پھر تم ہی بتا دو کون یاد آئے گا-''

عثمان احمد نے کہا-

عالیہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا-

''مجھے نہیں معلوم کون یاد آئے گا-''

''اچھا، اس دفعہ میں بالکل صحیح صحیح بتاؤں گا-''

اس نے دوپٹے کی تہ کرتے ہوئے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا عثمان احمد نے اپنی گردن کو قدرے خم دیتے ہوئے کہا۔

"مابدولت یاد آئیں گے۔"

ایک لمحے کے لیے عالیہ کا چہرہ تمتما اٹھا، پھر فوراً ہی وہ منہ پھیرتے ہوئے بولی۔

"جی نہیں، میں ایسے لوگوں کو ہرگز یاد نہیں کروں گی جو کسی سے محض تفریحاً باتیں کرتے ہوں؟"

عثمان احمد نے اس کے قریب جھک کر سرگوشی کی۔

"کیا سننا چاہتی ہو میری زبان سے؟"

عالیہ ایک دم نروس ہوگئی۔ اس نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا

"کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔"

عثمان احمد دریچے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔

"کچھ کہنے یا نہ کہنے سے فرق تھوڑی پڑتا ہے عالیہ! جذبات احساسات الفاظ کے سہاروں کے محتاج تھوڑی ہوتے ہیں۔"

عالیہ کو خاموش پا کر انھوں نے کہا۔

"کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

عالیہ نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

"کیا ساری چھٹیاں وہیں گزار کر آؤ گی؟"

"ہاں، شاید۔"

"نہیں، جلدی واپس آجانا۔ میں انتظار کروں گا۔"

عالیہ نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا۔

"اچھا۔ اب اجازت؟" انھوں نے پوچھا۔

اور عالیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گئے۔

عالیہ کوشش کے باوجود ایک مہینے سے پہلے نہ واپس آسکی۔ گھر والوں کی خواہش تھی کہ وہ اپنی ساری چھٹیاں پشاور میں گزارے مگر عالیہ نہیں رکی۔

اسے کراچی آئے ہوئے پورا ایک ہفتہ ہوگیا تھا۔ ایک شام عثمان احمد، پروین اور نسرین کے ساتھ اس سے ملنے چلے آئے۔ عالیہ شاہ رخ بھائی اور سمیرا بھابھی کے ساتھ باہر لان میں ہی بیٹھی تھی۔ ذرا دیر پہلے ہی ان لوگوں نے شام کی چائے پی تھی۔ عالیہ کے ہاتھ میں شام کا کوئی تازہ اخبار تھا۔

پروین اور نسرین نے شاہ رخ بھائی اور بھابھی کو سلام کرنے کے بعد عالیہ سے کہا۔

"ایک ہفتے سے آئی ہوئی ہو۔ اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ہم سے ملنے آجاتیں۔"

عالیہ نے مسکرا کر کہا۔

"میں آپ لوگوں کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔"

اس روز عثمان احمد کو عالیہ سے بات کرنے کا ذرا بھی موقع نہ مل سکا۔ وہ نہ اس کی سن سکے نہ اپنی کہہ سکے۔ ان دونوں کے درمیان چند رسمی سی باتیں ہوئیں اور بس۔

چار پانچ روز بعد وہ آفس سے گھر واپس آئے تو عالیہ آئی ہوئی تھی۔ وہ پروین، نسرین اور اپنی چچی سرور جہاں کے لیے باڑے سے خریدی ہوئی کئی چیزیں لائی تھی جو اس کی امی نے بھجوائی تھیں۔

پروین، عثمان احمد کے لیے کھانا لینے باورچی خانے میں گئی تو عالیہ نسرین کے ساتھ ڈائننگ روم میں آگئی۔ تھوڑی دیر بعد عثمان احمد بھی کپڑے تبدیل کر کے اور منہ ہاتھ دھو کر وہیں آگئے۔ عثمان احمد نے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کہیے عالیہ عرفان کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہے۔ آپ سنائیے۔"

"بس آپ کی دعائیں ہیں۔" وہ مسکرائے۔

سرور جہاں نے نسرین کو آواز دی تو وہ ان کے کمرے میں چلی گئی۔

عثمان احمد نے عالیہ سے کہا۔

"پوری چھٹیاں گزار کر ہی آئیں نا تم!"

"پندرہ دن پہلے ہی تو واپس آگئی میں۔"

"اچھا، اور کیا خبریں ہیں پشاور کی؟"

"کوئی نئی خبر نہیں۔ ہاں! آپ کے یہاں البتہ ایک خوشخبری سنی ہے۔"

"غالباً پروین کی شادی کی طرف اشارہ ہے تمہارا۔"

"جی۔"

اس وقت پروین کھانا لے کر آگئی۔ عثمان احمد نے کنکھیوں سے پروین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں! اصل میں اس لڑکی نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا تھا، لہٰذا ہم نے سوچا کہ اسے نکالنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

پروین نے پیار بھری ناراضگی سے عثمان احمد کی طرف دیکھا۔ عثمان احمد نے سالن کا ڈونگہ اپنی

طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔
''تم کھانا کھا چکیں عالیہ؟''
''جی، میں نے کھالیا۔''
''تھوڑا سا اور سہی۔''
''نہیں۔اب گنجائش نہیں ہے۔''
پھر شام کو جب عالیہ گھر جانے لگی تو عثمان احمد نے پوچھا۔
''اب کب آنے کا ارادہ ہے؟''
''میں نہیں آؤں گی۔اب آپ آیئے گا۔''
''کیوں؟ کوئی باری بندھی ہوئی ہے؟''
''یہی سمجھ لیجیے۔''
''اچھا، پھر مابدولت ہی آجائیں گے۔''

پروین کی شادی پر بڑا ہنگامہ تھا۔ پشاور سے عالیہ کے ابو عرفان صاحب اور اس کی امی کشور بانو بھی آئی تھیں۔شادی سے ایک ہفتہ پہلے ہی نسرین عالیہ کو اپنے گھر لے آئی تھی۔شادی کے دنوں میں عثمان احمد نے عالیہ کے اتنے بہت سارے روپ دیکھے کہ وہ یہ سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ اب دل کی بات زبان پر آہی جانی چاہیے۔انھیں اپنی امی سے یہ بات کہہ ہی دینی چاہیے کہ وہ ان کے لیے ادھر ادھر لڑکیاں دیکھنے کے بجائے عالیہ ہی کا انتخاب کرلیں۔تقریباً ڈیڑھ سال قبل انھوں نے پروین اور نسرین سے سنا تھا کہ سرور جہاں ان کے لیے لڑکیاں ڈھونڈتی پھر رہی ہیں۔دو تین اچھی لڑکیاں ان کی نگاہ میں بھی ہیں۔

پھر جب پروین کے رخصت ہوجانے کے بعد سارے ہنگامے سرد پڑ گئے اور گھر میں سناٹا چھا گیا تو ایک روز سرور جہاں نے عثمان احمد سے کہا۔
''پروین کے جانے سے گھر بڑا سونا سونا لگنے لگا ہے۔''
عثمان احمد نے قریب بیٹھی نسرین کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا......
''اور جب ہم نسرین کو بھی گھر سے نکال دیں گے تو پھر اور بھی سناٹا ہوجائے گا۔''
نسرین نے کہا۔
''اس سے پہلے ہی ہم لوگ آپ کی بیگم صاحبہ کو لے آئیں گے۔''
''اچھا تو یہ پروگرام بنا رکھا ہے تم لوگوں نے؟''
''جی، اس روز ابو بھی کہہ رہے تھے کہ اب گھر میں ہماری بہو آجانی چاہیے۔'' نسرین نے

شرارت بھری نگاہوں سے عثمان احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
عثمان احمد نے سنجیدگی سے کہا
''ٹھیک ہے، امی، ابو اپنی بہو لے آئیں، تم اپنی بھابھی لے آؤ۔لیکن لڑکی میری پسند کی ہوگی۔''
نسرین نے کہا۔
''اچھا! ذرا ہمیں بھی تو پتہ چلے آپ کی پسند۔''
عثمان احمد نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور بولے۔
''عالیہ۔''
نسرین نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔
''شکر ہے ہماری اور آپ کی پسند کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔''
عثمان احمد نے سرور جہاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''کیوں امی؟ کیسی ہے میری پسند؟''
سرور جہاں مسکرا کر بولیں۔
''میری پسند کیوں کہہ رہے ہو؟ عالیہ ہم لوگوں کو بھی پسند ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولیں۔
''عرفان بھائی تو پشاور چلے گئے ہیں، بھابھی ابھی یہیں ہیں۔میرا خیال ہے ان ہی سے ذکر کر دیا جائے۔''
عثمان احمد نے کہا۔
''نہیں امی، ابھی رہنے دیں۔''
''کیوں؟''
''عالیہ کا فائنل ائیر ہے۔امتحان ہوجائیں پھر دیکھا جائے گا۔''
نسرین نے کہا۔
''امتحانوں میں تو ابھی کئی مہینے باقی ہیں بھائی جان۔''
''مگر میرا خیال ہے کہ فی الحال اسے ڈسٹرب نہ ہی کیا جائے۔'' مگر سرور جہاں کو ان کی رائے سے اتفاق نہیں تھا۔انہوں نے کہا۔
''نہیں، میں بھابھی سے تو ذکر کر ہی دوں گی بے شک وہ ابھی عالیہ کو نہ بتائیں۔''
عثمان احمد نے بھی اپنی بات منوانے کے لیے زیادہ اصرار نہیں کیا۔لیکن اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ سرور جہاں کو اسی روز اپنے بھائی کی شدید علالت کا تار ملا اور وہ حیدرآباد روانہ ہوگئیں۔عالیہ کی امی کشور بانو بھی ایک ہفتے بعد پشاور واپس چلی گئیں۔سرور جہاں تو اپنے بھائی کے ہاسپٹل سے

ڈسچارج ہونے کے بعد واپس کراچی آ گئیں، لیکن بات جہاں تھی وہیں رہ گئی-

جبھی ایک روز شاہ رخ بھائی سمیرا بھابھی کے ساتھ ان لوگوں سے ملنے آئے تو سرور جہاں نے موقع غنیمت جان کر انہی سے عالیہ کے لیے کہہ دیا- اس روز عالیہ ان لوگوں کے ساتھ نہیں آئی تھی اور عثمان احمد بھی گھر میں نہیں تھے-

شاہ رخ بھائی نے کہا-

''چچی جان! میرا خیال ہے آپ اس سلسلے میں امی کو خط لکھ دیں، ویسے میں بھی انہیں دو چار روز میں خط لکھنے والا ہوں' اچھا ہوا آپ نے آج ذکر کر دیا-''

سرور جہاں نے بڑے بھروسے اور اعتماد کے ساتھ کشور بانو کو خط لکھا اور بڑی بے چینی سے ان کے جواب کا انتظار کرنے لگیں-

اور جب کشور بانو کا جواب آیا تو......

سرور جہاں کی ساری امیدیں اور آرزوئیں خاک میں مل گئیں ان کی ساری خوشی ملیامیٹ ہو گئی-

عالیہ کو بہو بنانے کا سپنا بکھر کر ریزہ ریزہ ہو گیا-

کشور بانو نے لکھا تھا کہ عالیہ بچپن سے ہی اپنی خالہ کے بیٹے معظم کے لیے مانگی ہوئی ہے- پچھلے دنوں کراچی میں اپنے قیام کے دوران میں اپنی بہن کو از سر نو زبان دے چکی ہوں کہ عالیہ کے امتحان ختم ہوتے ہی وہ اس کی شادی معظم سے کر دیں گی، معظم خود بھی عالیہ کو بہت پسند کرتا ہے-

جس وقت کشور بانو کا خط آیا، عثمان احمد وہیں موجود تھے ان کی امی خط پڑھ رہی تھیں اور وہ خود ان کے چہرے کے تاثرات کو پڑھ رہے تھے- اپنی امی کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگوں کو دیکھ کر انہیں یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوئی کہ عالیہ کی امی نے انکار کر دیا ہے-

اس رات کی سحر کچھ اس طرح ہوئی کہ ان کی آنکھوں کے قریب سے نیند کا گزر بھی نہ ہوا-

ایش ٹرے سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر گئی-

سوچتے سوچتے ان کے دماغ کی رگیں کھنچنے لگیں

اس رات پہلی مرتبہ انہیں اپنے جذبات کی شدت کا اندازہ ہوا- عالیہ انہیں اچھی لگتی تھی-

وہ انہیں بہت اچھی لگی تھی-

مگر یہ تو انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اگر عالیہ ان کی نہ ہو سکی تو کیا ہوگا-

ان کے دل پر کیسی قیامت گزر گئی تھی اور عالیہ بے خبر تھی-

وہ اسے ابھی بتا بھی نہیں سکتے تھے-

اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے-

اس کے امتحان ختم ہونے تک وہ اپنے لبوں پر خاموشی کی مہر لگائے رکھنے پر مجبور تھے-

اس اتنی بڑی اذیت کو چپ چاپ سہتے رہنے پر مجبور تھے-

صبح کو ان کی امی نے چہرہ دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ وہ رات بھر سو نہیں سکے ہیں- انھوں نے اپنے بیٹے کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا-

''عثمان بیٹے! تم تو ابھی سے مایوس ہو گئے ہو-''

''انکار تو ہو چکا امی! اب کیا باقی ہے؟'' ان کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ بکھر گئی-

''تمہارے ابو کہہ رہے تھے وہ خود عرفان بھائی سے بات کریں گے-''

''چچی جان جب زبان ہی دے چکی ہیں تو وہ ہرگز نہیں مانیں گی-''

''کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے؟''

عثمان احمد چپ بیٹھے ناشتہ کرتے رہے- آفس جاتے ہوئے برآمدے میں انھیں نسرین ملی- اس کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا-

آفس سے واپسی پر وہ شاہ رخ بھائی کے گھر چلے گئے- شاہ رخ بھائی گھر میں نہیں تھے- سمیرا بھابھی سو رہی تھیں- عالیہ اپنے کمرے میں کھڑکی کے قریب کرسی پر بیٹھی پڑھ رہی تھی- ملازم نے اس کے کمرے کے باہر ہی رک کر اسے عثمان احمد کے آنے کی اطلاع دی اس نے پلٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھا اور کتاب میز پر رکھ کر کھڑی ہو گئی-

ملازم نے عثمان احمد کو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا- چند منٹ بعد عالیہ بھی وہیں آ گئی- اپنے مخصوص انداز میں اس نے آداب کہا اور ان کے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی-

''کیا بات ہے؟ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں، ٹھیک ہے-''

''ٹھیک معلوم تو نہیں ہوتی- چہرہ بہت اترا ہوا ہے-'' عثمان احمد نے ٹالنے کے لیے کہا-

''نیند ٹھیک سے نہیں آئی رات کو-''

''اچھا!! وہ کیوں؟'' عالیہ کی آنکھوں میں حیرت سمٹ آئی-

''بس نہیں آئی-''

''کوئی نہ کوئی سبب تو ہوگا نیند نہ آنے کا-''

''کوئی سبب نہیں-''

''جی نہیں، میں نہیں مانتی-''

''اچھا تو پھر تم ہی بتا دو کیا سبب ہو سکتا ہے؟''

''دیکھیے جناب! یا تو آدمی بہت اداس اور پریشان ہو تو نیند نہیں آتی، طبیعت ٹھیک نہ ہو تب بھی نیند نہیں آتی۔''

پھر وہ مسکرا کر شوخی سے بولی۔

''اور کبھی کبھی آدمی بہت خوش ہو نا! تب بھی نیند نہیں آتی۔''

''اچھا! بڑا تجربہ ہے تمہیں۔'' وہ مسکرائے۔

''اب آپ بتائیے ان تینوں میں سے کون سا سبب ہے؟''

''کس چکر میں پڑی ہو تم کوئی بات نہیں۔''

عالیہ اپنی کہے گئی۔

''اداسی اور پریشانی کی تو بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی طبیعت بھی ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے آپ مارے خوشی کے رات بھر سو نہیں سکے۔''

''خوشی؟ کس بات کی خوشی؟''

''اب یہ تو آپ ہی کو معلوم ہوگا۔''

''احمق ہو تم۔'' وہ صوفے کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے بولے عالیہ نے کہا۔

''اچھا چھوڑیے۔ نہیں بتاتے تو نہ بتائیں لیکن یہ بتانا تو پسند کریں گے کہ کھانا کھا کر آئے ہیں یا نہیں؟''

''نہ کھا کر آیا ہوں نہ کھاؤں گا۔''

'خیریت! یہ بھوک ہڑتال کی کیا سوجھی؟''

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولے

''یہ بتاؤ کہ امتحانوں سے کب فراغت ہوگی تمہیں؟''

''ابھی تو وقت لگے گا۔ کیوں؟''

''تم سے بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔''

عالیہ نے حیرت زدہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ کس قدر الجھے الجھے سے لگ رہے تھے وہ۔

اس نے بہت پوچھا۔ مگر عثمان احمد نے اسے کچھ بھی بتا کر نہ دیا۔ حالانکہ ان کا بہت دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے ذہنی اور دلی کرب کو اس سے نہ چھپائیں۔

اس سے سب کچھ کہہ دیں۔

کچھ بھی نہ چھپائیں اس سے۔

ان کے دل کا بوجھ کچھ تو ہلکا ہو۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس چلے گئے۔

اسی طرح...... جس طرح آئے تھے۔

وہی سارا بوجھ دل و دماغ پر لیے ہوئے۔

پھر عالیہ کے امتحانوں تک وہ شاہ رخ بھائی کے گھر نہیں گئے۔ عالیہ خود بھی نہیں آئی۔ انہیں معلوم تھا۔ وہ دن رات کتابیں پڑھتی رہتی ہوگی۔ وہ چاہتے بھی یہی تھے کہ وہ یکسوئی سے پڑھ کر امتحان دے سکے۔

عثمان احمد نے اور ان کے گھر والوں نے عالیہ کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ وہ اپنی زندگی کے اتنے بڑے فیصلے سے بے خبر تھی۔ لیکن آخر کب تک وہ بے خبر رہتی۔

اس کے امتحان ختم ہوئے تو ایک دن اس کے علم میں بھی یہ بات آ گئی کہ۔

اس کی آئندہ زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔

اس سے کچھ پوچھے بغیر، اس سے کچھ کہے بغیر۔

اور وہ...... جو اپنے مستقبل کے بارے میں بڑی پرامید تھی یہ اچانک خبر سن کر اپنے شیشۂ دل کو چور چور ہونے سے روک نہ سکی۔

سمیرا بھابھی نے اسے بتایا کہ امی جان اب جلد ہی تمہاری شادی کر دینا چاہتی ہیں۔ اختر خالہ نے بچپن میں ہی تمہیں معظم کے لیے مانگ لیا تھا۔

کیسی خلاف توقع خبر تھی اس کے لیے۔

مارے صدمے اور حیرت کے چند منٹ تک وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

پلکیں جھپکائے بغیر سمیرا بھابھی کی طرف اس طرح دیکھتی رہی جیسے اسے اس خبر کی صداقت پر یقین نہ ہو۔

ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں سمیرا بھابھی اس سے مذاق نہ کر رہی ہوں۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ انھوں نے جان بوجھ کر عثمان احمد کے بجائے معظم کا نام لے لیا ہو۔

مگر سمیرا بھابھی کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی دیکھ کر اسے اس خبر کی صداقت پر یقین کر لینا پڑا۔

پھر عالیہ کے چاہنے سے کچھ بھی نہ ہوا۔ عثمان احمد کو ایک آس تھی کہ شاید ان کے ابو کی بات مان لی جائے۔ انھوں نے عرفان چچا سے بات کی مگر عرفان چچا اس معاملے میں بڑے بے بس نظر

آتے تھے ان کے گھر میں وہی ہوتا تھا جو کشور بانو چاہتی تھیں۔ انھوں نے اپنا آخری فیصلہ سنا دیا کہ عالیہ کی شادی معظم سے ہوگی۔ اس کی شادی کی تاریخ بھی طے ہوگئی:

اور عثمان احمد...... ظاہر ہے وہ عالیہ کو اغوا کر کے تو نہیں لے جا سکتے تھے۔ انھوں نے تقدیر کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا۔

عالیہ کی شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ عثمان احمد بہت دنوں سے شاہ رخ بھائی کے گھر نہیں گئے تھے۔ ایک روز انھوں نے صدر میں عالیہ کو دیکھا۔ وہ شاہ رخ بھائی اور بھابھی کے ساتھ شاپنگ کر رہی تھی۔ انھوں نے جلدی سے راستہ بدل دیا اور دوسری گلی میں مڑ گئے۔

گھر آ کر ان کی نگاہوں میں بار بار عالیہ کا چہرہ گھومتا رہا۔ کتنی کمزور نظر آ رہی تھی۔

دوسرے روز دل کو بہت سمجھانے کے باوجود وہ اپنے آپ کو شاہ رخ بھائی کے گھر جانے سے روک نہ سکے۔ عالیہ اکیلی ہی تھی وہ لان میں ٹرانسسٹر سن رہی تھی۔ عثمان احمد کو دیکھ کر اس نے ٹرانسسٹر بند کر دیا۔ وہ قریب آئے تو اس نے ہمیشہ کی طرح مخصوص انداز میں آداب کہا۔

لیکن اس کا چہرہ بجھا ہوا تھا۔

ہونٹوں پر کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔

اس نے عثمان احمد سے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا۔

وہ اس کے سامنے والی کرسی کھسکا کر خود ہی بیٹھ گئے تو اس نے کہا۔

''بھائی جان اور بھابھی جان نہیں ہیں گھر میں۔''

عثمان احمد نے کہا

''لیکن میں تو تم سے ملنے آیا ہوں۔''

عالیہ نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''اب آپ کا مجھ سے ملنا مناسب ہے؟''

''آج کے بعد نہیں آؤں گا۔''

وہ بے اختیار پوچھ بیٹھی

''شادی میں تو آئیں گے نا؟''

''ہاں ضرور آؤں گا۔ دنیا والوں کو تماشا تو نہیں دکھانا ہے۔''

''اپنی شادی میں مجھے بلائیں گے؟''

''اپنی شادی میں۔''

''ہاں۔''

''اپنی شادی ہوگی تو بلاؤں گا۔''

''کیوں؟ کیوں نہیں ہوگی آپ کی شادی؟''

''جس لڑکی کو انجانے میں پسند کر بیٹھا وہ کسی اور کی امانت تھی، اب ہر لڑکی کو تو اس نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔''

''ایک دفعہ اور قسمت آزما لیجئے۔''

''کیا مطلب؟'' وہ چونکے۔

''میرا مطلب ہے اب آپ جس لڑکی کو پسند کریں وہ کسی کی امانت نہ ہو۔''

عثمان احمد ایک ہاتھ سے اپنی پیشانی کو دباتے ہوئے بولے

''اب حوصلہ نہیں قسمت آزمانے کا۔''

''ہمت ہار بیٹھے؟''

''جو چاہو سمجھ لو۔''

پھر...... کئی منٹ گزر گئے۔

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے رہے کتنی خاموشی تھی دونوں کے آس پاس۔

نہ ہواؤں کی سرسراہٹ تھی۔

نہ پتوں کے گرنے کا شور۔

چمپا کے زرد زرد پھول بنا کسی آہٹ اور بنا کسی آواز کے گر رہے تھے۔

چنبیلی کی شاخوں میں کھلی ہوئی ان گنت سفید کلیاں دھیرے دھیرے اپنی پنکھڑیاں کھول رہی تھیں۔

عثمان احمد نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر عالیہ کی طرف دیکھا کتنی خاموش ہو کر رہ گئی تھی وہ باتونی لڑکی۔

بات بات پر ہنسنے والی زندہ دل لڑکی کے ہونٹوں کے آس پاس مسکراہٹ کا گزر تک نہیں تھا۔

زرد چہرہ جس پر خوشی کی کوئی ننھی سی کرن تک نہیں تھی۔

گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی آنکھیں...... جن میں آنے والے لمحوں کے وسوسے اور اندیشے ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔

عثمان احمد نے سوچا۔

وقت کس قدر بے درد ہے اور کتنا ظالم ہے۔

ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اب جو یہ اگلا لمحہ ہماری زندگی میں آئے گا، کیسے مہیب طوفان کو

اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے آئے گا-

ہماری خوشیاں اور ہماری مسرتیں اس چنگھاڑتے ہوئے طوفان میں خس وخاشاک کی طرح بہہ جائیں گی-

ہماری آرزوؤں اور ہماری امیدوں کا رنگ محل آن کی آن میں ڈھے جائے گا-

ہمارے خواب، ہمارے سپنے، وقت کی ان دیکھی سمت آرزوؤں سے ٹکرا ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جائیں گے-

وقت کے سامنے ہم سب کتنے حقیر ہیں-

بالکل مٹی کے کمزور کھلونوں کی طرح جو ذراسی چوٹ لگنے سے ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں-

یہ ہنستا مسکراتا چہرہ بجھا ہوا دیا بن کر رہ گیا ہے-

انھوں نے تاسف بھری نگاہوں سے عالیہ کی طرف دیکھا اور بولے-

''یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''میری حالت؟ ٹھیک ہی ہے-''

''کہاں ٹھیک ہے؟ اس طرح زندگی کیسے گزاروگی؟''

''گزار ہی لوں گی-''

عثمان احمد نے ناصحانہ انداز سے کہا-

''نہیں، یہ غلط ہے- زندگی تو گزارنی ہی ہے، اسے ہنس کر گزارو-''

پھر وہ ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے-

''جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ عالیہ، اسی نشیب وفراز کا نام زندگی ہے-''

پھر وہ خدا حافظ کہہ کر چل دیئے-

اور ایک دن عالیہ کی شادی ہوگئی- اس کے بعد عثمان احمد نے عالیہ کو نہیں دیکھا- عالیہ کی شادی کے بعد وہ تقریباً چار برس ملک میں رہے-

اس دوران انھوں نے سنا، عالیہ کے یہاں ایک بیٹی کی پیدائش ہوئی ہے- پھر وہ سی-اے کرنے ملک سے باہر چلے گئے وہیں انھیں اپنی امی کے خط سے معلوم ہوا کہ عالیہ کے یہاں بیٹا ہوا ہے- جب بھی انہیں عالیہ کے متعلق کوئی خبر ملتی ان کے دل سے یہی دعا نکلتی-

''عالیہ! خدا کرے تم ہمیشہ خوش رہو-''

عثمان چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بن گئے تھے- وقت بڑی تیزی سے گزر گیا تھا- ان کی دونوں بہنوں پروین اور نسرین کے بچے بھی اب تو بڑے ہوگئے تھے- حال ہی میں انھوں نے اپنے بچوں کا

گروپ فوٹو بھیجا تھا- وہ سب کتنے خواہش مند تھے کہ عثمان احمد اب وطن واپس آجائیں- بہنوں کو اپنے بھائی اور ماں باپ کو اپنے بیٹے کے سر پہ سہرا سجانے کا ارمان تھا- مگر ان کا وطن واپس آنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا- سب کے منت اور خوشامد بھرے خطوط پڑھ پڑھ کر انھوں نے وطن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن ساتھ ہی شرط بھی رکھی کہ ان سے شادی کے لیے نہ کہا جائے- گھر والوں نے سوچا کہ چلو اتنا بھی غنیمت ہے کہ انھوں نے وطن واپس آنے کی ہامی تو بھری-

اور جس روز عثمان احمد وطن واپس آئے اس روز عالیہ کی شادی کو پورے گیارہ سال ہوچکے تھے-

بھولی بسری یادوں نے ان کا دامن تھام لیا- دل کو کئی کہانیاں یاد آ گئیں- ایئرپورٹ سے گھر پہنچے تو سب ان کے ساتھ تھے، گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی بے اختیار ان کی نگاہ اوپر چھت کی طرف اٹھ گئی-

تصور میں دو چاند جگمگانے لگے

ایک چاند اوپر...... آسمان کی بلندیوں پر

اور دوسرا چاند...... چھت پر...... ان کی دونوں بہنوں کے بیچ جگمگاتا ہوا-

چمکتا ہوا حسین چاند-

وہ چاند...... جسے وہ غلطی سے اپنے گھر کے آنگن کا چاند سمجھ بیٹھے تھے-

عثمان احمد نے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچا......

جو وقت گزر جاتا ہے، وہ پھر واپس نہیں آتا-

لیکن یادیں...... وہ انمول موتی ہیں جو دل کے سمندر کی تہہ میں کہیں نہ کہیں چھپی رہتی ہیں-

کس قدر قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں یہ یادیں-

وہ سب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے- سب لوگ انہیں اپنے درمیان پاکر بے حد خوش تھے- سب ہنس بول رہے تھے- وہ بھی مسکرا رہے تھے- سب کی باتوں کا جواب دے رہے تھے، لیکن ان کا ذہن جانے درد کی کون کون سی دہلیزوں کو پار کر رہا تھا-

عثمان احمد کئی سالوں بعد وطن واپس آئے تھے- شروع شروع میں انھیں سب کچھ بڑا عجیب عجیب سا لگا لیکن آہستہ آہستہ زندگی ایک معمول پر آ گئی-

عالیہ اسی شہر میں تھی لیکن وہ اس سے نہیں ملے- انھوں نے اپنے آپ کو از سر نو مصروف کر لیا تھا-

کچھ وقت اور گزرا-

ایک شام وہ آفس سے واپس آئے تو انھوں نے بڑی روح فرسا خبر سنی-

عالیہ کے شوہر معظم گاڑی کے حادثے میں ہلاک ہوگئے تھے- ان کے ساتھ ان کا بیٹا عامر بھی تھا

جو شدید زخمی ہوا تھا- ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی سرتوڑ کوشش کر رہے تھے- لیکن عامر کی زندگی کے دن بہت تھوڑے تھے- وہ زخموں کی تاب نہ لا کر چل بسا-

وقت اتنا بڑا گھاؤ دے کر آگے بڑھ گیا- عالیہ کی دنیا اندھیر ہوگئی-

عثمان احمد اپنی امی، ابو، بھابی پروین، نسرین کی زبانی سنتے تھے-

عالیہ بالکل گم صم ہو کر رہ گئی ہے-

اس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے-

شادی کے بعد اس کی صحت بہت اچھی ہوگئی تھی اب تو آدھی بھی نہیں رہی-

عثمان احمد معظم کے جنازے میں تو ضرور شریک ہوئے تھے لیکن اس کے بعد سے انھوں نے عالیہ کے گھر قدم بھی نہیں رکھا تھا- اب تو وہ اپنی عدت کے دن پورے کر کے اپنی بیٹی کے ساتھ شاہ رخ بھائی کے گھر آ گئی تھی- عثمان احمد کو شاہ رخ بھائی کے گھر جانے سے کون روک سکتا تھا لیکن وہ کوئی بھی ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ نہیں تھے جو ان کی یا عالیہ کی رسوائی کا سبب بنتا-

اپنے دامن میں درد والم کی داستان لیے ایک سال گزر گیا- معظم کی برسی ہوگئی-

پھر عثمان احمد نے سنا-

عالیہ کے گھر والے اسے عقد ثانی کا مشورہ دے رہے ہیں- پہلے یہ صرف مشورہ تھا-

آہستہ آہستہ اس مشورے نے اصرار کی صورت اختیار کر لی-

اٹھتے بیٹھتے عالیہ کو سمجھایا جانے لگا-

''عالیہ! یہ پہاڑ سی زندگی بغیر کسی سہارے کے کیسے گزارو گی؟''

''ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے- بتیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے- آج کل تو بیشتر گھرانوں میں اس عمر میں لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں-''

''تمہاری بیٹی کو بھی کسی مضبوط پناہ گاہ کی ضرورت ہے بیٹا ہوتا تو پھر بھی زندگی اس کے سہارے گزاری جا سکتی تھی-''

''تمہاری یہ شکل وصورت، یہ عمر تمہارے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے- زمانہ بہت خراب ہے-''

اور تو اور عالیہ کے بوڑھے ساس سسر بھی اسے یہی مشورہ دے رہے تھے- ان کا کہنا تھا-

ہمارے بیٹے کی زندگی کے دن بس اتنے ہی تھے خدا کی یہی رضا تھی-

لیکن ان کی بہو کس جرم کی پاداش میں اپنی باقی عمر یونہی غموں کو سینے سے لگائے لگائے گزار دے-

اور پھر عقد ثانی نہ خلاف شریعت تھا نہ خلاف قانون-

لیکن عالیہ سب کے مشورے، سب کا اصرار سن کر یا تو پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی یا پھر چیخ پڑتی-

''خدا کے لیے مجھ سے کوئی کچھ نہ کہے- مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں- میں جس حال میں بھی ہوں مجھے رہنے دو-''

وہ لوگوں کے مشوروں کے خلاف احتجاج کرتی تو کچھ دنوں کے لیے خاموشی چھا جاتی لیکن اس کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہو جاتا......

ایک روز عثمان احمد کی امی نے ان سے کہا-

''عثمان بیٹے! اگر تم کہو تو عالیہ کے لیے تمہارا رشتہ لے کر جاؤں-''

عثمان احمد نے حیران ہو کر اپنی امی کی طرف دیکھا- سرور جہاں نے کہا-

''دیکھو نا بیٹے! عالیہ کی کہیں نہ کہیں شادی ہو جانی چاہیے- سبھی کی خواہش ہے، کیا حرج ہے- اگر وہ ہماری ہی بہو بن جائے-

''لیکن امی! جب وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تو آپ سب لوگ کیوں اس بے چاری کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟''

''وہ تو نا سمجھی کی باتیں کر رہی ہے- آخر ایسے کس طرح زندگی گزارے گی؟''

''اپنے جذبات واحساسات کو عالیہ خود ہی اچھی طرح سمجھتی ہوگی- ابھی اس کے زخم تازہ ہیں- اسے سنبھلنے میں وقت لگے گا- آپ سب لوگ کیوں اپنی بات منوانے کے لیے بضد ہیں؟''

عثمان احمد یہ کہتے ہوئے آزردہ ہوگئے-

لیکن جانے کس روز سرور جہاں نے اپنے دل کی بات شاہ رخ بھائی تک پہنچا دی- عالیہ کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچی- اس نے سختی سے انکار کر دیا- لیکن اس کے گھر والوں نے بھی ہمت نہ ہاری-

عثمان احمد کے لیے گھر والوں کے بار بار اصرار سے عالیہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یقیناً عثمان احمد کی خواہش پر وہ لوگ ایسا کر رہے ہیں-

ایک دن عالیہ نے ٹیلیفون پر عثمان احمد کی اچھی طرح خبر لے ڈالی-

''آپ نے آخر یہ کیا سلسلہ شروع کر رکھا ہے؟

جب میں سینکڑوں دفعہ منع کر چکی ہوں کہ مجھے اب شادی نہیں کرنی ہے تو پھر آپ لوگ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے-

جب میں باقی رشتوں کے لیے انکار کر چکی ہوں تو آپ میں ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں جو میں آپ کے لیے ہاں کر دوں گی۔
آپ آخر کس خوش فہمی میں مبتلا ہیں؟''

عالیہ معلوم نہیں اور کیا کیا بکتی جھکتی رہی۔ عثمان احمد اپنی صفائی میں کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ وہ انہیں کچھ کہنے کا موقع دیتی تو وہ کچھ کہتے۔

وہ تو بس اپنی ہی سناتی رہی اور اس کے بعد ٹیلیفون بند کر دیا۔

عثمان احمد نے کتنے عرصے کے بعد اس کی آواز سنی تھی۔ کئی منٹ تک وہ کھوئے کھوئے سے بیٹھے رہے۔

شام تک عثمان احمد نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عالیہ سے خود ملیں گے اور اسے بتائیں گے کہ یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس میں وہ بالکل بے قصور ہیں انھیں جبراً کسی کے اوپر مسلط ہونا پسند نہیں، لیکن اگر عالیہ ذہنی طور پر انہیں قبول کر لے تو ان کے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی کوئی نہیں۔

اس شام وہ شاہ رخ بھائی کے گھر چلے آئے۔ عثمان احمد کو دیکھتے ہی شاہ رخ بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

اپنے چاروں بچوں سے ان کا تعارف کراتے ہوئے شاہ رخ بھائی نے کہا۔

''یہ ہیں تو تمہارے انکل، لیکن اس گھر کا راستہ یہ بالکل ہی بھول گئے تھے۔ آج معلوم نہیں کیسے ادھر آ گئے؟''

عثمان احمد کے چہرے پر نہ کوئی شرمندگی تھی، نہ کوئی مسرت، ہونٹوں پر بے جان سی مسکراہٹ بکھیرے وہ شاہ رخ بھائی کے بڑے بیٹے اشعر سے ہاتھ ملاتے ہوئے دھیمے لہجے میں اس کا حال پوچھتے رہے۔

شاہ رخ بھائی نے اپنی بیٹی ماہ رخ سے کہا

''ماہ رخ بیٹی! اندر جا کر اپنی امی اور عالیہ پھپھو کو بلا لاؤ۔''

برآمدے کی سیڑھیاں اترتی ہوئی ایک دس گیارہ سال کی بچی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاہ رخ بھائی نے کہا۔

''یہ عالیہ کی بیٹی ہے عثمان!''

پھر انھوں نے بڑے پیار سے اسے اپنے قریب بلا کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

''بیٹی! یہ تمہارے انکل ہیں۔''

''آداب!'' اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

وہ عالیہ کی ہم شکل تھی۔ عثمان احمد چند سیکنڈ اس کی طرف دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد سمیرا بھابھی بھی باہر لان میں آ گئیں لیکن عالیہ نہیں آئی۔

عثمان احمد تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر جانے کے لیے اٹھے تو شاہ رخ بھائی نے کہا۔

''اگر تم عالیہ سے ملنا چاہو تو اندر جا کر مل لو۔''

عثمان احمد نے صاف گوئی سے کہا۔

''مجھے اور تو کچھ نہیں کہنا، بس صرف اپنی صفائی پیش کرنی ہے۔''

شاہ رخ بھائی نے حیران ہو کر پوچھا

''کس بات کی صفائی؟''

''آج دوپہر عالیہ نے مجھے ٹیلیفون کر کے خاصی خبر لے لی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آپ لوگ میرے اکسانے پر انھیں شادی کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔''

سمیرا بھابھی نے کہا

''وہ بے چاری اصل میں ذہنی طور پر پریشان ہے۔''

شاہ رخ بھائی افسردہ ہو کر بولے۔

''عالیہ تو بہت ناسمجھی کی بات کر رہی ہے عثمان، تم ہی بتاؤ ہم اس کی بات مان کر اسے اس کے حال پر کیسے چھوڑ دیں۔''

عثمان احمد نے کہا

''لیکن جبر کرنا بھی تو مناسب نہیں۔''

شاہ رخ بھائی نے کہا

''بہرحال شادی تو ہمیں اس کی کہیں نہ کہیں کرنی ہے۔ تم ہی اسے سمجھاؤ، شاید تمہاری بات مان لے۔''

سمیرا بھابھی نے کہا

''عثمان بھائی! آپ کا بڑا احسان ہوگا اگر آپ عالیہ کو سمجھا کر کسی طرح اسے آمادہ کر سکیں۔''

عالیہ کی شادی کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہوئے وہ تینوں اس وقت یہ بھول ہی گئے کہ اس کی بیٹی قریب ہی بیٹھی ہے۔

وہ ایک دم بول پڑی

''نہیں۔ میری امی شادی نہیں کریں گی۔ وہ تو بس میرے ابو کو ہی یاد کرتی رہتی ہیں۔''

شاہ رخ بھائی نے ایک دم اسے سینے سے لگا لیا اور بولے

''تم ابھی بہت چھوٹی ہو ان سب باتوں کو سمجھنے کے لیے۔''

لیکن وہ اپنی کہے گئی۔
''اگر میری امی نے شادی کر لی تو میں کس کے پاس رہوں گی؟''
سمیرا بھابھی نے کہا۔
''تم اپنی امی ہی کے پاس رہو گی بیٹی۔''
''نہیں ممانی جان! میری سہیلی عذرا کی امی نے شادی کر لی تھی، عذرا کے دوسرے ابو اسے بالکل پیار نہیں کرتے۔''
شاہ رخ بھائی نے کہا
''نہیں بیٹی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ اسے ضرور پیار کرتے ہوں گے، آخر وہ اس کے ابو ہیں۔''
''ماموں جان! وہ اس سے پیار نہیں کرتے۔ عذرا بتا رہی تھی کہ اس کے ابو کہتے ہیں، اس سے میری کیا رشتے داری ہے؟ نہ یہ میری بیٹی ہے نہ میں اس کا باپ۔''
شاہ رخ بھائی نے اس کی توجہ دوسری طرف کرتے ہوئے کہا۔
''اچھا تم جا کر اپنے بھائیوں، بہنوں کے ساتھ کھیلو۔ دیکھو وہ لوگ شاید تتلی پکڑ رہے ہیں۔''
وہ سب کچھ بھول کر اڑتی ہوئی رنگ برنگی تتلی کی طرف بھاگ گئی۔
عثمان احمد اندر چلے گئے۔
دو، تین دفعہ دستک دینے پر عالیہ اٹھ کر دروازے کے قریب آئی۔ عثمان احمد کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گئی۔ شاید سوچ رہی تھی۔ انھیں اندر بلائے یا نہ بلائے۔ آخر کار چند سیکنڈ کے بعد اس نے ایک طرف ہٹ کر انھیں اندر آنے کا راستہ دیا۔
''تشریف رکھیے۔'' اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
عثمان احمد اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کتنی بدل گئی تھی وہ۔
سفید ململی ساڑی۔
بکھرے ہوئے بال۔
اجڑا ہوا چہرہ۔
آنکھوں کے گرد گہرے گہرے حلقے۔
عثمان احمد اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹانا بھول گئے ان کا ذہن بھٹک گیا۔
یادوں کے دریچے وا ہو گئے۔
وقت کی اڑتی ہوئی دھول کے پیچھے سے ایک چاند سا چہرہ جگمگا رہا تھا۔
رم جھم برستی پھوار میں دو صاف شفاف ہاتھ کہنیوں تک بھیگے جا رہے تھے۔

سرخ و سنہری چوڑیوں سے قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ ایک دھیمی مدھر آواز کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔
''آپ کو بارش کیسی لگتی ہے؟''
عالیہ پوچھ رہی تھی۔
''کیسے آنا ہوا؟''
وہ چونک پڑے اور بولے۔
''میں تمہاری غلط فہمی دور کرنے آیا ہوں۔''
''کیسی غلط فہمی؟''
پھر...... عثمان احمد اپنی صفائی میں جو بھی کہہ سکتے تھے کہتے رہے۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہی۔
عثمان احمد نے کہا۔
''سنو عالیہ! میں سچ مچ جبر اور زبردستی کا قائل نہیں لیکن اگر زندگی کے کسی لمحے میں تم ذہنی طور پر میرے بارے میں سوچنے پر خود کو آمادہ کر سکو تو یہ میرے لیے بہت بڑی خوش نصیبی ہو گی۔''
عالیہ نے کہا
''شاید میری زندگی میں ایسے لمحے کبھی آ ہی نہ سکیں۔''
عثمان احمد نے کہا۔
''وقت بڑی عجیب چیز ہے۔ ہم بالکل نہیں جانتے کہ آنے والے لمحوں میں کیا ہو جائے گا؟''
تو یہ سچ ہی ثابت ہوا۔
وقت نے جانے کس انداز سے کروٹ بدلی۔
عالیہ بار بار سختی سے انکار کرنے کے باوجود عثمان احمد کی ہو گئی وہ اپنی تقدیر کے لکھے کو نہیں مٹا سکتی تھی۔
اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ ایک بار اور سیج سجائے۔
سو وہ مجبور ہو گئی۔
عثمان احمد بہت مطمئن تھے۔
لیکن عالیہ...... وہ مہینوں تک اپنے آپ کو نہ سمجھا سکی۔ نہ سنبھال سکی۔
اس کے نزدیک یہ تقدیر کا ایک مذاق تھا
بہت بھیانک مذاق۔
تقدیر کے اس مذاق کے ساتھ سمجھوتہ کرنا اسے بہت دشوار لگتا تھا۔
مگر وقت...... اس کے انداز انوکھے ہیں۔

وہی زخم بھی دیتا ہے وہی مرہم بھی-
وہی درد بھی دیتا ہے اور وہی درماں بھی بنتا ہے-
عالیہ نے بھی حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا-
عثمان احمد کی رفاقت میں زندگی کسی اور ہی انداز سے گزرنے لگی-

عالیہ کو عثمان احمد سے ہر خوشی ملی مگر عثمان احمد کی محرومی کا احساس اسے کبھی کبھی آزردہ کردیتا تھا- ان کی قسمت میں اولاد کی خوشی نہیں لکھی تھی- عالیہ کے یہاں تین بیٹوں کی ولادت ہوئی مگر وہ دو، تین مہینوں سے زیادہ نہ جی سکے- آخری بیٹے کی پیدائش کے وقت کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوگئیں کہ عالیہ پھر ماں بننے کے قابل ہی نہ رہی-

عالیہ کو اس بات کا بہت دکھ تھا مگر عثمان احمد کو اس کی خوشی، اس کی زندگی بہت عزیز تھی- عالیہ جب بھی اس بات کا تذکرہ کرتی تو عثمان احمد ہنس کر کہتے-

''ایسی بات مت کہا کرو عالیہ! مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے افشاں میری بیٹی نہیں ہے؟ بیٹیاں بیٹوں سے زیادہ پیاری ہوتی ہیں- بیٹیاں ہمدرد، غمگسار، دکھ درد اور تنہائی کی ساتھی ہوتی ہیں-''

عثمان احمد افشاں کو سچ مچ بے پناہ چاہتے تھے- ان کی نئی کوٹھی بن کر تیار ہوئی تو اس کا نام بھی انھوں نے افشاں کے نام پر ''افشاں کاٹیج'' رکھا- ان کے ہر انداز سے عیاں تھا کہ وہ افشاں کو دیوانہ وار چاہتے ہیں- افشاں بیٹی، افشاں بیٹے کہتے ان کی زبان ہی نہیں تھکتی تھی-

وہ تھی بھی بڑی خاموش طبیعت اور چپ چاپ سی لڑکی اپنے جذبات کا اظہار کرنا شاید اس نے سیکھا ہی نہیں تھا-

شاہ رخ بھائی اپنی فیملی کے ساتھ سعودی عرب جابسے تو وہ اور بھی گم صم سی ہوگئی- لیکن جب کچھ عرصے بعد اس کی بڑی خالہ...... فاخرہ آپا، چھوٹے ماموں...... انجم بھائی کراچی آگئے تو اس کی خاموشی ختم ہوئی اور جب اس کی پھوپھی گلناز بیگم بھی برسوں بعد ایران سے وطن واپس آگئیں تو اس کا چہرہ کچھ اور کھل اٹھا، لیکن اس کے چہرے پر یہ کیفیت اپنی خالہ، ماموں اور پھوپھی کی موجودگی ہی میں نظر آتی تھی- گھر میں تو اس کا وہی انداز خاموشی تھا-

وقت کا ایک طویل کارواں گزر گیا- سب کی اولادیں جوان ہوگئی تھیں- افشاں بھی بڑی ہوکر بالکل عالیہ کی طرح خوبصورت نکلی تھی-

عثمان احمد کی زندگی میں خزاں کی ایک شام ایسی آئی کہ ان پر درد کا ایک کوہ گراں آپڑا-
عالیہ ان سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی-
کبھی نہ آنے کے لیے-

اس نے آنکھیں بند کرلیں
کبھی نہ کھولنے کے لیے
عثمان احمد کا دماغ ماؤف ہوگیا-
ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ......
اپنے آپ کو سنبھالیں
یا افشاں کو سنبھالیں
عالیہ کا سوئم، دسواں، بیسواں اور چالیسواں ہوگیا-
وقت کسی طرح گزر گیا تھا-
درد کے اس جلتے صحرا میں وہ تنہا نہیں تھے-
افشاں بھی تو تھی...... عالیہ کی نشانی

انھوں نے یہ سوچ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ ان کے پاس ان کی بیٹی تو تھی- ان کے درد دکھ اور ان کی تنہائیوں کی ساتھی-

پرسے کے لیے آئے ہوئے لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے- تب ایک روز وہ حیران رہ گئے، بات ہی حیران ہونے کی تھی افشاں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ ہاسٹل میں رہے گی- اس کا کہنا تھا کہ ہاسٹل میں رہنا اس کی دیرینہ خواہش ہے- بقول اس کے اس نے عالیہ سے کئی بار اپنی اس خواہش کا ذکر کیا تھا، لیکن اس نے انکار کردیا- عثمان احمد سوچ میں پڑ گئے-

انھوں نے اسے بہت سمجھایا
اپنے اکیلے پن اور گھر کی تنہائی کا احساس دلایا
مگر افشاں کے اوپر کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا-
اس کا انداز التجا کرنے کا سا تھا-
عثمان احمد مجبور ہوگئے-
پھر انھوں نے افشاں کو سمجھانے کے بجائے اپنے آپ کو سمجھایا-
''میں اتنا خود غرض کیوں ہوگیا ہوں؟''
محض اپنی تنہائی اور اکیلے پن کی خاطر اسے ہاسٹل میں رہنے کی اجازت نہیں دے رہا-
ایک طرف تو اس سے بے پناہ محبت کا دعویٰ اور دوسری طرف یہ انداز کہ اس نے پہلی بار کسی خواہش کا اظہار کیا تو اسے پورا کرنے سے انکار-''
انھوں نے اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتے ہوئے افشاں کو ہاسٹل میں رہنے کی اجازت دے دی-

ہاسٹل میں شفٹ ہونے کے بعد سے افشاں نے یہ انداز اختیار کیا تھا کہ وہ جمعرات کی شام کو بجائے۔ ''افشاں کاٹیج'' آنے کے کبھی اپنی خالہ فاخرہ آپا کے گھر چلی جاتی اور کبھی اپنی پھوپھی گلنار بیگم کے گھر رہ جاتی۔

عثمان احمد سے ملنے کے لیے وہ جمعہ کی صبح کو نو، دس بجے آتی اور شام ڈھلنے سے پہلے واپس چلی جاتی۔ عثمان احمد وہ پورا ہفتہ انگلیوں پر گن گن کر گزار دیتے مگر جب وہ آتی تو اس قدر محتاط رہتی اور نپی تلی بات کرتی کہ وہ بھی چپ ہو کر رہ جاتے۔

عثمان احمد سمجھتے تھے کہ خاموش رہنا اس کی عادت ہے اور ادھر عالیہ کی وفات کے بعد سے اس کی اور بھی زیادہ خاموشی کو وہ سمجھتے تھے کہ اس کو اپنی ماں کی موت کا بہت دکھ ہے۔

مگر آج افشاں کی ڈائری کے چند اوراق پڑھ کر ان کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔

پردہ ہٹ گیا تھا۔

رخ پر پڑا ہوا نقاب الٹ گیا تھا۔

وہ...... جسے دیکھ کر عثمان احمد جیتے تھے۔

وہ...... جس کی موجودگی کے احساس نے ان کے دل سے اپنے تینوں بیٹوں سے محرومی کا احساس مٹا دیا تھا۔ وہ ان سے کتنی دور تھی۔

اس نے لکھا تھا کہ

''میرے اور ان کے درمیان بھلا رشتہ ہی کیا ہے؟

وہ میرے باپ نہیں، میں ان کی بیٹی نہیں۔

وہ تو صرف میری امی کے شوہر ہیں۔ دوسرے شوہر۔

اپنی امی کے دوسرے شوہر کو اپنا باپ کہتے ہوئے میرا اعتماد ہمیشہ ہی متزلزل رہا ہے۔

باپ اور بیٹی کا رشتہ تو بڑا مقدس رشتہ ہوتا ہے۔

اس رشتے پر تو اندھا اعتماد ہوتا ہے۔

کبھی بھولے سے بھی ذہن میں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ شخص سچ مچ ہمارا محافظ ہے بھی یا نہیں؟

یہ ہماری پناہ گاہ ہے بھی یا نہیں؟

جبکہ عثمان صاحب کے وجود سے ہی میں ہمیشہ خائف رہی ہوں۔

بے پناہ ڈری ہوئی، سہمی ہوئی۔

جب بھی اپنے ذہن کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہا کہ عثمان صاحب میرے باپ ہیں، دل میں ان بے شمار پڑھے ہوئے قصوں کا خیال آ جاتا جن ماؤں کے دوسرے شوہر ان کی بیٹیوں کے محافظ

نہیں، لٹیرے ثابت ہوتے ہیں۔

دل کو بار بار سمجھایا کہ دنیا ابھی اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی۔

پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔

لیکن یہ وہم، یہ ڈر، یہ خوف کبھی دل و دماغ سے نکلا ہی نہیں کہ یہ جو میری امی کے دوسرے شوہر کا روپ ہے...... بے حد شفیق، مہربان اور محبت کرنے والے باپ کا، یہ بالکل جھوٹا ہے

ایک خول چڑھا ہوا ہے۔

کسی بھی لمحے یہ خول اترے گا اور میرے سامنے شفیق مہربان محبت کرنے والے باپ کے بجائے ایک لٹیرا کھڑا ہوگا، ایک بھیڑیا کھڑا ہوگا۔

بس! اس لمحے کے تصور سے خوفزدہ ہو جاتی ہوں۔

وحشت زدہ ہو جاتی ہوں۔''

الفاظ تھے کہ سنسناتے ہوئے تیر۔

جملے تھے کہ تیز نوکیلے برچھے۔

تحریر تھی کہ بھٹی میں تپائی ہوئی گرم گرم سلاخیں۔

سنسناتے ہوئے تیر عثمان احمد کے دل میں پیوست ہو گئے تھے تیز نوکیلے برچھے دماغ میں چبھ گئے تھے۔

اور تپائی ہوئی گرم گرم سلاخیں ان کے وجود کو سرتاپا داغ دار کیے دے رہی تھیں۔

اپنے بستر پہ آڑے ترچھے لیٹے وہ سوچے جا رہے تھے۔

خداوندا! تمام عمر کی شرافت اور پارسائی کا یہ صلہ!

انسان کتنا حقیر ہے؟ اور کتنا بے بس؟

میں تو سمجھتا تھا کہ دوسری بیوی ہونا ہی پل صراط پر چلنا ہے غریب عورت تمام عمر ٹیڑھی ترچھی نگاہوں کے وار سہتی رہتی ہے۔

لیکن آج احساس ہوا کہ دوسرا شوہر ہونا بھی شاید نا قابل معافی جرم ہے۔

میں تو اپنے دل اور اپنی روح کی تمام تر پاکیزگیوں کے باوجود آج خود اپنی ہی نگاہوں میں گر گیا ہوں۔

میری عمر کی یہ منزل...... جب کہ شاید زندگی سے لحد کا فاصلہ بھی بہت مختصر رہ گیا ہے۔ اور......

روح کا اتنا شدید گھاؤ......!

اس گھاؤ اس زخم کو میں سہار بھی سکوں گا؟

یہ میری شفقتیں، یہ میری محبتیں، یہ میرے جذبات ...... سچے موتیوں کی طرح آبدار...... میرے

معبود تو گواہ رہنا-

ان کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے، دو آنسو کنپٹیوں سے بہتے ہوئے ان کے سفید بالوں میں جذب ہو گئے-

انہوں نے انگلیوں کی پوروں سے آنکھوں کے گوشوں کو صاف کیا اور اٹھ کر دریچے میں آ گئے-

کتنا وقت گزر گیا تھا سوچوں کی رہگزر پہ چلتے چلتے-

رات کی سخت و سیاہ بانہیں ہر سمت پھیلی ہوئی تھیں سرسراتی ہوئی ہواؤں میں بڑا المناک سا شور تھا-

دم بخود پتے ہر لمحے چونک چونک پڑتے تھے-

چمپا کے وہ پھول بنا آہٹ کے دریچے کی چوکھٹ پہ آ گرے- بادام کے درخت سے جھڑتے ہوئے چند سوکھے پتے جانے کون سا درد بھرا راگ سناتے ہوئے ہوا کے دوش پر آگے بڑھ گئے-

نیلے آسمان پر چمکتا ہوا چاند-

چاندنی کا برستا ہوا غبار

پھولوں کی مہک

سب کچھ انہیں بے کل لگ رہا تھا-

عثمان احمد نے پلٹ کر بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے اپنی اور عالیہ کی تصویر اٹھالی- چند سکینڈ اسے دیکھتے رہے اور پھر بے دلی سے...... اسے بستر پہ ڈال دیا-

پھر انھوں نے ایک فیصلہ کر لیا-

وہ کل ہی ہاسٹل جا کر افشاں سے کہہ دیں گے-

افشاں! اگر میری ذات پر تمہارا اعتماد اس قدر متزلزل ہے تو تمہیں سچ مچ اس گھر میں ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رہنا چاہیے- تم آزاد ہو...... جہاں چاہو رہو...... اپنی خالہ کے یہاں، اپنے ماموں کے یہاں یا اپنی پھوپھی کے یہاں-

میں اپنی باقی ماندہ زندگی تنہائیوں سے سمجھوتہ کر کے گزار دوں گا پورے ہفتے جب تم یہاں نہیں ہوتیں ویرانی ہی برستی ہے- تمہارے انتظار میں ایک ایک دن انگلیوں پر گنتے ہوئے بھی تو مجھے یہ احساس رہتا ہے کہ یہاں سناٹے گونجتے ہیں-

اس گھر کی قسمت میں اگر یہی لکھا ہے تو یونہی سہی بے شک یہاں سناٹے گونجتے رہیں-

میں گیا وقت نہیں

جون 1980ء

آنگن میں بچھی چارپائی پر آڑی ترچھی لیٹی وہ سوچ رہی تھی- جب بالکل فرصت ہی فرصت ہو تو ذہن کو سوچنے سے کیسے باز رکھا جا سکتا ہے-

اس وقت اسے کوئی بھی کام نہیں تھا-

اور پھر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ گھر میں بھی کوئی نہیں تھا-

تنہائی کے سمندر میں قطرہ قطرہ گرتے ہوئے لمحے اس کے لیے بے حد اذیت ناک ہو گئے تھے-

سورج غروب ہونے میں ابھی خاصی دیر باقی تھی-

آنگن میں لگے ہوئے چمپا کے درخت پر چڑیوں نے ایک شور مچا رکھا تھا-

عروسہ نے سوچا-

معلوم نہیں ان کے لیے ایسی کون سی خوشی کی بات ہے جو بے تحاشا چہکے جا رہی ہیں-

آنگن میں بنی ہوئی کیاریوں میں لگے پودے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے جھومے جا رہے تھے-

چمپا کے زرد پھول بنا کسی آواز کے نیچے فرش پر گرتے اور ہوا کا کوئی جھونکا انہیں اڑا کر ایک سرے سے دوسرے سرے پر لے جاتا-

وہ کتنی دیر سے لیٹی ہوا اور پھولوں کا یہ کھیل دیکھے جا رہی تھی اور اپنے ذہن کو پریشان سوچوں سے آزاد کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

کسی کسی وقت تو یہ ہوتا کہ نگاہیں پھولوں پر جمی ہوتیں اور ذہن بھٹک بھٹک کر کہیں سے کہیں پہنچ جاتا۔

دور کہیں۔کسی گھر میں شاید شادی کا ہنگامہ تھا.....ریکارڈنگ ہو رہی تھی۔بابل کے گیت سن سن کر عروسہ کے کان پک گئے تھے۔

اس نے دل ہی دل میں کئی بار ریکارڈ بجانے والوں کو لعنت ملامت کی۔

آخر کیوں بجائے جاتے ہیں یہ ریکارڈ شادی بیاہ کے موقع پر۔کون سی خوشی ملتی ہے انہیں سن کر؟

دل کو ایک بے نام سے دکھ کا ہی احساس ہوتا ہے۔عروسہ نے سوچا۔

سب کہتے ہیں میری سوچوں کا انداز بڑا عجیب و غریب ہے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے گھر کے آنگن میں کبھی شہنائیاں نہیں گونجیں۔

یہاں کے در و دیوار نے کبھی ڈھولک کی تھاپ نہیں سنی۔

بابل کے گیتوں کی آواز یہاں کبھی بلند نہیں ہوئی۔

پہلے تو عروسہ کو اس بات پر شبہ ہی تھا کہ شاید گھر کے آنگن میں شہنائیوں کی آواز کبھی گونج ہی نہ سکے۔

شاید یہاں کے در و دیوار کبھی ڈھول کی تھاپ سن ہی نہ سکیں۔

شاید بابل کے گیتوں کی صدا یہاں بلند ہی نہ ہو۔

مگر اب.....

ادھر ایک' دو سال سے اس کا شبہ یقین کی حدوں کو چھونے لگا تھا۔

ہر نیا سال شروع ہونے پر وہ حساب لگاتی کہ اس کی عمر کے تناور درخت سے ایک اور سال سوکھے پتے کی طرح جھڑ چکا ہے۔اب وہ اتنے برس کی ہو گئی ہے۔

ایسے ہی جانے کتنے سال آئیں گے اور گزر جائیں گے۔

جو گزر جاتے ہیں' وہ واپس پلٹ کر نہیں آتے۔ہر گزر جانے والا سال زندگی اور موت کے درمیان فاصلے کو کچھ اور کم کر دیتا ہے۔

عروسہ اچھی طرح جانتی تھی۔

اسے اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ اس کا وجود گھر والوں کی نگاہوں کے سامنے ایک پہاڑ کی مانند ہے۔

بہت مضبوط اور بلند و بالا پہاڑ۔

جو اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی اپنی جگہ سے سرک نہیں سکا تھا۔

ایک' دو سال پہلے تک تو وہ سوچتی تھی کہ شاید اس گھر میں کبھی کوئی زلزلہ بھی نہیں آئے گا۔

لیکن اب تو جیسے اسے یقین سا ہو چلا تھا۔

اس کے آگے کس قدر اندھیرا تھا۔

مستقبل بالکل تاریک نظر آتا تھا۔

اس کی فکر میں گھلتے گھلتے ابا کے شانے وقت سے پہلے ہی جھک گئے تھے۔

اس کی مانگ میں چمکتی ہوئی افشاں کو دیکھنے کی حسرت میں اماں پر وقت سے پہلے ہی بڑھاپا طاری ہو گیا تھا۔

بھائی اس کے متعلق کبھی کبھی اتنی شدت سے سوچتے کہ انہیں اپنا دماغ ماؤف ہوتا ہوا محسوس ہوتا۔

دونوں چھوٹی بہنوں کی نگاہوں میں اترتی ہوئی سوچیں بعض اوقات اتنی طویل ہو جاتیں کہ عروسہ یہ سوچے بغیر نہ رہتی کہ عنبر اور افشاں کی سوچوں کا سرا اپنے اپنے مستقبل سے جا کر ملتا ہے۔

اور پھر وہ اس انداز سے کیوں نہ سوچتیں؟

وہ بھی لڑکیاں تھیں۔

ان کے سینے میں بھی دل تھے۔

ان کے بھی کچھ خواب تھے' کچھ آرزوئیں تھیں۔

شادی کا ارمان کس لڑکی کو نہیں ہوتا۔

کون سی لڑکی ہے جو اپنی زندگی کے ہمسفر کے بارے میں کبھی نہیں سوچتی۔

ہر لڑکی کے ذہن میں زیادہ دیر کے لیے نہ سہی' محض چند منٹ اور چند لمحوں کے لیے ہی یہ خیال آتا ہوگا کہ۔

کبھی اس کے ماتھے پر بھی ٹیکہ سجے گا۔

اس کی مانگ میں بھی افشاں چمکے گی

مگر عنبر اور افشاں کے یہ سہانے خواب تو اب حسرتوں میں بدلتے جا رہے تھے اور اس کا سبب کوئی اور نہیں وہ خود تھی....عروسہ۔

یوں اگر دیکھا جاتا۔

اگر سوچا جاتا تو وہ بے چاری قصوروار ہرگز نہیں تھی۔

ارمانوں اور حسرتوں کا یہ سارا کھیل تو اوپر والے کا تھا۔

قسمتوں کا بنانے اور بگاڑنے والا تو وہ خود ہی تھا۔

زمین پر بسنے والے بھلا کیسے جان سکتے تھے کہ اوپر والے نے ان کی قسمت میں کیا لکھا ہے۔

وہ تو بس ہر لمحے آس کا ایک دیپک جلائے دن پر دن گزارے جاتے ہیں۔

اپنی بہنوں کے چہروں پر نگاہ پڑتی تو عروسہ سوچتی۔

خداوندا! آخر ان دونوں کا کیا قصور ہے؟

میری وجہ سے یہ دونوں کب تک اس عذاب کو جھیلیں گی۔ وہ حساب لگا کر سوچتی۔

اڑتیس سال کی تو میں ہی ہوگئی ہوں۔ پھر دو، دو سال کم کر کے اپنے آپ سے چھوٹے دونوں بھائیوں کی عمروں کا اندازہ کرتی تو اسے احساس ہوتا کہ بتیس سال کی افشاں اور تیس کی عنبر ہوگئی ہے۔

اس کا دل اتنی بری طرح ہول کھاتا کہ اس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا۔

وہ خوبصورت نہیں تھی تو بدصورت بھی نہیں تھی۔

اس نے بارہا آئینے میں بے حد تنقیدی نگاہوں سے اپنا جائزہ لیا تھا۔

رنگ سرخ و سفید نہیں تھا تو سانولا بھی نہیں تھا۔

ناک نقشہ بھی اچھا خاصا تھا۔ جاہل ہونے کا طعنہ بھی اسے نہیں دیا جا سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ماں باپ کے شانوں پر ایک بار گراں بنی ہوئی تھی۔

دوسری لڑکیوں کی طرح دلہن بننے کا ارمان اب اس کے دل میں نہیں رہا تھا۔

اپنے ماتھے پر ٹیکہ سجانے کا خواب دیکھنا اب اس نے چھوڑ دیا تھا۔

اپنی مانگ کو سنہری روپہلی افشاں سے جگمگانے کا سپنا دیکھنا اب اس نے چھوڑ دیا تھا۔

اب تو اسے بس یہی فکر تھی کہ میری شادی نہ ہوئی تو نہ سہی' افشاں اور عنبر تو اپنے اپنے گھر کی ہو جائیں۔ میری فکر میں گھل گھل کر نجم اور اسلم کیوں اپنی صحت خراب کیے جا رہے ہیں۔

اس نے کتنہ دفعہ اماں کو سمجھایا تھا کہ آپ نجم اور اسلم کا ہی گھر بسا دیں۔ بہوئیں لے آئیں۔ گھر میں کچھ تو رونق ہوگی اس گھر سے قنوطیت کے بادل چھٹیں گے تو ماحول کی گھٹن بھی دور ہو جائے گی۔ دونوں بھائی خوش شکل' اعلیٰ تعلیم یافتہ اور برسرِ روزگار تھے۔ کتنے ہی لوگ اپنی اپنی بیٹیوں کے لیے ان پر نگاہ جمائے بیٹھے تھے۔

کیسی آس تھی ان کی نگاہوں میں۔

کہ شاید ان کی بیٹیوں کے نصیب اس گھر میں کھل جائیں۔

مگر اماں کا ایک ہی جواب تھا کہ ''نہیں''۔

''تین جوان جہان بیٹیوں کے ہوتے ہوئے میں گھر میں بہوئیں کیسے لے آؤں؟''

اماں کی عقل بڑی دور تک کی بات سوچتی تھی۔ وہ صاف صاف کہتی تھیں۔

''جمعہ جمعہ آٹھ دن کے بعد ہی دیکھ لینا' اس گھر میں ہنگاموں اور فساد کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔''

عروسہ انہیں سمجھاتی۔

''لیکن اماں! یہ تو سراسر خود غرضی ہے۔ آخر نجم اور اسلم کون سے جرم کی پاداش میں اپنا گھر بسانے سے محروم رہیں گے؟''

اماں اعتراف کرتیں۔

''ہاں! میں مانتی ہوں کہ یہ خود غرضی ہے۔ مگر کبھی کبھی انسان خود غرضی کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔''

ایسے میں اگر افشاں ہوتی تو وہ بھی چپ نہ رہ سکتی۔

''آپ کو اپنی سوچوں کا انداز بدلنے کی کوشش کرنی چاہیے اماں۔''

''میں اپنی سوچوں کا انداز نہیں بدل سکتی بیٹی! تم دیکھ لینا کہ یہ جو تھوڑا بہت سکون اس گھر میں نظر آ رہا ہے' وہ بھی ختم ہو جائے گا۔''

عروسہ تنگ آ کر کہتی۔

''ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ آپ سوچ رہی ہیں وہ ٹھیک ہی ہو۔''

افشاں بھی اس موقع پر دخل اندازی کرنا ضروری سمجھتی۔

''ہم تینوں بہنیں کسی پر بوجھ تھوڑی ہیں اماں! ہم سروس کرتے ہیں۔ پھر بھلا آنے والی کو ہمارا وجود ناگوار کیوں گزرے گا؟''

اماں چڑ جاتیں۔

''اونہہ! چھوڑو ان باتوں کو' تم لوگ نہیں سمجھو گی۔''

عروسہ خوشامد پر اتر آتی۔

''اماں! آپ دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک کی شادی کر کے تو دیکھیے۔ تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے؟''

افشاں بڑی سنجیدگی سے کہتی۔

''یہ تو سراسر ظلم ہے نجم اور اسلم بھائی پر۔''

''ظلم ہے تو ظلم ہی سہی-''
اماں پر کسی بات کا اثر نہ ہوتا-
عروسہ نرمی سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی-
''آپ غلطی کر رہی ہیں' آپ کو احساس ہی نہیں ہے! افشاں اور عنبر کے لیے دو' تین اچھے اچھے رشتے آئے' لیکن آپ نے یہ کہہ کر ان پر توجہ نہیں دی کہ بڑی کے ہوتے ہوئے دونوں چھوٹیوں کی کیسے کر دوں؟''
''ہاں تو میں نے کوئی غلط تو نہیں کیا' ٹھیک ہی کیا-''
اماں پھر بھی ہار نہ مانتیں-
عروسہ حیران ہو کر پوچھتی-
''آپ سمجھتی ہیں آپ نے ٹھیک کیا؟''
''ہاں تو اور کیا-''
''افوہ!'' عروسہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر کہتی' ''ذرا سوچیے تو سہی' اسی چکر میں افشاں اور عنبر کی اتنی عمر ہو گئی-''
افشاں چپ چاپ اٹھ کر وہاں سے چل دیتی-
یہ بحث کوئی ایک دو دن کی نہیں تھی- آئے دن کا قصہ تھا یہ- طویل طویل بحث ہوتی اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا-
عروسہ محسوس کرتی تھی-
گھر میں سب ایک دوسرے سے بیزار رہتے تھے- سب کے مزاجوں میں چڑچڑا پن آ گیا تھا-
زبانوں میں تلخی سما گئی تھی-
نجم اور اسلم اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر دوستوں میں ہی گزارتے تھے- گھر میں ان کی دلچسپی کا سامان ہی کون سا تھا-
ابا کو یہ فکر تھی کہ دونوں لڑکے کہیں آوارہ مزاج نہ ہو جائیں- کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ غلط صحبتوں میں پڑ جائیں-
اکثر اماں کو سمجھاتے-
''ذرا عقل سے کام لو نیک بخت! کہیں ایسا نہ ہو کہ لڑکیوں کی خاطر لڑکوں کو ہی ہاتھ سے کھو بیٹھو- لڑکوں کو بگڑتے دیر نہیں لگتی-''
مگر معلوم نہیں اماں کی عقل کو کیا ہو گیا تھا-

لوگ باتیں بناتے تھے-
کوئی محفل ہو' کوئی موقع ہو' وار کرنے سے نہیں چوکتے تھے-
کہنے والے پیٹھ پیچھے بھی کہتے تھے اور منہ پر بھی کہتے تھے-
بھری محفل میں تینوں بہنوں کی عمروں کا حساب لگانے سے بھی نہیں چوکتے تھے-
اماں کے دل میں جلتے ہوئے آس کے دیے کو یہ کہہ کر بجھانے کی کوشش کرتے تھے-
''ارے! بیٹوں کی ہی شادی کر دو- اب تمہاری بڑی لڑکی کا نصیبہ تو کھلنے سے رہا-''
یہ بات نہیں تھی کہ عروسہ کی زندگی کے آنگن کی طرف بہاروں نے کبھی رخ کیا ہی نہیں تھا-
اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اس بیری کے لیے کسی نے کوئی پتھر پھینکا ہی نہ تھا-
لیکن جانے خدا کو کیا منظور تھا کہ ہر بار اس کا نصیبہ جاگتے جاگتے رہ گیا-
اس کی قسمت کھلتے کھلتے رہ گئی-
پہلی بار جب اس کے لیے ڈاکٹر مسعود کا رشتہ آیا تھا تو اسے ایم-اے کیے پورا سال بھی نہیں گزرا تھا-
سب عروسہ کی قسمت پر رشک کر رہے تھے- کیسے خوبصورت اور کتنے وجیہہ تھے ڈاکٹر مسعود- ان کے نام کے ساتھ ایم-بی-بی-ایس' ایف-آر-سی-ایس کی ڈگری تو بس سونے پر سہاگہ ہی تھی- ان کے گھر والوں نے عروسہ کو دیکھا اور دل و جان سے پسند کیا- ڈاکٹر مسعود نے بھی اسے دیکھا اور اپنے گھر والوں کی پسند کی داد دی-
تاریخ طے ہو گئی- عزیزوں' رشتے داروں میں مٹھائی بھی تقسیم ہو گئی- زور و شور سے جہیز کی تیاریاں ہونے لگیں- عروسہ کے مایوں بٹھانے میں صرف چار دن باقی تھے جب اچانک.... ایک شام اس کی خوش قسمتی کو جانے کس کی نظر لگ گئی-
مایوں کا پیلا جوڑا منتظر ہی رہا کہ وہ عروسہ کے جسم پر سجے گا-
ابٹن' مہندی' چوڑیاں سب حسرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف تکتے ہی رہ گئے-
گھر کے در و دیوار شہنائیوں کی آواز سننے کے منتظر ہی رہے مگر شہنائیاں نہ گونج سکیں-
نہ ڈھولک کی تھاپ بلند ہوئی-
نہ لڑکیوں نے بابل کے گیت گائے-
یہ کیسا موڑ آیا تھا عروسہ کی زندگی میں کہ اپنے لیے لفظ دلہن سننے سے پہلے ہی ''منحوس'' کا لیبل اس کی پیشانی کا داغ بن گیا- جس ماتھے پر ٹیکے کو سجنا تھا' وہاں تو بس ایک داغ تھا جسے رات کے اندھیرے نہیں چھپا سکتے تھے تو دن کے اجالے اس داغ پر کیسے پردہ ڈال دیتے-
ہاسپٹل سے واپس آتے ہوئے ڈاکٹر مسعود کی گاڑی ایک موڑ پر سامنے سے آتے ہوئے ٹرک

سے ٹکرا گئی-

حادثہ اتنا شدید تھا کہ ڈاکٹر کو ہاسپٹل تک لے جانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی-

روح نے وہیں....اسی موڑ پر جسم کا ساتھ چھوڑ دیا-

نفس کے تار اسی مقام پر بجتے بجتے ایک دم ہی خاموش ہو گئے-

سانسوں کی ڈور وہیں....اسی جگہ ٹوٹ گئی-

جس گھر کے آنگن میں شہنائیاں گونجنے والی تھیں وہاں آہ و فغاں کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا-

جس گھر کے در و دیوار بابل کے گیتوں کی صدا سننے کے منتظر تھے....وہاں سسکیوں اور چیخوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں-

ڈاکٹر مسعود کی جوان موت کوئی معمولی المیہ نہیں تھا-

گزرتا ہوا وقت جاتے جاتے ایسا بھرپور طمانچہ لگا گیا تھا کہ ہوش و حواس معطل ہو کر رہ گئے-

نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا-

حزن و یاس کی کیسی کالی بدلیاں چھائی تھیں کہ کچھ نظر نہیں آتا تھا-

ڈاکٹر مسعود کی اچانک موت کی خبر عروسہ کے حواسوں پر بجلی بن کر گری-

اور جب اسے ہوش آیا....

تو اسے احساس ہوا کہ بہاروں نے آتے آتے راستہ بدل دیا تھا-

اظہارِ افسوس کی آڑ لے کر لوگ طنز کے تیر کچھ اس انداز سے برساتے کہ دل کا درد کچھ اور بڑھ جاتا-

کیسے کیسے تکلیف دہ خطابات سے نوازا جا رہا تھا عروسہ کو-

اس کی روح کو کس قدر اذیت ناک کچوکے دیے جا رہے تھے....

زہر میں بجھے ہوئے جملے سن کر عروسہ کو اپنے دماغ کی نسیں پھٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں-

ڈاکٹر مسعود میری بدنصیبی کا شکار ہو گئے-

میرے وجود کی نحوست انہیں کھا گئی-

لوگ کیوں کہتے ہیں-

ایسا کیوں کہتے ہیں؟

اسے اپنے وجود سے نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی- اس کا دل چاہتا تھا....وہ کچھ کھا کر سو رہے-

وہ اپنے آپ کو ختم کر لے-

یا پھر اپنے منحوس وجود کو لے کر دنیا والوں کی نگاہوں سے روپوش ہو جائے-

یہ دکھ، یہ تکلیف، یہ اذیت، یہ کچوکے-

صرف اس کے اپنے لیے نہیں تھے-

ماں، باپ، بہن، بھائی سبھی درد کے اس جلتے صحرا سے گزر رہے تھے-

کیسی کڑی دھوپ کا سفر تھا یہ ان سب کے لیے-

گھر والوں کی ہمدردی اور ان کے محبت بھرے الفاظ اگر عروسہ کے زخموں پر پھاہے نہ رکھتے تو شاید وہ مر گئی ہوتی-

وقت ایک زخم دے کر گزر گیا اور آگے بڑھتا چلا گیا- ایک دو سالوں تک تو عروسہ اپنے ذہن کو اس بات کے لیے آمادہ ہی نہ کر سکی کہ اپنے رشتے اور شادی کے موضوع پر سوچ بھی سکے- لیکن اپنے ماں، باپ اور بہنوں، بھائیوں کے فکرمند چہرے دیکھ دیکھ کر وہ اپنی سوچوں کا انداز بدلنے پر مجبور ہو گئی-

لیکن اب اس کا رشتہ طے ہو جانا آسان نہیں رہا تھا- اسے ''نصیبوں جلی'' اور منحوس سمجھ کر خاندان میں سے اول تو کوئی اس کے لیے رشتے دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا اور اگر کبھی بھولے بھٹکے کسی کو یہ خیال آ بھی جاتا تھا تو دوسرے لوگ اس کی بدقسمتی کا ذکر از سرِ نو کچھ اس انداز سے کرتے تھے کہ خیال کرنے والا شخص اپنے آپ کو اس کے متعلق سوچنے سے باز رکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا-

پھر کچھ عرصے بعد خاندان سے باہر سے ہی اس کا ایک رشتہ آیا- ڈاکٹر مسعود کے رشتے جیسی بات تو نہیں تھی لیکن پھر بھی ہر لحاظ سے وہ رشتہ بھی خاصا معقول تھا-

ایک دفعہ پھر اس کی بات طے ہوئی، عزیزوں، رشتے داروں میں مٹھائی تقسیم ہوئی- جہیز تو تقریباً تیار ہی تھا-

مگر وہ جو زندگی میں ایک اتنا بڑا حادثہ ہو چکا تھا اس نے دل و دماغ کو کچھ اس قدر سہما دیا تھا کہ عروسہ پر ایک عجیب یقین اور بے یقینی کا سا عالم طاری تھا-

اس کے رگ و پے میں ہر لمحے ایک خوف، ایک ڈر سرایت کرتا رہتا تھا-

ہر وقت یہی خیال اسے پریشان کرتا رہتا تھا کہ کہیں کچھ ہو نہ جائے-

کبھی کبھی وہ اپنے اس ڈر اور خوف کا اظہار اپنے گھر والوں کے سامنے کیے بغیر نہ رہتی-

سب اسے تسلیاں دیتے-

اسے سمجھاتے-

اس کے خیال کو محض وہم قرار دیتے-

اس نے کتنی دعائیں کی تھیں-

اور کتنی منتیں مانی تھیں کہ سب کچھ خیریت سے ہو جائے-

لیکن عروسہ کی قسمت وقت کے جانے کون سے لمحوں میں لکھی گئی تھی۔

وہ ایک بار پھر اپنی قسمت سے شکست کھا گئی۔

ظفر احمد کے متعلق معلومات اور چھان بین کرنے میں گھر والوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی لیکن پھر بھی یہ بات انہیں معلوم ہی نہ ہو سکی کہ ظفر احمد کے گھر والوں نے ان کی مرضی کے خلاف یہ رشتہ طے کر دیا تھا۔ وہ خود کسی اور لڑکی سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے چاہا تو یہی تھا کہ اپنے گھر والوں کی مرضی اور خوشی کے ساتھ وہ اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کریں' یوں جب بات نہ بن سکی تو ظفر احمد نے اپنے گھر والوں سے چوری چھپے چند قریبی اور عزیز دوستوں کی موجودگی میں اس لڑکی سے شادی کر لی۔

مگر یہ چوری چھپے کی شادی زیادہ دنوں تک پردے میں نہ رہ سکی۔ ان کے گھر والوں نے سر پیٹ لیا۔ مگر اب سر پیٹنے سے یا ظفر احمد اور ان کی بیوی کو صلواتیں سنانے سے کچھ حاصل تو نہیں ہو سکتا تھا۔ ہونے والی بات ہو چکی تھی اور اب ظفر احمد کے گھر والے عروسہ کے گھر والوں کے سامنے شرمندہ ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

عروسہ کے دل و دماغ پر دوسری بار جو یہ کاری ضرب پڑی تو اسے یقین سا ہو گیا کہ لوگ سچ ہی کہتے ہیں۔

وہ سچ مچ بد قسمت ہے۔

اس کا نصیب شاید کبھی نہیں کھلے گا۔

پھر جانے کتنا وقت گزر گیا۔

عروسہ کچھ نیم پاگل سی ہو گئی تھی۔

اس بار اپنے دل و دماغ کو سنبھالنا عروسہ کے لیے دشوار ہو گیا۔

وقت بھی بڑی مشکل سے اس کے زخموں پر مرہم رکھ سکا۔ لیکن اس نے سوچ لیا تھا کہ اپنی ذات سے متعلق اس مسئلے کو اب وہ اس گھر میں اٹھنے نہیں دے گی۔

آخر کب تک وہ زخم پر زخم کھاتی رہے گی۔

آخر کب تک وہ اس مذاق کا نشانہ بنتی رہے گی۔

نہ اسے ہمدردی کے بول اچھے لگتے تھے نہ لوگوں کی محبت بھری تسلیاں۔

طنز کے نشتر تو تھے ہی تکلیف دہ.....

اس نے اماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اب آپ میری فکر کرنا چھوڑ دیجیے۔

میرے رشتے کی فکر میں گھل گھل کر اپنی صحت خراب نہ کیجیے۔

وہ ابا کو سوچوں میں ڈوبا دیکھتی تو انہیں سمجھانے بیٹھ جاتی۔

مگر عروسہ کے یوں سوچنے اور کہنے سے ماں باپ کی فکر تو کم نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کے دل و دماغ پر تو دن رات یہی سوچ سوار تھی کہ کسی طرح عروسہ کی شادی ہو جائے۔ دعاؤں کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کوششوں میں بھی لگے ہوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر عروسہ سے پہلے افشاں یا عنبر کی شادی ہو گئی تو عروسہ کے دل و دماغ پر بہت برا اثر پڑے گا۔

جبکہ عروسہ کو یہ فکر تھی کہ اس کی وجہ سے اس کی دونوں بہنوں کی عمریں بھی گزرتی جا رہی ہیں۔

کچھ سال اور گزرے تو عروسہ نے آخر کار اپنے آپ کو سنبھال ہی لیا۔ کم از کم دیکھنے والے تو یہی سمجھتے تھے ورنہ حقیقت یہ تھی کہ پے در پے ان دو حادثات نے اس کے دل و دماغ کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا تھا۔

عروسہ کے لیے ایک اور رشتہ آیا۔ اس نے بہت شور مچایا.....

''میں شادی نہیں کروں گی۔''

''میرے لیے اب کوئی رشتہ لے کر نہ آئے۔

قدرت کے مذاق کا نشانہ بننے کا اب مزید حوصلہ نہیں ہے مجھ میں۔''

لیکن گھر والوں نے اسے پیار سے' دلار سے سمجھا بجھا کر کسی نہ کسی طرح آمادہ ہی کر لیا۔

ایک بار پھر اس کی قسمت کے دروازے نیم وا ہوئے۔ اس بار گھر والوں نے باقاعدہ منگنی کر دی۔

عروسہ کے شب و روز پھر سہم سہم کر گزرنے لگے۔ منگنی کو ابھی پندرہ ہی دن گزرے تھے کہ پھر قیامت ٹوٹ پڑی۔

عرفان کے گھر والوں کو کہیں سے پہلے دو واقعات کی سن گن مل گئی ان کے دماغ میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ ہر دفعہ ایک نیا بہانہ بنا کر شادی کی تاریخ کو آگے بڑھاتے چلے گئے یوں ایک سال گزر گیا اور پھر تاریخوں کا یہ التوا آخر کار ایک دن منگنی ٹوٹ جانے کی شکل میں سامنے آ گیا۔ عروسہ روئی نہ چیخی۔

اس کے چہرے سے نہ کسی دکھ کا احساس ہوا نہ کسی ذہنی الجھن کا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے پہلے سے یقین تھا کہ یہ جو کچھ ہوا ہے یہی ہونے والا تھا۔ یہی ہونا تھا۔

وقت نے اس زخم کو بھی یا تو مندمل کر دیا تھا یا پھر وہ رستا ہوا ناسور بن گیا تھا۔

زخم دل پر لگا تھا اور دل سے قطرہ قطرہ ٹپکنے والے لہو پر جانے کس کی نظر پڑی تھی اور کس کی نہیں پڑی تھی۔

مگر یہ سچ تھا کہ اپنے دل کی کیفیت کو جتنا بہتر طور پر عروسہ سمجھتی تھی اتنا کوئی اور نہیں سمجھتا تھا عروسہ کے گھر والوں نے اب تک اس کی قسمت سے ہار نہیں مانی تھی۔

ماں نے جیسے عزم کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ماتھے پر ٹیکہ ضرور سجائے گی۔

اس نے ارادہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی مانگ میں افشاں ضرور سجائے گی۔

ایسا لگتا تھا جیسے ماں اپنی بیٹی کو دلہن بنا دیکھنے کی آرزو کو حسرت میں بدل کر اپنی آخری آرام گاہ تک جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

اب جو چوتھی بار عروسہ کا رشتہ طے ہوا تو عروسہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

''خداوند! اب اس بار کیا ہوگا؟''

''اب کیا ہونے والا ہے میرے معبود؟

تو مجھے کس کس طرح آزمائے گا پروردگار؟

اب تو مجھ میں حوصلہ نہیں۔

سچ مچ! ذرا بھی ہمت نہیں۔

جب سے اس کی بات طے ہوئی تھی اس کے دل و دماغ میں ڈر اور خوف نے نئے سرے سے ڈیرہ جما لیا تھا۔ وہ سوچتی تو سوچتی چلی جاتی۔

اور آج.... جب گھر کے تمام لوگ کسی تقریب میں شرکت کرنے گئے ہوئے تھے۔

وہ گھر میں اکیلی تھی۔

بالکل اکیلی' تنہا۔

آنگن میں بچھی ہوئی چارپائی پر آڑی ترچھی لیٹی وہ سوچے جا رہی تھی۔

سوچوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔

ان وقت بے وقت کی سوچوں نے اس کے دل کو کہیں کا بھی نہیں چھوڑا تھا۔

ہوا کے نرم و نازک شانوں کا سہارا لے کر کبھی دور اور کبھی نزدیک آتی ہوئی بابل کے گیتوں کی آوازیں اس کے دل کے درد میں ہر لحہ اضافہ کر رہی تھیں۔

آنگن میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے چمپا کے زرد زرد پھولوں پہ نگاہیں جما کر اس نے کئی بار سوچا تھا۔

اس کے دل سے کئی بار یہ آواز آئی تھی کہ شاید وہ سب کچھ نہ ہو سکے جو اماں ابا چاہتے ہیں۔

شاید اماں کے خواب پورے نہ ہو سکیں۔

مگر پھر دوسرے ہی لمحے سوچ کی ایک اور لہر آتی۔ آس اور امید کے سارے ہی دیپ تو نہ بجھاؤ عروسہ' تمہارے مستقبل پر چھائی ہوئی یہ سیاہی ہمیشہ ہی تو نہیں رہنے والی۔

قدرت ہمیشہ ہی تو نامہربان نہیں ہوتی۔

اور پھر سچ مچ ایسا ہی ہوا عروسہ کے دل کی یہ آواز ایک رنگین حقیقت بن کر سامنے آ گئی۔

یا تو یہ تھا کہ عروسہ کو اپنے تاریک مستقبل میں دور دور تک روشنی کی کوئی کرن نظر نہیں آتی تھی۔

اس روز زندگی کے افق پر مایوسیوں کے گھور بادل کچھ اس طرح چھائے تھے کہ آس اور امید کے سارے دیے بجھتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

یا پھر یوں ہوا کہ اس گھپ اندھیرے میں اچانک ہی روشنی کی ایک کرن نظر آئی۔

روشنی کی وہ کرن بڑی مدھم تھی اور بہت کمزور ایسا لگتا تھا جیسے یہ ننھی سی کرن اس گھر کو روشن نہیں کر سکے گی۔ ایک ذرا سی کرن اتنے بڑے گھر میں اجالا نہیں کر سکے گی۔ لیکن قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔

اور وقت بڑی عجیب چیز ہے۔

کبھی کبھی اچانک وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کے بارے میں انسان کا ذہن سوچ بھی نہیں سکتا۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ روشنی کی ایک باریک سی لکیر ہی تاریک گھروں کو منور کر دیتی ہے۔

امجد صاحب رشتے میں عروسہ کے ماموں لگتے تھے۔

سجاد احمد انہی کے بیٹے اعلیٰ تعلیم کے بعد عنقریب ہی امریکہ سے واپس آئے تھے خاصے طویل عرصے بعد ہی ان کی وطن واپسی ہوئی تھی۔

سجاد احمد کے گھر والے تو اس بات کے منتظر تھے کہ ان کے بیٹے کے ساتھ ایک گوری چٹی' گٹ پٹ گٹ پٹ کرتی میم بھی آئے گی۔

لیکن ایئر پورٹ پر سجاد احمد کو تنہا دیکھ کر سبھی تو حیران رہ گئے پھر خیال آیا کہ شاید وہ اسے بعد میں بلا لیں گے۔

گھر آنے کے بعد جب یہ موضوع چھڑا تو معلوم ہوا کہ سجاد احمد نے ایسا کوئی دم چھلا ساتھ نہیں لگایا تھا۔ ان کی باتوں سے گھر والوں کو یہی اندازہ ہوا کہ مغرب کی عورت کے خلاف ان کے دل میں سخت بیزاری تھی۔ اتنے سال تک یورپ میں رہنے کے باوجود وہاں کے رہن سہن اور ماحول نے انہیں متاثر نہیں کیا تھا۔

ان کے دل میں اگر احترام تھا تو مشرق کی عورت کے لیے وہ تو مشرق کے ہی ماحول اور رہن سہن کا راگ الاپ رہے تھے۔

اپنے خاندان کے افراد کی خیر خیریت معلوم کرتے ہوئے انہیں عروسہ کے ساتھ پے در پے پیش آنے والے حادثات کا علم بھی ہوا۔

سجاد احمد کے دل کو بڑی تکلیف پہنچی۔
وہ بڑی گہری سوچوں میں ڈوب گئے۔
سچ تو یہ تھا کہ اعلیٰ تعلیم نے ان کے دل و دماغ کو بڑی جلا بخشی تھی۔
باہر جا کر انہوں نے کھویا کچھ نہیں تھا۔
نہ اپنی شخصیت، نہ اپنا مقام۔
نہ اپنا کردار، نہ اپنے اصول۔
ہاں! انہوں نے وہاں جا کر کچھ پایا ہی تھا۔
ان کے خیالات اور ان کا اندازِ فکر وقت اور تجربات کی بھٹی میں تپ کر کندن بن گئے تھے۔
چند روز بعد سجاد احمد نے کہا۔
"امی جان! آپ لوگ میرے لیے عروسہ کا رشتہ مانگ لیں۔"
ان کی امی حیران رہ گئیں۔
بہنوں نے کچھ اس انداز سے بھائی کی طرف دیکھا جیسے انہیں سجاد احمد کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔
ہاں! باپ کے چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔
ان کے چہرے پر خوشی کی یہ لہر کیوں نہ دوڑتی۔
یہ ان کی بھانجی کا معاملہ تھا۔
یہ ان کی بہن کی خوشیوں کا معاملہ تھا۔
لیکن انہوں نے فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالا۔
انہوں نے سوچا۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جذبہ مسرت ان کے چہرے سے عیاں ہو جائے۔
کہیں ایسا نہ ہو کہ بیوی اور بیٹیوں کی نگاہیں ان کے دل کا حال جان لیں۔
سجاد احمد کی امی سوچ رہی تھیں۔
یہ میرے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟
میرا اس قدر لائق فائق لڑکا۔
عروسہ کسی طرح بھی اس کے قابل نہیں ہے۔
ان کی بہنوں نے سوچا۔
بھائی جان آخر کیا سوچ کر یہ بات کہہ رہے ہیں؟ ہمارے اتنے خوبرو، اس قدر وجیہہ شکیل بھائی جان۔
ان کے لیے تو حسین سے حسین اور قابل سے قابل لڑکی مل سکتی ہے۔

سجاد احمد کی امی نے چند سیکنڈ تک سوچنے کے بعد کہا۔
"مگر بیٹے! عروسہ منحوس ہے۔ اس سے پہلے بھی...." سجاد احمد نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔
"بعض اوقات چند حادثات جو محض اتفاقی طور پر لوگوں کے ساتھ گزر جاتے ہیں انہیں نحوست کا نام دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے امی!"
سجاد احمد کی چھوٹی بہن ثمینہ نے کہا۔
"بھیا! آپ کو پتہ بھی ہے عروسہ باجی عمر میں آپ سے...."
"سات یا آٹھ سال بڑی ہیں؟"
سجاد احمد نے بڑے اطمینان سے کہا۔
"ثمینہ! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی کہ لوگ عمروں کے فرق کو اس وقت کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایک پچاس سال کا مرد بائیس سال کی لڑکی سے شادی کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ پینتالیس سال کا مرد اٹھارہ سال کی لڑکی کے ساتھ بیاہ رچانے میں فخر محسوس کرتا ہے!!"
ثمینہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
سجاد احمد کی دوسری بہن فرخندہ نے کہا۔
"لیکن بھائی جان! عروسہ باجی سے شادی کرنے کے لیے آپ ہی رہ گئے ہیں؟ خاندان میں اور بھی لڑکے ہیں انہوں نے تو اس انداز سے نہیں سوچا؟"
سجاد احمد نے کہا۔
"مجھے دوسروں سے کیا لینا؟ اپنا اپنا اندازِ فکر ہے۔"
سجاد احمد کی امی بولیں۔
"لیکن بیٹے! عروسہ تمہارے لیے کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، اس ذکر کو چھوڑو، تمہارے لیے لڑکیوں کی کوئی کمی ہے اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے تمہیں۔"
"لیکن امی۔"
سجاد احمد نے کہا۔
"ان اچھی سے اچھی لڑکیوں کی شادی کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ اصل حقدار تو عروسہ ہے ٹھیک ہے قدرت نے اسے آزمائش میں ڈالا تھا لیکن ساری عمر تو اسے سزا بھگتنے کے لیے نہیں چھوڑا جا سکتا جب وہ غریب، قصوروار نہیں ہے تو سزاوار کیوں ہو؟"
ان کی امی زچ ہو کر بولیں۔
"بھئی تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں آخر تمہیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ تم اچھی خاصی کم

عمر لڑکیوں کو چھوڑ کر اپنے سے آٹھ سال بڑی لڑکی سے شادی کرتے پھرو؟''

انہوں نے ایک لمحے کے لیے رک کر کہا۔

''یہ قربانی دینے کے لیے تم ہی رہ گئے ہو؟''

سجاد احمد نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''آپ سمجھتیں کیوں نہیں امی؟ میں قربانی نہیں دے رہا ہوں ایک لڑکی کو اس کا حق دے رہا ہوں۔''

پھر وہ کچھ مسکرا کر بولے۔

''اور رہ گئی کم عمری والی بات.... اگر کم عمری ہی خوبی ہے تو پھر چار پانچ سال کی لڑکی سے شادی کیوں نہ کرلی جائے؟''

یہ بحث کئی دنوں تک چلتی رہی سجاد احمد کی امی اور بہنیں وقتاً فوقتاً انہیں سمجھانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن وہ تو جیسے عروسہ کے ساتھ شادی کرنے پر پوری طرح آمادہ تھے۔ وہ کسی صورت ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھے اور نہ ہی ان کی امی اور بہنیں ان کی بات ماننے پر تیار تھیں۔ جب سجاد احمد کی امی اپنے شوہر امجد صاحب سے کہتیں کہ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ۔

تو وہ صاف کہہ دیتے۔

''میں اسے کیا سمجھاؤں گا؟ ماشاءاللہ پڑھا لکھا اور سمجھدار لڑکا ہے۔ اپنا برا بھلا خود سوچ سکتا ہے۔''

اس پر امجد صاحب کو یہ طعنہ سننے کو ملتا۔

''ہاں! آپ اس معاملے میں کیوں بولیں گے؟ آپ کی تو بہن اور بھانجی کا معاملہ ہے۔''

امجد صاحب اس طعنے کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیتے۔

پھر سجاد احمد نے صاف صاف کہہ دیا۔

''اگر آپ لوگوں نے میری بات نہ مانی تو میں واپس امریکہ چلا جاؤں گا۔''

اور سچ مچ انہوں نے دوبارہ باہر جانے کی تیاری شروع کردی۔

پھر ان کی امی اور بہنوں کو ان کی بات مانتے ہی بن پڑی۔

آخر کار.... ایک روز سجاد احمد کے گھر والے عروسہ کے لیے ان کا رشتہ لے جانے پر آمادہ ہو ہی گئے۔

کس قدر حیران کن بات تھی عروسہ کے گھر والوں کے لیے۔ کیسی انہونی سی بات ہو رہی تھی۔

عروسہ کی امی، ابا اور بھائی بہنیں ایک دوسرے کی طرف بے یقینی کے سے عالم میں دیکھ رہے تھے۔

عروسہ نے بھی سنا مگر....

اسے اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا۔

اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ عروسہ کے گھر والے جانتے تھے۔

اور خود عروسہ بھی اس بات سے بے خبر نہیں تھیں کہ سجاد احمد عمر میں اس سے آٹھ سال چھوٹے ہیں۔

عروسہ کی امی اور ابا اور بھائی بہنوں کے لیے بے شک یہ خوشی کی بات تھی۔

اپنی بیٹی کے لیے انہیں ہیرا سا لڑکا بن مانگے مل رہا تھا۔ ان کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ فوراً اس رشتے کے لیے ہامی بھرلیں۔

لیکن ان کی عقل اس بات کے لیے آمادہ نہیں تھی اور نہ ہی فوراً ہامی بھرلینا مناسب تھا۔

وہ لوگ عروسہ اور سجاد احمد کی عمروں کے درمیان فرق کا ذکر کیے بغیر نہ رہ سکے۔

لیکن سجاد احمد کی باتوں نے سب کو قائل کرلیا مگر پھر بھی گھر والوں نے سوچنے کے لیے کچھ مہلت مانگی۔

سجاد احمد نے بھی ان لوگوں کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک ایک روز باقاعدہ عروسہ کے ساتھ ان کی منگنی نہیں ہوگی۔

منگنی کے بعد شادی میں کیا دیر تھی۔

عروسہ کے لیے تو ہر چیز تیار تھی۔

لیکن عروسہ کا دل۔

زخموں سے چور چور دل کسی طرح بھی زندگی کے اس خوشگوار حادثے پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔

اس نے سوچا۔

خدایا! اب کیا ہونے والا ہے؟

مجھے اور زیادہ آزمائش میں نہ ڈال خداوندا!

لیکن اس دفعہ سچ مچ ہر کام کس قدر خیریت سے ہو رہا تھا۔

عروسہ نے مایوں کا زرد جوڑا پہنا۔

اس کے ہاتھوں میں مہندی رچی۔

گھر کی فضا شادی کے گیتوں سے گونج اٹھی۔

ڈھولک کی تھاپ سننے کے منتظر در و دیوار مسکرا اٹھے لڑکیوں نے مہندی، ابٹن اور بابل کے گیت گا گا کر گھر سر پر اٹھالیا۔

اور شادی کے روز اماں کی خوشی قابل دید تھی۔

عروسہ سرخ زرتار کپڑے پہنے دلہن بنی بیٹھی تھی۔

پیشانی پر ٹیکہ سجا ہوا تھا۔

مانگ میں افشاں چمک رہی تھی۔

اماں کی آرزو حسرت میں نہیں بدلی تھی۔

اور عروسہ....

اس کے دل کی حالت نا قابل بیان تھی۔

جب تک نکاح نہیں ہو گیا اس پر یقین اور بے یقینی کی سی کیفیت طاری رہی۔

نکاح ہو گیا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔

عروسہ کو خوشی اس بات کی نہیں تھی کہ وہ دلہن بن گئی تھی۔

خوشی اسے اس بات کی تھی کہ اب اس کی بہنیں افشاں اور عنبر دلہنیں بن سکیں گی۔ اس کے بھائیوں کے گھر بس جائیں گے۔ اسے رخصت کرنے کے بعد اماں اور ابا کی فکریں اور پریشانیاں آدھی بھی نہیں رہ جائیں گی۔

اور پھر.... جب اس کی رخصتی کا وقت آیا اور وہ اپنی نندوں کے سہارے اسٹیج سے اتر کر نیچے آئی تو دل کی خوشی نا قابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

اتنی مسرت تو عروسہ سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔

یہ بے پناہ خوشی سنبھالنے کے لیے دل کا دامن عروسہ کو کتنا تنگ محسوس ہو رہا تھا۔ خوشی کے بوجھ تلے اس کا دل دبا جا رہا تھا۔ اسے ڈر لگ رہا تھا کہ اس کے دل کی حرکت کہیں بند ہی نہ ہو جائے۔

لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔

وقت اتنی آزمائشوں میں ڈالنے کے بعد اب اسے کوئی اور دھچکہ لگانے پر آمادہ نہیں تھا۔ قدرت اب اس پر مزید نامہربان ہونے پر تیار نہیں تھی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے عروسہ نے گھونگھٹ کی اوٹ سے قریب کھڑے سجاد احمد کی طرف دیکھا اور سوچا۔

سجاد احمد! تم محض ایک عام آدمی ہو؟

نہیں۔

تم ایک انسان ہو۔

مکمل انسان۔

کس قدر بلند مینار پر کھڑے ہوئے ہو تم۔

اس دنیا میں کتنے لوگ ہیں جو تمہاری برابری کر سکیں گے۔

❖ ○ ◆ ○ ❖

اسکور

سالگرہ نمبر 1980ء

برکت بوا آج پھر اپنا برقع پھڑپھڑاتی ہانپتی کانپتی سٹر پٹر کرتی آ موجود ہوئی تھیں۔ بیگم وقار دوپہر کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد ملازمہ کو برتن سمیٹنے اور میز صاف کرنے کی ہدایات دے رہی تھیں۔

برکت بوا انہیں پوچھتی ہوئی سیدھی ڈائننگ روم میں چلی آئیں۔ بیگم وقار نے انہیں دیکھتے ہی بڑا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے انہوں نے اپنائیت سے کہا۔

"آیئے بوا! آپ تو عید کا چاند ہی ہو گئیں۔"

برکت بوا نے برقع کی ٹوپی سر سے ذرا نیچے کی طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

"کیا بتاؤں بیٹی! میں تو اللہ میاں کے گھر جاتے جاتے واپس پلٹ آئی۔"

بیگم وقار کچھ چونک کر اور کچھ گھبرا کر بولیں۔

"کیوں بوا خیر تو رہی۔"

"کہاں خیر رہی؟ اس روز تمہارے پاس آئی تھی نا! بس دوسرے ہی روز سے ایسا ہلہلا کر بخار چڑھا کہ بستر سے ہی لگ گئی۔" بیگم وقار نے کہا۔

"ہاں! جبھی تو میں سوچ رہی تھی آپ اتنی کمزور کیوں نظر آ رہی ہیں۔"

وہ فوراً دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

"آیئے ادھر میرے کمرے میں آجایئے وہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے-"
پھر ایک دم انہیں خیال آیا-معلوم نہیں بوا نے کھانا بھی کھایا ہے یا نہیں-
انہوں نے دروازے میں ہی رک کر کہا-
"پہلے آپ کھانا کھا لیتیں-"
"کھانا تو میں گھر سے کھا کر چلی تھی-"
"اچھا تو پھر آپ کے لئے چائے بنوا دیتی ہوں-"
"رہنے دو' شام کو جب سب کے لیے چائے بنے گی تو میں بھی پی لوں گی-"
"شام ہونے میں ابھی بہت دیر ہے اس وقت بھی آپ ایک کپ چائے پی لیجئے' کچھ تھکن ہی دور ہوگی اتنی دور سے آئی ہیں-"
بوا نے پھر مزید انکار نہیں کیا-
بیگم وقار نے میز پر سے برتن سمیٹتی ہوئی سجو سے کہا-
"سجو! میز صاف کر کے تم بوا کے لیے اچھی سی چائے بنا لاؤ-"
"آپ کے لیے بھی بناؤں بیگم صاحبہ؟"
سجو نے پوچھا-
"نہیں میرا دل تو نہیں چاہ رہا ہے اس وقت چائے پینے کو-" برکت بوا نے کہا-
"دل تو نہیں چاہ رہا ہوگا لیکن میرا ساتھ دینے کو ہی پی لو تم بھی!" بیگم وقار مسکرا کر بولیں-
"اچھا سجو! ٹھیک ہے میرے لیے بھی بنا لانا-" اپنے بیڈروم کے پردے کھینچتے ہوئے بیگم وقار نے کہا-
"اب آپ آرام سے بیٹھ جایئے بوا-"
برقع ایک طرف رکھ کر بوا ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئیں-
بیگم وقار نے پوچھا-
"پان تو آپ چائے کے بعد کھائیں گی-"
"ایک پان تم ابھی بنا دو' چائے آنے تک تو وہ ختم بھی ہو جائے گا-"
"اچھا جیسی آپ کی مرضی-"
بیگم وقار کونے والی میز پر رکھے ہوئے پاندان کی طرف بڑھ گئیں-
جب بوا نے پان کی گلوری اپنے کلّے میں دبائی تو بیگم وقار اطمینان سے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولیں-
"ہاں اب بتایئے بوا کیسا بخار چڑھ گیا تھا آپ کو؟"
"ارے وہی موا فلو ہو گیا تھا کمر توڑ کے رکھ دی میری-"

"دوا علاج بھی کیا آپ نے ٹھیک سے؟"
"ہاں بڑی گرم گرم دوائیں کھلا ڈالیں کمبخت ڈاکٹر نے اوپر سے سوئیاں الگ چبھوئیں-"
بیگم وقار نے کہا-
"دواؤں اور انجکشن کے بغیر یہ بخار پیچھا بھی تو نہیں چھوڑتا-"
"مجھے تو بڑی گھبراہٹ ہوتی ہے ان انگریزی دواؤں سے-"
بوا نے چہرے پر سخت بیزاری کی سی کیفیت پیدا کرتے ہوئے کہا-
"ابھی آپ خاصی کمزور ہیں' کچھ ٹانک لکھوا لیے ہوتے ڈاکٹر سے-"
"لکھ کر تو دیے ہیں ڈاکٹر نے لیکن میں نے خریدے نہیں ابھی-"
"شام کو گھر جاتے ہوئے آپ قریبی میڈیکل اسٹور سے خرید لیجیے گا-"
"ارے نہیں بیٹی! دوا علاج پر پہلے ہی بڑا خرچہ ہو گیا ہے-"
"خرچے کی فکر آپ بالکل نہ کیجیے وہ سارے پیسے آپ مجھ سے لے لیجیے-"
"تم سے کیسے لوں؟ تمہارا کچھ کام بنے تو تم سے پیسے لیتی ہوئی اچھی بھی معلوم ہوں-"
"آپ تو غیریت برتنے لگیں' کام بھی انشاءاللہ ہو جائے گا-کوشش تو کر رہی ہیں آپ-"
"ہاں کوشش میں تو لگی ہوئی ہوں بس! اللہ کامیاب کرے-"
بیگم وقار نے متجسس ہو کر پوچھا-
"اور کوئی لڑکی دیکھی آپ نے-"
"ہاں ایک بڑی اچھی لڑکی دیکھی ہے خاندان بھی اچھا ہے-لوگ بھی پیسے والے ہیں-"
"اس کا مطلب ہے آپ نے بات شروع کر دی ہے-"
"میں نے شکیل میاں کے بارے میں ساری تفصیلات بتا دی ہیں ان لوگوں کو-"
"اچھا پھر کیا کہتے ہیں وہ لوگ!"
"کہنا کیا ہے؟ ان لوگوں کی بڑی زبردست خواہش ہے کہ جلد سے جلد آ کر ان کی لڑکی کو دیکھ لیا جائے-"
"اچھا!"
"ہاں! میں آج اسی لیے آئی ہوں کہ تم کوئی دن تاریخ بتاؤ تو میں جا کر خبر کر دوں ان لوگوں کو-"
پھر وہ اپنی بات میں مزید اضافہ کرتے ہوئے بولیں-
"حالانکہ کمزوری کی وجہ سے مجھ میں ہمت بالکل نہیں تھی' لیکن میں نے سوچا ایسا نہ ہو کہ ذرا سی تاخیر کی وجہ سے اتنی اچھی لڑکی ہاتھ سے نکل جائے-"
بیگم وقار نے کہا-
"واقعی بڑی زحمت ہوئی آپ کو-"

"زحمت کیسی! سوچتی ہوں جب زبان سے تمہیں بیٹی کہا ہے تو بیٹی کے کام آنا بھی چاہیے۔"

"یہ آپ کی محبت ہے بوا!"

بیگم وقار نے ممنون ہو کر کہا۔

برکت بوا نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"ماشاء اللہ چار لڑکیاں ہیں خان صاحب کی۔ ہیں تو چاروں ہی جوان مگر پہلے وہ بڑی لڑکی کی ہی کریں گے۔"

"دیکھیے خدا کرے شکیل کو پسند آ جائے۔"

"میرا خیال ہے شکیل میاں کو پسند آ جائے گی۔ چاروں میں بڑی والی کی شکل ہی اچھی ہے۔"

"اچھا!"

بیگم وقار خوش ہو کر بولیں۔

پھر انہوں نے اپنے آئندہ دنوں کا حساب کتاب لگا کے پروگرام بنا کے بوا کو دن تاریخ بتا دی۔

بوا نے گرم گرم چائے کا ایک کپ پی کر پھر ایک گلوری گلے میں دبائی اور گھر جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لیکن بیگم وقار نے بہت اصرار کر کے انہیں شام تک کے لیے روک لیا۔ شام کی چائے کے وقت ان کی مزید خاطر مدارات کر کے بیگم وقار نے بہت اصرار کر کے کچھ نوٹ ان کی مٹھی میں تھما دیے اور ان کے ساتھ ساتھ برآمدے تک جاتے ہوئے بولیں۔

"بوا روبینہ کے لیے بھی کوشش کرتی رہیے، میں چاہتی ہوں کہ فائنل کے امتحان سے فارغ ہونے کے بعد اس کا بھی کچھ انتظام ہو جائے۔"

بوا نے ان کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"تم فکر نہ کرو بیٹی! دو تین لڑکے ہیں میری نگاہ میں پہلے میں اپنے طور پر ان کی چھان بین کر لوں پھر بتاؤں گی۔"

"اچھا خدا حافظ۔"

بیگم وقار نے کہا۔

"جیتی رہو۔"

بوا نے ان کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور سٹر پٹر کرتی آگے بڑھ گئیں۔

برکت بوا سے بیگم وقار کی کوئی دور پرے کی بھی رشتے داری نہیں تھی وہ تو اصل میں ان کی ایک سہیلی کی جاننے والی تھیں۔ انہوں نے ہی بیگم وقار سے بوا کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تھا۔

"بڑی اچھی اور نیک خاتون ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے رشتے مناسب جگہوں پر طے کراتی ہیں اپنی زبان سے کبھی نہیں مانگتیں جو دے دو وہ خوشی سے لے لیتی ہیں۔ میری دونوں بیٹیوں اور بیٹے

کی شادی انہوں نے ہی کروائی ہے۔"

بعد میں جب بیگم وقار کو انہیں پرکھنے کا موقع ملا تو انہیں اندازہ ہوا کہ واقعی برکت بوا اپنی زبان سے کچھ نہیں مانگتی تھیں۔ اپنی مرضی سے جو کچھ دے دو اسے بھی بہت "ناں ناں" کرنے کے بعد قبول کرتی تھیں اور رشتے طے کرانے کے معاملے میں واقعی بڑی مخلص تھیں۔

بیگم وقار کے بیٹے شکیل الرحمان کا رشتہ طے کرانے کے لیے بھی وہ بیچاری ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں لیکن یہ بیل کسی طرح منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی تھی۔

شکیل الرحمٰن کا بس نام ہی نام تھا شکل وصورت پہ اس نام کے آثار دور دور تک نظر نہیں آتے تھے۔

نہ وہ دراز قد تھے نہ وجیہہ تھے۔

نہ ان کا رنگ گورا تھا نہ روپ نرالا تھا۔

اور نہ ہی ان کا بدن کسرتی تھا۔

آنکھوں میں کوئی مقناطیسی چمک بھی نہیں تھی۔

ہونٹوں پہ بکھری ہوئی مسکراہٹ پر بھی دل نشین ہونے کا گمان نہیں گزرتا تھا۔

بس یہ تھا کہ انسان ہی کے بچے نظر آتے تھے۔

آنکھ، کان، ناک سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر تھیں۔

بس صرف دماغ اپنی جگہ پر نہیں تھا۔ دماغ اپنی جگہ پر ہونے کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں تھا کہ وہ مخبوط الحواس تھے یا ان کے لیے پاگل خانے بھیجنے کا مشورہ بلا فیس دیا جا سکتا تھا۔

اونہوں!

معاملہ اصل میں یہ تھا کہ دماغ عرش معلّٰی پر چڑھا ہوا تھا۔ اور کسی معاملے میں نہیں بلکہ اپنی ہونے والی بیوی کے معاملے میں۔

وہ خود تو جیسے کچھ بھی تھے بس ٹھیک ہی تھے۔

ہاں بیوی وہ ایسی چاہتے تھے جو ماہ جبیں، نازنین و دلنشین ہو۔ ماڈرن نہ ہو پڑھی لکھی کافی ہو۔

اس "کافی" کی حد بھی انہوں نے مقرر کر دی تھی، یعنی ڈاکٹر ہو یا لیکچرار ہو۔

اماں، بہنوں، بوا برکت اور خاندان کی کچھ بزرگ خواتین نے انہیں اور کچھ نہیں تو بیس پچیس لڑکیاں تو دکھائی ہوں گی۔ شکیل الرحمٰن کے یار دوستوں نے بھی اس معاملے میں ان کی خاصی مدد کی تھی۔ کئی لڑکیاں تو انہی لوگوں کی تجویز کردہ تھیں مگر شہزادے گلفام کو ان میں سے کوئی بھی سبز پری جیسی لگی ہی نہیں۔

شکیل الرحمٰن کے لیے لڑکی کی پسند کا مسئلہ تو کشمیر کے مسئلے سے بھی بڑھ کر ہو گیا تھا۔

اپنی دولہن کی تلاش کے سلسلے میں وہ صحیح معنوں میں سب کی جوتیاں گھسوا رہے تھے۔

ان کی اماں بہنیں تھک چکی تھیں۔
رشتہ دار خواتین بیزار ہو چکی تھیں۔
خاندان کی کنواری لڑکیاں ان سے چڑ گئی تھیں۔
ایک بیچاری بوا برکت تھیں جواب تک ہمت باندھے ہوئے تھیں اور ایک کے بعد دوسری' دوسری کے بعد تیسری لڑکی دکھائے جا رہی تھیں۔
مگر نتیجہ کیا نکلتا تھا؟
وہی ڈھاک کے تین پات۔
شکیل الرحمٰن کے والد بزرگوار وقار الرحمٰن صاحب بعض دفعہ بے حد جھلا کر ان سے پوچھتے۔
''کیوں میاں صاحبزادے؟ ہمارے قبر میں جانے سے پہلے تمہاری شادی کا مسئلہ حل ہو جائے گا یا پھر.....''
کبھی کبھی وہ لڑکیوں پہ لڑکیاں ریجیکٹ ہونے پر عاجز آ کر شکیل الرحمٰن سے کہتے۔
''تم سے اچھے تو تمہارے بھائی جمیل الرحمٰن ہی رہے چلو فرنگن سے ہی شادی کی مگر شادی کو مسئلہ بنا کر اپنی اماں بہنوں کو پچیس تیس گھروں کی دہلیزیں تو پار نہیں کروائیں۔''
مگر شکیل الرحمٰن سب کی باتیں سن سن کر بھی بہت مطمئن تھے۔ نہ جانے کیوں انہیں پکا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن انہیں اپنی من پسند لڑکی مل ہی جائے گی۔
اب تو نوبت یہاں تک آ گئی تھی کہ یار دوست ان کا مذاق اڑانے لگے تھے جہاں پندرہ بیس دن گزرے کوئی نہ کوئی شخص ہنس کر پوچھتا۔
''کیوں بھئی شکیل! اب اسکور کتنا ہو گیا ہے؟''
اور شکیل بڑے فخر سے بتاتے۔
''ہاں کل شام نمبر پچیس بھی ریجیکٹ کر دی ہے۔'' کبھی وہ مسکرا کر بتاتے۔
''ہفتہ بھر پہلے چھبیسویں بھی ریجیکٹ ہو گئی ہے۔''
ہر دفعہ وہ لڑکی کو ریجیکٹ کرنے کی وجہ بھی ضرور بتاتے۔ لڑکی کا سارا جغرافیہ اور اس کی ساری تاریخ بتا کر کہتے۔
''تو تم سمجھے نہ یار! اس دفعہ معاملہ اصل میں صرف فلاں وجہ سے فٹ نہ بیٹھ سکا۔''
پھر بہت مطمئن ہو کر کہتے۔
''خیر کوئی بات نہیں مجھے یقین ہے اگلی دفعہ اونٹ کسی نہ کسی کروٹ ضرور بیٹھ جائے گا۔''
اب معلوم نہیں اس موقع پر یہ محاورہ بولنے سے ان کی کیا مراد ہوتی تھی؟ کیوں کہ جس سختی کے

ساتھ وہ اپنی قائم کردہ حدود پر ڈٹے ہوئے تھے ان کے ہوتے ہوئے تو اپنی من چاہی لڑکی کا پالینا ان کے لیے سخت دشوار تھا۔ کم از کم ان کے یار دوستوں کا تو یہی خیال تھا۔
کبھی کبھی ان کا کوئی منچلا دوست یہ کہنے سے بھی باز نہ رہتا۔
''کیوں بھئی ارادہ کیا ہے آخر؟''
''کیا مطلب؟''
شکیل احمد پوچھتے۔
''مطلب یہ کہ تمہارا اسکور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔''
''ہاں یار! اسکور تو بیشک میرا بہت ہو گیا ہے۔''
ان کے انداز میں ایک تفاخر ہوتا۔
''تو پھر ہاف سینچری کرنے کا ارادہ ہے یا سینچری مکمل کرنے کی سوچ رہے ہو؟''
یہ سن کر شکیل الرحمٰن ایک بلند قہقہہ لگاتے کچھ اس انداز سے کہ اس میں غرور کی جھلک نمایاں ہوتی یوں..... جیسے کہہ رہے ہوں کہ
''دیکھا ہماری نگاہ میں آج تک کوئی لڑکی جچ ہی نہیں سکتی۔''
لڑکیوں کو ریجیکٹ کرنے کے معاملے میں ہے کسی کا اتنا شاندار ریکارڈ؟''
اور واقعی جس طرح وہ اچھی بھلی لڑکیوں میں مین میخ نکال رہے تھے اس صورت میں تو ان کی نگاہ میں کسی لڑکی کا جچنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔
اور ٹھیک ہی سوچتے تھے وہ۔
کہ لڑکیوں کو ریجیکٹ کرنے کے معاملے میں ان جیسا ''شاندار'' ریکارڈ شاید ہی کوئی قائم کر سکتا تھا۔
شکیل کے دوستوں اور عزیزوں کو پکا یقین ہو چکا تھا کہ ان کی شادی ہونی مشکل ہے۔
ظاہر ہے جس شخص کا یہ عالم ہو کہ کبھی کسی لڑکی کو یہ کہہ کر ریجیکٹ کر دے کہ اس کے مسکرانے کا انداز اچھا نہیں ہے۔
کسی کو یہ کہہ کر رد کر دے کہ اس کی کمر ذرا چوڑی ہے۔
کوئی بیچاری محض اس لیے نگاہ میں نہ جچ سکے کہ ناک نقشہ تو بے شک بہت خوبصورت ہے' رنگت بھی گوری ہے۔ لیکن رنگت میں گلابی پن نہیں ہے۔
کسی کے نصیب میں ان کے آنگن کا چاند بننا اس لیے نہ لکھا تھا کہ وہ ''پرکٹی'' ہے اس کی زلفیں ان کے شانوں پر کیسے پریشان ہو سکیں گی۔ اب چاہے اس غریب نے بالوں کے مسلسل جھڑنے کی وجہ سے ہی اپنے بال کٹوا لیے ہوں۔
کوئی غریب اس لیے ان کی زندگی کی ہمسفر نہ بن سکی کہ اس کا قد ذرا چھوٹا رہ گیا ہے۔

کہنے والے کہتے تھے۔
اب ایسی لڑکی شکیل کے لیے کہاں سے آئے گی جس کا روپ نرالا ہو۔
حسین ایسی کہ چاند بھی اسے دیکھ کر شرما جائے۔
کمر ایسی لچکدار ہو کہ پھولوں کی نرم و نازک ڈالیاں بھی اس کے سامنے ہیچ ہوں۔
رنگ بالکل میدہ شہاب سا ہو۔
ہنسے تو جلترنگ بجنے کا گمان ہو۔
مسکرائے تو کلیاں سی چٹک پڑیں۔
چلے تو ہواؤں کی سبک رفتاری بھی ماند پڑ جائے۔
باتیں کرے تو ایسا معلوم ہو جیسے پھول جھڑ رہے ہوں۔
زلفیں ایسی ہوں جنہیں دیکھ کر گھنگھور گھٹاؤں کا خیال آ جائے۔

یہ تو سچ تھا کہ شکیل نے اپنی ہونے والی دلہن کی خصوصیات کو ان الفاظ میں کبھی نہیں بیان کیا تھا لیکن جس طرح وہ یکے بعد دیگرے تمام لڑکیوں کو رد کرتے چلے جا رہے تھے اس سے تو یہی خیال آتا تھا کہ انہیں کسی ماہ جبین، نازنین و دلنشین کی ہی ضرورت تھی۔

اپنی اماں بہنوں کی پسند پہ انہیں اعتماد نہیں تھا اس لیے ہر دفعہ یہ پخ ضرور لگا دیتے تھے کہ لڑکی کو میں خود بھی دیکھوں گا۔

کئی گھرانوں نے تو شکیل کی اس حرکت کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا۔
انہیں یہ بات بہت ناگوار گزری۔
لیکن کیا کرتے۔

جب گھر میں چار چار، پانچ پانچ لڑکیاں پہاڑ بنی کھڑی ہوں تو جبراً قہراً مجبوراً لڑکے کی اس شرط کو ماننے ہی بن پڑی۔

برکت بوا نے اب جو تازہ ترین رشتہ بتایا تھا اس کا ذکر بیگم وقار نے شام کو شکیل الرحمٰن سے کر دیا اور ساتھ ہی ہاتھ جوڑتے ہوئے بولیں۔

''لڑکے خدا کے واسطے اس دفعہ تو تم لڑکی کو پسند ہی کر لو۔'' شکیل مسکرا کر بولے۔
''کسی کو پسند کرنا کوئی زبردستی کا سودا تو ہے نہیں۔''
بیگم وقار زچ ہو کر بولیں۔
''ٹھیک ہے زبردستی کا سودا نہیں ہے لیکن آخر''..... شکیل الرحمٰن ان کی بات کاٹ کر بولے۔
''لڑکی پسند کے قابل ہوئی تو ضرور پسند کر لوں گا۔''
ان کی بہن روبینہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اوپر دیکھ کر بولی۔

''اللہ میاں! تو نے جنت میں حوریں دینے کا وعدہ اپنے بندوں سے کیا ہے اس میں سے ایک حور اسی دنیا میں میرے شکیل بھائی جان کے لیے بھیج دے۔''
بیگم وقار ہنس پڑیں۔
شکیل الرحمٰن بڑی سنجیدگی سے بولے۔
''بھئی! میں یہ کب کہتا ہوں کہ میں کسی حور پری سے شادی کرنا چاہتا ہوں لیکن....''
روبینہ مسکرا کر بولی۔
''ہاں واقعی! آپ جس قسم کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں وہ یقیناً حور پری سے بھی الگ ہی کوئی چیز ہوگی۔''

شکیل الرحمٰن جواب میں کچھ کہنے ہی والے تھے کہ وقار صاحب وہاں آ گئے۔ بڑی گہری نظر سے اپنے بیٹے کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔
''کیوں بھئی! مسئلہ زیر بحث کیا ہے؟''

حالانکہ وہ باہر راہداری میں کھڑے ہو کر بھی کچھ سن چکے تھے لیکن موضوع کو نئے سرے سے چھیڑ کر اپنے بیٹے کی گوشمالی کرنا چاہتے تھے۔

روبینہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ بیگم وقار نے آنکھ کے اشارے سے منع کرنے کی کوشش کی کہ وقار صاحب کے سامنے اس موضوع پر کوئی بات نہ کرے لوگ سنی ان سنی کیا کرتے ہیں لیکن روبینہ نے اس وقت دیکھی ان دیکھی کر دی۔ اس نے ایک شریر سی نگاہ بھائی کے گھبرائے ہوئے چہرے پر ڈالی اور مسکرا کر بولی۔

''ابو آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ اس گھر میں خاصے عرصے سے ایک ہی مسئلہ ہے جو مسئلہ کشمیر سے بھی بڑا ہے۔''
وقار صاحب دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے بولے۔
''اچھا اچھا! یعنی وہی تمہارے برادر عزیز کی شادی کا مسئلہ۔''
''جی آپ بالکل صحیح سمجھے۔''
''پھر کوئی لڑکی دیکھی ہے تم لوگوں نے؟''
''ابھی دیکھی نہیں دیکھنے جائیں گے۔''
''یعنی یوں کہو کہ مال اڑانے جاؤ گی۔''
وقار صاحب کی بات سن کر روبینہ ہنس پڑی۔
وقار صاحب سنجیدگی سے بولے۔
''اس میں ہنسی کی کون سی بات ہے؟ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہوں میں۔''

روبینہ پھر بھی ہنسنے لگی۔

وقار صاحب بولے۔

"یہ بات تو طے ہے کہ لڑکی غریب تو پسند کی نہیں جائے گی کھا چاٹ کے آجاؤ گے۔تم لوگ اور بعد میں کورا سا جواب بھجوادو گے۔لڑکے والے جو ٹھہرے۔"

وقار صاحب کا لہجہ خاصا طنزیہ تھا۔

پھر وہ اپنی بیگم سے مخاطب ہو کر بولے۔

"اور یہ سب کچھ آپ کی شہ پر ہو رہا ہے۔"

بیگم وقار بھڑک کر بولیں۔

"ارے واہ! آپ تو مجھ ہی کو سارا الزام دینے بیٹھ گئے!"

"سارا تو نہیں' آدھا آدھا الزام آپ دونوں ماں بیٹے میں بانٹ رہا ہوں۔"

انہوں نے یہ بات اگرچہ خاصی سنجیدگی سے کہی تھی۔

لیکن وقار صاحب قدرے سخت لہجے میں بولے۔

"میں پوچھتا ہوں آخر اتنی ڈھیل دے کیوں رکھی ہے اپنے صاحبزادے کو۔"

"میں نے ڈھیل دے رکھی ہے؟"

بیگم وقار سے جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو وہ الٹا سوال کر بیٹھیں۔

"نہیں میں نے دے رکھی ہے۔"

وقار صاحب اپنے چشمے سے دونوں ماں بیٹے کو باری باری گھورتے ہوئے بولے۔

بیگم وقار اپنے' لہجے میں مٹھاس پیدا کرتے ہوئے بولیں۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں وقار صاحب؟"

"آپ مجھے سمجھانا کیا چاہتی ہیں بیگم وقار؟"

وقار صاحب کے ہونٹوں پر ایک ذرا سی مسکراہٹ نظر آئی۔

"دیکھئے نا! اب زمانہ پہلے جیسا تو رہا نہیں کہ اولاد پر زبردستی اپنی پسند اور مرضی کو مسلط کر دیں۔"

"اوہو! تو میں کب کہتا ہوں کہ اپنی مرضی اور پسند کی لڑکی کو ہم اس کے سر منڈھ دیں۔"

"آپ خود ہی سوچیے کہ زندگی تو شکیل کو گزارنی ہے اور ہم....."

"تو میں کب کہتا ہوں کہ زندگی مجھے گزارنی ہے لیکن آپ کے لاڈلے پسند بھی کریں کسی کو۔"

بیگم وقار بات کو رفع دفع کرنے کی خاطر بولیں۔

"اس دفعہ بوا برکت نے بڑی اچھی لڑکی کا رشتہ بتایا ہے میرا دل کہتا ہے اب کی بار شکیل انکار نہ کر سکے گا۔"

وقار صاحب طنزیہ انداز سے مسکرا کر بولے۔

"آپ کا دل! وہ تو ہے نرا دھوکے باز پچھلے پندرہ بیس دفعہ سے آپ کو بے وقوف بنائے جا رہا ہے اور آپ ہیں کہ ہر دفعہ اس کی باتوں میں آجاتی ہیں۔"

بیگم وقار کچھ برا مان کر بولیں۔

"لیجیے اب آپ نے میرے دل کو ہی برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔" وقار صاحب ایک دفعہ پھر کڑی نگاہوں سے شکیل کی طرف دیکھ کر بولے۔

"بیگم اگر آپ نے اس معاملے کو میرے ہاتھ میں دیا ہوتا تو اب تک اس کی کیا اس کے باپ کی بھی چار شادیاں کرا چکا ہوتا۔"

بیگم وقار کچھ چونک کر قدرے بلند آواز میں بولیں۔

"جی! کیا مطلب ہے اس بات سے آپ کا!"

وقار صاحب اطمینان سے بولے۔

"ہاں' اس جملے میں چند الفاظ زیادہ بول گیا ہوں' مگر خیر! کوئی تشویش کی بات نہیں ہے۔"

بیگم وقار تیوریاں چڑھا کر بولیں۔

"تشویش کی بات ہے کیسے نہیں؟ آخر آپ نے یہ بات کہی کیسے؟"

"ارے بھئی! اپنا جھگڑا بعد میں نمٹالیں گے ہم دونوں پہلے تو اس معاملہ کو چکاؤ۔"

پھر وہ شکیل سے مخاطب ہو کر بولے۔

"کیوں برخوردار! کتنا اسکور ہو گیا ہے تمہارا؟"

شکیل تو مارے گھبراہٹ کے کچھ بول نہ سکے۔البتہ روبینہ نے کہا۔

"ابو میرا خیال ہے پینتیس ناٹ آؤٹ۔"

شکیل نے کھا جانے والی نگاہوں سے روبینہ کی طرف دیکھا مگر وہ انجان بن کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"دیکھو میاں! میں سمجھتا ہوں خاصا اسکور کر چکے ہو تم اب میں تمہیں مزید رن بنانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

مقررہ دن اور وقت پر بیگم وقار روبینہ اور اپنی ایک شادی شدہ بیٹی کو ساتھ لے کر برکت بوا کے بتائے ہوئے پتے پر جا پہنچیں ان تینوں کو تو لڑکی اچھی خاصی ہی لگی انہوں نے دل ہی دل میں دعا بھی کی کہ شکیل الرحمٰن بھی اس لڑکی کو پسند کر لیں۔

گھر واپس آئیں تو شکیل بہت متجسس اور بے چین تھے۔ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اماں بہنوں کے گھر میں گھستے کے ساتھ ہی سوالات کی بوچھاڑ کر کے اس لڑکی کا جغرافیہ تاریخ سب معلوم کر لیں

اور ساتھ ہی یہ بھی پوچھ لیں کہ ان لوگوں کو یہ شرط بھی منظور ہے کہ نہیں کہ لڑکا لڑکی کو خود دیکھے گا-

مگر اماں بہنیں بھی شاید ان کا امتحان لینے پر آمادہ تھیں- بیگم وقار تو آتے کے ساتھ ہی اپنے بستر پہ اس طرح پڑ گئیں جیسے میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہوں اور گاڑی میں نہیں پیدل چل کر آئی ہوں-

روبینہ کو آتے ہی گھر کی چائے پینے کی ضرورت محسوس ہوئی اس کی یہ خاص عادت تھی کہ دوسروں کے گھر سے کتنی ہی اور کیسی ہی اچھی چائے پی کر آئے لیکن جب تک اپنے گھر کی چائے نہیں پی لیتی تھی اسے اطمینان ہی نہیں ہوتا تھا-

رخشندہ آپا کو آتے ہی اپنے دونوں بچوں کامران اور عندلیب کی فکر لگ گئی- جنہوں وہ ملازمہ کے پاس چھوڑ کر گئی تھیں-

شکیل سب سے پہلے کچن میں روبینہ کے پاس ہی جا پہنچے-

''کیوں روبی! کیسی ہے تمہاری ہونے والی بھابی؟''

روبینہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی-

''ہائے خدا وہ دن تو لائے جب وہ ہماری بھابی بن سکے-''

''اوہو! یہ تو بتاؤ پسند بھی آئی تم لوگوں کو!''

''رونا تو اس بات کا ہے کہ بات صرف ہماری پسند پہ ہی آ کے نہیں ختم ہو جاتی-''

شکیل جھنجلا کر بولے-

''افوہ! اب کہہ بھی چکو بتا بھی چکو-''

روبینہ نے یہ کہہ کر بات ٹال دی-

''ابھی تو میرے حواس ہی درست نہیں ہیں بھائی جان! میں چائے پی کر آتی ہوں جب تک آپ رخشندہ آپا کی پسند پوچھ لیجیے-''

شکیل الرحمٰن رخشندہ آپا کے پاس پہنچے تو ان کے بیٹے کامران کو نزلہ تھا اور وہ اسے رومال سے ناک صاف کرنے کا طریقہ باقاعدہ پریکٹیکل کر کے سمجھا رہی تھیں-

شکیل الرحمٰن نے پوچھا-

''کیوں رخشندہ! دیکھ آئیں لڑکی-''

''ہاں بھیا! دیکھ آئے-''

''کیسی ہے؟''

''کون سا آپ ہماری پسند سے شادی کر لیں گے-''

''پھر بھی کچھ پتہ تو چلے-''

''اے ہے ذرا تو صبر کریں بھیا! دیکھ نہیں رہے میں اپنے بچے کو ناک صاف کرنے کا طریقہ

سمجھا رہی ہوں-''

''لاحول ولا قوۃ''

وہ جھلا کر اپنی امی کے پاس جا پہنچے-

بیگم وقار سے بھی انہوں نے وہی سوال کیا-

بیگم وقار نے کہا-

''دیکھو بیٹا! ہمیں تو لڑکی پسند آ گئی ہے خدا کے لیے اب تم اس میں مین میخ نہ نکال بیٹھنا-''

''یہ تو بتایا نہیں کہ ہے کیسی؟''

بیگم وقار کچھ زچ ہو کر بولیں-

''ارے بابا انسان کی بچی ہے اور'' .... ''صرف انسان کی ہی بچی سے شادی کرنی ہوتی تو اب تک اتنی بہت ساری لڑکیوں کے لیے کیوں انکار کیے جاتا-''

بیگم وقار چونک کر بولیں-

''اے ہے! تو کیا کسی حیوان کی بیٹی سے شادی کرنے کا ارادہ ہے تمہارا-''

شکیل الرحمٰن گڑبڑا کر بولے-

''میرا مطلب ہے کہ لڑکی خوبصورت بھی تو ہونی چاہیے-''

''اب تم اس حسن اور خوبصورتی کا پیچھا چھوڑ بھی دو دیکھ نہیں رہے ہو تم اپنے باپ کو آج کل کس قدر غیض وغضب کے عالم میں ہیں-''

''لیکن امی....''

شکیل نے کچھ کہنا چاہا-

''لیکن ویکن کچھ نہیں بیٹا! بس اس بار تمہیں لڑکی پسند کرنی ہی پڑے گی- غضب خدا کا 'عمر ہے کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے کیا بڑھاپے میں شادی کرو گے تم؟''

شکیل خاموش ہو گئے-

لیکن اس بار بھی وہی ہوا جو پہلے بہت دفعہ ہوتا آیا تھا یعنی شکیل الرحمٰن کو لڑکی پسند نہ آئی-

انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے تو کوئی خاص نہیں لگی اس دفعہ کے انکار نے تو بیگم وقار کو بالکل عاجز کر دیا- انہوں نے اچھی طرح بیٹے کے لتے لیے اور کہہ دیا کہ اب مجھ میں زیادہ جوتیاں گھسنے کی ہمت بالکل نہیں ہے- تمہاری مرضی ہے چاہے شادی کرو یا نہ کرو-

بہنوں نے بھی منہ پھیر لیا-

وقار صاحب بھی خوب گرجے برسے-

بیٹے کو اچھی طرح ڈانٹا ڈپٹا-

"میاں صاحبزادے آخر تم اپنے آپ کو سمجھتے کیا ہو؟"

صاحبزادے جواب میں کچھ نہیں بولے۔ بس سر جھکا لیا۔ وقار صاحب نے کہا۔

"سر تو اس طرح جھکا رہے ہو جیسے بڑی فرمانبرداری' تابعداری سے اپنی رضامندی کا اظہار کر رہے ہو۔"

قریب کھڑی ہوئی روبینہ نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی۔

وقار صاحب درشت لہجے میں بولے۔

"آج تم مجھے یہ بات بتا ہی دو کہ آخر تم کس خوش فہمی کا شکار ہو جو اپنے سامنے کسی لڑکی کو گردانتے ہی نہیں۔"

شکیل نے ڈرتے ڈرتے کچھ کہنے کی کوشش کی تو انہوں نے خاصے کڑک دار لہجے میں کہا۔

"اور اس نامعقول مخبوط الحواس شخص کا نام بھی بتا دو جس نے تمہیں اس خوش فہمی میں مبتلا کیا ہے کہ تم شہزادہ گلفام ہو یا تمہارا باپ یوسف ثانی ہے۔"

شکیل الرحمٰن کے ماتھے سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وقار صاحب چشمے کے دبیز شیشوں میں سے انہیں گھورتے ہوئے اپنی کہے گئے۔

"آخر کن حسینوں' مہ جبینوں کے خاندان سے تعلق ہے تمہارا جو تمہاری نگاہ میں کوئی لڑکی سماتی ہی نہیں۔"

اس وقت ان کی بیگم سامنے آ گئیں تو وقار صاحب اپنی بیوی سے الجھ پڑے۔

"آپ نہیں سدھار سکیں گی صاحبزادے کو میں پھر کہتا ہوں آپ انہیں مکمل طور پر میرے حوالے کر دیجیے۔"

پھر وہ دل ہی میں فیصلہ کرتے ہوئے بولے۔

"بہرحال! اب چاہے لڑکی اسے پسند ہو یا ناپسند ہو شادی اسی لڑکی سے ہو گی۔"

شکیل الرحمٰن نے بے حد گھبرا کر التجا آمیز نگاہوں سے اپنی امی کی طرف دیکھا۔

بیگم وقار بیٹے کی نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولیں۔

"میرا خیال ہے آپ اسے ایک موقع اور دے دیں۔"

شکیل میاں بھی بڑی ہمت کر کے گھگھیا کر بولے۔

"جی ابو! بس ایک چانس اور دے دیجیے پلیز!"

وقار صاحب بگڑ کر بولے۔

"ہرگز نہیں! ایک' ایک کر کے جانے کتنے چانس تمہیں مل چکے ہیں مگر تم ہو کہ آج تک کنوارے کے کنوارے بیٹھے ہو۔"

بیگم وقار نے پھر بیٹے کی سفارش کی "میرے کہنے سے ایک آخری موقع اور دے دیں اسے ...."

"اب مزید کوئی موقع دینے کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔"

کافی دیر اسی تکرار میں گزر گئی دونوں ماں بیٹے خوشامد پہ خوشامد کیے جا رہے تھے لیکن وقار صاحب ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ وہ اپنی ہی کہے جا رہے تھے۔

"ایک ہیں تو فرنگن سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے ولایت میں ہی بس گئے۔ پوتا پوتی کی ایک عدد تصویر بھجوا کر سمجھتے ہیں کہ بڑا احسان کیا ہے ہمارے اوپر۔"

ایک سیکنڈ کے لیے رک کر وہ پھر بولے۔

"یہ دوسرے ہیں تو کسی لڑکی کو پسند ہی نہیں کرتے' رہ گئے ہم تو پوتا پوتی کو کھلانے کی حسرت لیے قبر میں ہی جا سوئیں گے۔"

بیگم وقار جلدی سے بولیں۔

"اے ہے خدا نہ کرے کیوں بدفال منہ سے نکال رہے ہیں پوتا پوتی بھی کھلا لیجیے گا۔"

"آخر کب کھلا لیں گے' آب حیات تو پی نہیں رکھا ہے' ہم نے جو قیامت تک زندہ رہیں گے۔"

بیگم وقار بات کو ٹالتے ہوئے بولیں۔

"چلیے چھوڑیے کوئی اور بات کیجیے۔"

وقار صاحب خاصے ضدی لہجے میں بولے۔

"نہیں اس وقت تو میں سوائے اس کے اور کسی موضوع پر بات ہی نہیں کروں گا۔"

"اس سے کہو ابھی اور اسی وقت ہامی بھر لے اس لڑکی سے شادی کرنے کی۔"

شکیل میاں نے پھر التجا آمیز نگاہوں سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

روبینہ اس تمام گفتگو کے دوران خاموش ہی رہی تھی۔ وہ ایک طرف بیٹھی چپ چاپ سب کی باتیں سن رہی تھی۔

بیگم وقار نے کہا۔

"روبینہ بیٹی! تم ہی بھائی کی سفارش کر دو باپ سے۔"

روبینہ نے ایک شانِ بے نیازی سے کہا۔

"میں کیا سفارش کروں امی؟ اور پھر یہ کہ آخر کوئی کب تک سفارش کر سکتا ہے بھائی جان کی؟"

بیگم وقار بگڑ کر بولیں۔

"کیسی بہن ہو تم؟ ذرا درد نہیں ہے تمہارے دل میں بھائی کے لیے۔"

"ابو ایک موقع اور دے دیں بھائی جان کو۔"

"کیا مطلب؟ یعنی تم بھی بھائی کی حمایت کرنے لگیں۔"

"اسے آپ حمایت نہ سمجھیں بس کیا کیا جائے' مجبوری ہے۔"

"کیسی مجبوری؟ کس بات کی مجبوری؟"

روبینہ نے کہا۔

"بس اس دفعہ کے بعد ان کی بالکل نہیں سنی جائے گی۔"

وقار صاحب نے کہا۔

"مگر تم اس بات کی ذمہ داری لو کہ اب جو لڑکی دیکھی جائے گی اسے تمہارے بھائی صاحب ریجیکٹ نہیں کریں گے۔"

روبینہ گڑبڑا کر اور گھبرا کر بولی۔

"مم۔مم میں ابو میں کیسے ذمہ داری لے سکتی ہوں اتنی بڑی بات کی؟"

شکیل نے نگاہوں ہی نگاہوں میں بہن کی خوشامد کی۔

"لے لو نا ذمہ داری؟"

روبینہ کچھ سوچ کر بولی۔

"اچھا! میں لیے لیتی ہوں ذمہ داری اب کے سے بھائی جان کو لڑکی پسند کروا کے ہی چھوڑوں گی۔"

یوں اس وقت یہ معاملہ رفع دفع ہو گیا برکت بوا کے ذریعہ اس دفعہ پھر انکار کروا دیا گیا۔

تین چار مہینے گزر گئے تو گھر گھر جھانکنے والی برکت بوا نے پھر ایک رشتہ بتایا بقول ان کے اس دفعہ انہوں نے واقعی شکیل میاں کے لیے چندے آفتاب چندے ماہتاب لڑکی ڈھونڈی تھی۔

اماں بہنیں پھر بن سنور کر لڑکی دیکھنے چل دیں۔لڑکی کو دیکھ کر تو واقعی ان لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔برکت بوا نے غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا۔شکیل الرحمٰن کے لیے اب تک جتنی لڑکیاں دیکھی جا چکی تھیں ان سب سے اچھی تھی یہ لڑکی مالی حالت بے شک اچھی نہیں تھی۔کھانے والے زیادہ تھے اور کمانے والے تین۔باپ بیٹا اور ایک وہ لڑکی خود لڑکی ایم۔اے۔بی۔ایڈ تھی اور کسی اسکول میں پڑھاتی تھی لڑکے کی تعلیم بھی جاری تھی اور ساتھ ہی وہ پارٹ ٹائم جاب بھی کرتا تھا۔ان دونوں کے علاوہ تین بہنیں، دو بھائی اور بھی تھے سبھی پڑھ رہے تھے تعلیم کا خرچہ کوئی تھوڑا ہوتا ہے ماں باپ اور سات بہن بھائیوں کے علاوہ دادا دادی ایک بیوہ پھوپھی اور ان کے دو بچے بھی تھے۔

گھر کی حالت زار دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں کی گزر بسر کس طرح ہوتی ہوگی۔

آپس میں بات چیت ہوئی لیکن جب ان لوگوں کو یہ بات معلوم ہوئی کہ لڑکا لڑکی کو دیکھنے کا خواہش مند ہے تو انہوں نے اعتراض کیا۔دادا دادی کو تو سخت ناگوار گزری یہ بات۔ماں بھی اس کے حق میں نہیں تھیں البتہ پھوپھی، باپ اور بھائی کا خیال تھا کہ زمانہ بہت آگے جا رہا ہے اس زمانے میں ایسے دقیانوسی پن کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔

غرض کہ کسی نہ کسی طرح لڑکی کے دادا دادی اور ماں کو بھی اس بات کے لیے آمادہ کر ہی لیا گیا۔ لڑکی کو لڑکے کے سامنے کر دیا جائے لڑکی کے بھائی نے یہ تجویز پیش کی کہ شکیل صاحب اگر چاہیں تو لڑکی کو اس وقت دیکھ لیں جب وہ گھر سے اسکول جاتی ہے۔

شکیل نے اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے اسی پر عمل کیا ویسے وہ اس کی تصویر بھی دیکھ چکے تھے۔ اور پھر.... واقعی شاید اس لڑکی کی قسمت اچھی تھی جو شکیل میاں نے اسے پسند کر لیا۔بیگم وقار نے اطمینان کا سانس لیا روبینہ نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔ورنہ وہ تو ڈر رہی تھی کہ اگر اس دفعہ بھی بھائی جان نے لڑکی ریجیکٹ کر دی تو پھر ابو کے عتاب کا نشانہ مجھے بننا پڑے گا۔

شکیل الرحمٰن بڑے فخر سے اپنے دوستوں کو بتاتے پھرے۔

"اس دفعہ میں نے میدان مار لیا ہے۔"

"تم لوگ سمجھتے تھے کہ میری من پسند لڑکی مجھے کبھی مل ہی نہیں سکے گی۔لیکن ڈھونڈے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔وہ تو ایک لڑکی ہے میری ہونے والی دلہن۔"

سبھی حیران تھے کہ آخر یہ سب کچھ ہو کیسے گیا۔

برکت بوا کے ذریعہ بیگم وقار نے کہلوا دیا کہ لڑکی ہم لوگوں کو بہت پسند آئی ہے ہم شادی کی تاریخ جلدی طے کرنے آئیں گے۔

اسی دوران ایک روز روبینہ کو دیکھنے کے لیے بھی کچھ خواتین آئیں ویسے روبینہ کی طرف سے بیگم وقار کو اطمینان ہی تھا کہ ماشاءاللہ اچھی شکل وصورت کی لڑکی ہے اس کی بات تو طے ہو ہی جائے گی۔

تین چار روز بعد برکت بوا منہ لٹکائے ہوئے آئیں اور بڑے بجھے بجھے سے لہجے میں بتایا کہ دونوں میں سے کوئی بھی رشتہ طے نہیں ہو سکا۔لڑکے والوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہمارے بیٹے کو دبلی پتلی نازک سی لڑکی چاہیے۔شادی سے پہلے ہی لڑکی گداز جسم کی ہو تو وہ بعد میں موٹی اور بھدی ہو جاتی ہے۔

لڑکی کے گھر والوں نے یہ کہہ کر شکیل میاں کو ریجیکٹ کر دیا کہ ہماری لڑکی ایسے لڑکے سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں ہے جو اب تک چھتیس لڑکیوں کو محض ان کی کسی معمولی سی خامی پر ریجیکٹ کر چکا ہو حسین وجمیل لڑکی سے شادی کرنے کے خواہش مند لڑکے کو خود اپنا بھی جائزہ لینا چاہیے کہ آخر وہ خود کیا ہے۔"

اتنی بہت ساری لڑکیوں کو رد کرنے کی بات برکت بوا بیچاری اپنی سادگی میں بتا آئی تھیں ان کی زبان سے کہیں نکل گیا تھا کہ "آپ لوگوں کی لڑکی تو بڑی خوش قسمت ہے جو شکیل میاں نے اسے پسند کر لیا ورنہ اب تک چھتیس لڑکیوں کے لیے انکار کر چکا ہے لڑکا۔"

برکت بوا جب لڑکی والوں کی طرف سے انکار لے کر آئیں تو شکیل الرحمٰن بھی اپنی امی کے پاس

بیٹھے تھے۔

اتنا کچھ سن کر ان کے دل و دماغ کی کیفیت نا قابل بیان ہوگئی۔

وہ چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے آئے۔

انہیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کا جسم بے جان ہو چکا ہو۔

بیگم وقار کے کمرے سے اپنے کمرے تک جاتے ہوئے انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے....

وہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی لاش گھسیٹتے لیے جا رہے ہیں۔ کس قدر سخت توہین محسوس کر رہے تھے وہ۔

اپنی ذلت کا احساس ان کے لیے کتنا اذیت ناک تھا۔

ان کے دماغ پہ ہتھوڑے سے برس رہے تھے۔

ایک صدا تھی جو مسلسل دماغ کے پردوں سے ٹکرا رہی تھی۔

اچھا میں بھی رد کیا جا سکتا ہوں؟

اچھا مجھے بھی کوئی ریجیکٹ کر سکتا ہے؟

ان کی نگاہوں کے سامنے ان کے دوستوں کے چہرے تھے۔ طنزیہ انداز سے ہنستے ہوئے مسکراتے ہوئے چہرے۔

ان کے کانوں میں اپنے دوستوں کے قہقہوں اور طنزیہ فقروں کی آوازیں گونج رہی تھی۔

انہیں پتہ ہی نہ چلا کب برکت بوا واپس گئیں؟

کب رات ہوئی؟

کب گھر والوں نے کھانا کھایا؟

وہ تو تمام رات دلی کرب اور ذہنی اذیت سے گزر رہے تھے۔

اپنے ساتھ ساتھ روبینہ کے ریجیکٹ کیے جانے کا احساس بھی ان کے لیے سوہان روح تھا۔

آج جب اپنی بہن کے لیے کسی کا انکار سنا تو انہیں ان تمام لڑکیوں کے دلی جذبات و احساسات کا اندازہ ہوا۔

انہوں نے سوچا۔

وہ بھی لڑکیاں تھیں۔

ان کے دل کس طرح ٹوٹے ہوں گے؟

ان کے گھر والوں پر کیا کچھ گزر گئی ہوگی جب میں نے انکار کیا ہوگا؟

تمام رات شکیل الرحمٰن کو ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے ان پر تازیانے برستے رہے ہوں۔

خوابوں کے دھنک رنگ پیرہن

اگست 1976ء

وجو چچا کی شادی کے موقع پر ان دونوں نے ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دلہن چچی کو پسند کرنے سے لے کر مہندی کی رسم تک صباحت گھر کی بڑی بوڑھیوں اور بہنوں کے ہمراہ جانے کتنی دفعہ ان کے گھر گئی تھی۔ لیکن وہ چہرہ تو اسے ایک دفعہ بھی نظر نہ آیا تھا۔ پھر بھلا اسے کیسے خبر ہو جاتی کہ دلہن سے اس کا کیا رشتہ ہے۔

ہاں تو ہوا یوں تھا کہ جب آرسی مصحف کی رسم کے وقت وجو چچا کے چچیرے، ممیرے اور پھپھیرے بھائیوں کے ہمراہ ان کے دو ایک لنگوٹیے یار بھی وجو چچا کے دم کے ساتھ بندھے اندر چلے آئے تو اس ریلے کے ساتھ دلہن چچی کے گھرانے کے بھی چند لڑکے یقیناً لڑکیوں کو تاکنے کے لئے اندر گھس آئے۔ کم از کم صباحت کا خیال یہی تھا۔ حالانکہ یہ بھی ممکن تھا کہ انہیں آرسی مصحف کی رسم سے اتنی دلچسپی ہو کہ اسے دیکھنے کی خاطر اندر چلے آئے ہوں۔

لیکن ظفر غریب تو اس مقصد کے تحت ہرگز اندر نہیں آیا تھا۔ وہ تو بس اپنا کیمرہ سنبھالے کھٹا کھٹ لوگوں کے چوکھٹے بنانے میں مصروف تھا۔ اس نے کسی بھی لڑکی کی طرف خاص طور سے یا بہت غور سے نہیں دیکھا تھا۔

صباحت کو آرسی مصحف کی رسم سرے سے ناپسند تھی۔ اس کی وجہ وہ طوفان بدتمیزی تھی۔ جس کا مظاہرہ اس موقع پر ضرور ہوتا تھا۔ عورتیں اور بچے دولہا دلہن کو دیکھنے کی خاطر ایک دوسرے کو دھکے

مار کر، پاؤں کچل کر آگے بڑھنے کی جو غیر شریفانہ حرکت کرتے ہیں وہ صباحت کے لئے ناقابل برداشت تھی- اس نے ایک دفعہ نہیں کئی دفعہ کہا تھا-

''اماں! یہ فضول رسم بالکل نہ کیجئے گا-''

مگر اس کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دیا گیا- وہ کوئی اماں یا دادی اماں کی ساس تو تھی نہیں جو اس کی بات کو حکم کا درجہ دے کر فوراً سر جھکا دیا جاتا-

ایک تو جون کے مہینے کی سخت گرمی، اوپر سے لڑکیوں اور عورتوں کے ریشمی کپڑوں، زیورات کو دیکھ کر گرمی کا احساس کچھ زیادہ ہی ہو رہا تھا- ہال میں پنکھے چلنے کے باوجود گرمی ہو رہی تھی- اس گرمی اور بھیڑ بھاڑ سے صباحت ویسے ہی پاگل دیوانی ہو رہی تھی- اسے سارے مجمع کو چیر کر سب سے آگے بڑھنے کا کوئی شوق نہیں تھا- اسی لئے وہ اپنی چہیتی سہیلی فرحت کے ساتھ سب سے پیچھے دیوار سے لگی کھڑی تھی-

اماں کئی دفعہ نعرہ لگا کر اس سے آگے آنے کے لئے کہہ چکی تھیں اور یہ سمجھ بیٹھی تھیں کہ شاید جگہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ روٹھی ہوئی پیچھے کھڑی ہے خود اٹھ کر مجمع کو چیرتی چھاڑتی اسے بلانے کے لئے آ گئیں تھیں- اسی وقت ظفر سے یہ قصور سرزد ہو گیا کہ دلہن چچی کی تصویر اتارنے کے لئے پیچھے جو سرکا تو اس کے جوتے کی موٹی سی ایڑی سے صباحت کی ایک نہ دو پوری تین انگلیاں کچل گئیں- وہ تکلیف سے چیخ ہی تو اٹھی- ظفر کو آگے کی طرف ایک دھکا دے کر وہ بڑبڑانے لگی-

''آپ ہوش میں تو ہیں- آ گئے بڑے فوٹو گرافر بن کے، بھالو کہیں کے-''

اس نے ظفر کے بڑے بڑے بالوں پر چوٹ کی-

ظفر کو اس بدتمیزی پر غصہ تو بہت آیا لیکن پھر بھی اس نے معذرت کی کیونکہ نادانستگی میں اس سے غلطی ہو چکی تھی-

اماں نے صباحت کو اس کی بدتمیزی پر ڈانٹا- کیونکہ انہیں معلوم ہو چکا تھا کہ ظفر کا دلہن چچی سے کیا رشتہ ہے- صباحت اماں کی ڈانٹ سے شعلہ جوالہ بن گئی-

''انہیں کچھ نہیں کہتیں، الٹا مجھے ڈانٹ رہی ہیں بھرے مجمع میں-''

صباحت کی پیشانی کچھ اور شکن آلود ہو گئی-

ظفر کے ساتھ اس کے دوست نے بھی معذرت کی تو اس نے جھلا کر کہا-

''اچھا بابا معاف کر دیا، لیکن اب ختم کیجئے یہ چکر بازی-''

ظفر کے دوست نے حیران ہو کر پوچھا-

''جی- کون سی چکر بازی؟''

''یہی تصویریں اتارنے کی-''

''کمال کرتی ہیں آپ بھی، یہ تصویریں تو یادگار بن جاتی ہیں؟'' ظفر کے دوست نے کہا-

صباحت نے ایک شانِ استغنا سے کہا-

''ہم خود اتار لیں گے دلہن کی تصویریں اپنے گھر لے جا کر-''

''ہاں، آپ ضرور اتاریئے گا تصویریں، لیکن ہمیں بھی اپنی خوشی پوری کر لینے دیجئے-''

اماں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اس منہ پھٹ لڑکی کو چپ کروائیں- بس یہی ایک طریقہ تھا کہ وہ اسے ہٹا کر اپنے ساتھ لے جاتیں- انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر کہا-

''چلو تم اور فرحت ادھر چل کر بیٹھو ہمارے ساتھ-''

''کیوں؟''

''اپنی دلہن چچی کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں اتروا لو-''

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے اپنے کارٹون بنوانے کا-''

''کارٹون-'' اماں نے حیران ہو کر کہا-

''جی ہاں، اور کیا- ان سے آپ اور کیا توقع رکھے ہوئے ہیں-''

صباحت نے ظفر کی طرف اشارہ کیا-

ظفر کا چہرہ کانوں کی لوؤں تک سرخ ہو گیا- اس نے پلٹ کر شعلہ بار نگاہوں سے صباحت کی طرف دیکھا-

''کیا مطلب ہے آپ کا، میں کارٹون بنا رہا ہوں؟''

''تو اور کیا کر رہے ہیں؟''

''دیکھئے، میں بہت برداشت کر چکا ہوں آپ کے ریمارکس، اس سے زیادہ کی توقع نہ رکھئے گا آپ مجھ سے-''

صباحت نے اس کے غصے سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا-

''ابھی میں نے کہا ہی کیا ہے آپ کو-''

اماں تو صباحت کی اس حرکت پر غصہ بھول کر پریشان ہو گئیں اور سوچنے لگیں-

''یا اللہ اس لڑکی کو ذرا خیال نہیں کہ کیسا موقع ہے اور کس کا گھر ہے؟''

ظفر نے صباحت سے کہا-

''کبھی آپ مجھے بھالو کہتی ہیں، کبھی فوٹو گرافر اور......''

صباحت نے اس کی بات کاٹ کر زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا-

''ہاں تو کیوں رکھ چھوڑے ہیں گز بھر لمبے بال- چاہے اچھے لگیں یا نہ لگیں- بس فیشن کرنے سے مطلب-''

اماں نے غصے سے صباحت کی طرف دیکھا اور بولیں-

''کیوں بکواس کئے چلی جارہی ہو تم؟ کچھ پتہ بھی ہے یہ کون ہے؟''

صباحت نے پوچھا-

''کون ہے؟''

''تمہاری دلہن چچی کا بھائی ہے-''

''تو کیا ہوا؟''

صباحت نے لاپرواہی سے کہا-لیکن دل میں حیران ضرور ہوئی کہ یہ ایک نیا بھائی کہاں سے نکل آیا پھر فوراً ہی اماں کی طرف دیکھ کر اطمینان سے بولی-

''ارے اماں، میرا خیال ہے، سوتیلے بھائی ہوں گے ان کے-''

ظفر کا دوست یہ بات سن کر ہنس پڑا-ظفر بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکا-لیکن اس نے منہ پھیر کر اپنی مسکراہٹ کو صباحت کی نظروں سے چھپالیا-

پھر اماں صباحت کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتی ہوئی ساتھ لے گئیں فرحت بھی ان کے پیچھے پیچھے چل دی-

ظفر نے اپنے دوست کی طرف دیکھتے ہوئے کہا-

''معلوم ہوتا ہے پاگل خانے سے چھوٹ کر آئی ہیں یہ محترمہ-''

اس کے دوست نے کہا-

''ذرا دیر میں حجامت بنا ڈالی تمہاری-''

''مجھے تو اپنی بہن کی فکر پڑگئی ہے، اسے تو ناک چنے چبوادے گی-'' ظفر نے دوبارہ اپنا کیمرہ سنبھالتے ہوئے کہا-

رخصتی کے ہنگامے کے وقت ظفر کی شامت ہی آئی تھی جو صباحت سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی-صباحت نے کن انکھیوں سے اوپر سے نیچے تک ظفر کا جائزہ لیا اور فرحت سے مخاطب ہوئی-

''اگر مرد کا قد چھوٹا ہو تو اونچی ایڑی کا جوتا پہن لینے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن جب پہلے ہی تاڑ ایسا قد ہو تو اونچی ایڑی کا جوتا پہننا سراسر حماقت ہے-''

ظفر کا خون کھول کر رہ گیا، وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا-

رات کو جب سارے ہنگامے سرد پڑ گئے اور ظفر بھی تھکن سے چور ہو کر اپنے بستر پر آیا تو ہلکی

نارنجی شلوار کرتے میں ملبوس صباحت کا سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا، اس کے ساتھ ہی وہ جملے بھی اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا گئے جو صباحت نے اس کی شان میں کہے تھے-ظفر سرتاپا سلگ اٹھا-

''پتہ نہیں، اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہے، مجھے بھالو بنا دیا-''

''اس سے پہلے تو کسی نے بھی میرے ہیراسٹائل کو ناپسند نہیں کیا-''

صباحت کی دوست فرحت کا بھی یہی خیال تھا کہ نہ تو اونچی ایڑی کے جوتے کی وجہ سے ظفر کو ناپسندیدہ شخصیت قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی بڑھے ہوئے بالوں کی وجہ سے وہ نہ صرف اچھا لگ رہا تھا بلکہ بہت اچھا لگ رہا تھا-اگر تنقیدی نگاہ سے بھی اس کا جائزہ لیا جاتا تو بھی کوئی پوائنٹ اس کے خلاف نہیں جاتا تھا-

''معلوم نہیں کیوں صباحت اس کے پیچھے پڑگئی تھی؟'' فرحت نے سوچا-

دوسرے روز صبح دلہن چچی کے میکے سے ان کی بہنیں اور بھائی انہیں لینے آئے لیکن ظفر نہیں آیا-ان لوگوں کے آنے سے پہلے صباحت کو جب دلہن چچی سے بات کرنے کا موقع ملا تو اس نے اپنے داہنے پاؤں کی سرخ سرخ انگلیاں انہیں دکھاتے ہوئے کہا-''دیکھئے دلہن چچی! وہ جو آپ کے سوتیلے بھائی ہیں نا-انہوں نے میری نرم و نازک انگلیوں کا کیا حشر کیا ہے؟''

دلہن چچی پلکیں جھپکائے بنا اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے اس کی طرف تکتی رہ گئیں-

وہ اس سے پوچھنے ہی والی تھیں کہ:

''میرا کون سا سوتیلا بھائی ہے؟''

لیکن عین اسی وقت عورتوں اور لڑکیوں کا ایک ریلا اندر آ گیا اور وہ بیچاری سر جھکا کر بیٹھ گئیں-

شام کو ولیمہ تھا-ظفر بھی اپنا اچھا سا سوٹ پہنے اور کاکلیں سنوارے موجود تھا مگر صباحت سے اس کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی اور نہ ہی اسے صباحت کو دیکھنے کی کوئی تمنا تھی-صباحت بھی اس کا دیدار کرنے کے لئے مری نہیں جارہی تھی-سرخ ستاروں سے جھلملاتی ہوئی نیوی بلیو ساڑی کا پلو لہراتی ہوئی وہ اپنے آپ میں اور اپنی سہیلیوں میں بہت مگن تھی-اس کے کھنکتے ہوئے قہقہے بار بار لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے-

اتنی اونچی آواز سے ہنسنے پر دادی اماں اسے کئی بار ٹوک چکی تھیں-

''اتنی اونچی آواز سے نہ ہنسو بٹیا-مردانے میں آواز جارہی ہوگی-''

وہ بڑی مسکین سی صورت بنا کر کہتی-

''کیا کروں دادی اماں، میرے حلق میں تو بانس ٹھنکا ہوا ہے-''

عطو باجی کے منے نے ٹھنک ٹھنک کر اپنے ابو کو یاد کیا تو انہوں نے اسے صباحت کو لا تھمایا۔

''صبو! کسی بچے سے کہو اسے اس کے ابو کے پاس پہنچا دے۔''

''اوہو باجی! کیا غضب کرتی ہیں۔ میری ساڑی کی فال خراب ہو جائے گی۔ میں کسی بچے کو گود میں نہیں اٹھا سکتی۔''

''افوہ۔ اب اتنا نہ اتراؤ، جیسے تمہارے تو کبھی بچے ہوں گے ہی نہیں۔ پھر دیکھوں گی تمہاری ساڑی کے فال۔''

ان کے قریب بیٹھی عورتیں ایک دم ہنس پڑیں۔

''پھر میں ساڑی باندھنا چھوڑ دوں گی۔''

صباحت بہت ڈھٹائی سے مسکرائی اور ان کے منے کو اٹھا کر باہر نکل گئی۔ منے کو صلو کی گود میں دیتے ہوئے اس کی نگاہ جو اٹھی تو دیکھا کہ قدرے فاصلے پر ظفر کھڑا اپنے دوست سے باتیں کر رہا تھا۔

''یہ ان حضرت کا دم چھلہ ہے۔'' صباحت نے دل ہی دل میں سوچا اور شوخی وطنز میں ڈوبی ہوئی مخصوص سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی اسی وقت ظفر نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ اس کی خوبصورت پیشانی پر ناگواری شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''واہ۔ کیا ادا ہے؟ بچے تو ذرا بھی نہیں۔''

صباحت نے سوچا اور پھر اپنے آپ سے بولی۔

''اتنی گرمی میں سوٹ پہننے کی کیا ضرورت تھی۔ سیدھی سادی پتلون اور بش شرٹ میں آ جاتا تو کوئی محفل سے نکال تو نہ دیتا۔''

وہ تو ظفر غریب کے بارے میں اور جانے کیا کیا سوچ بیٹھتی۔ لیکن عین اسی وقت کوئی بچہ اماں کا پیغام لئے اسے بلانے آ گیا اور وہ ظفر پر نئے سرے سے ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر اندر چل دی۔

ولیمہ ختم ہوا، چوتھی چالے کی رسمیں بھی ختم ہوئیں اور آخر کار گھر میں سکون ہو گیا۔ اس دوران میں دلہن چچی بھی گھر کے لوگوں کے ساتھ فری ہو گئیں۔ تبھی ایک دوپہر جب صباحت یونیورسٹی سے آ کر کپڑے بدلے اور کھانا کھائے بغیر ان کے ساتھ بستر پر آڑی ترچھی نیم دراز تھی تو دلہن چچی نے کہا۔

''صبو ایک بات بتاؤ۔''

''نہیں، میں تو دو بتاؤں گی۔''

''چلو دو ہی بتا دینا۔''

''پوچھیے۔''

''تمہیں کس نے بتایا کہ میرا کوئی سوتیلا بھائی بھی ہے۔''

''کسی نے بھی نہیں۔''

''تو پھر تم......''

''میں نے تو اپنے اندازے سے کہا تھا، اب اتفاق سے یہ بات سچی ہی نکل گئی۔'' صباحت کے لہجے میں فخر تھا۔

دلہن چچی مسکرا کر بولیں۔

''لیکن آخر تم میرے کون سے بھائی کو سوتیلا بھائی سمجھے ہوئے ہو؟''

صباحت نے بہت اطمینان اور سنجیدگی سے کہا۔

''ارے وہی، جس نے عورتوں کی طرح بال بڑھا رکھے ہیں۔''

دلہن چچی کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''میں نے کوئی غلط تو نہیں کہا۔''

''غلط یا صحیح کو تم جانے دو پہلے تو اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو کہ میرے ابا جان نے صرف ایک ہی شادی کی ہے اور میرا کوئی سوتیلا بھائی یا بہن نہیں ہے۔''

''اچھا۔'' صباحت نے قدرے حیرت کا اظہار کیا اور کچھ سوچ کر بولی۔

''تو پھر وہ آپ کا کوئی چچیرا، ممیرا یا پھپھیرا بھائی ہوگا۔''

''جی نہیں محترمہ وہ بالکل میرا سگا بھائی ہے۔''

''اچھا...... کمال ہے۔ آپ کا بھائی تو نہیں معلوم ہوتا۔''

''کیوں ایسی کون سی بات ہے اس میں؟''

''شکل بھی کچھ ایسی ویسی سی ہی ہے اس کی۔''

''کیوں، کیا ہوا اس کی شکل کو؟''

''میرا مطلب ہے آپ سب بہن بھائیوں کی شکلیں تو بہت اچھی ہیں۔''

دلہن چچی نے بڑے لاڈ سے کہا۔

''ارے نہیں صبو! میرا بھائی بہت خوبصورت ہے۔''

''مجھے تو ذرا بھی خوبصورت نہیں لگا۔''

''ہم سب بہن بھائیوں میں سب سے اچھی شکل اسی کی ہے، تم نے غور سے نہیں دیکھا ہوگا۔

''اچھا اب آئے گا تو غور سے دیکھوں گی۔''

دلہن چچی اس کی سادگی پر دل ہی دل میں فدا ہوئی جا رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں۔

"کیسی معصوم اور بھولی لڑکی ہے۔ ذرا احساس نہیں کہ میرے یا کسی اور کے بھائی کے لئے اسے کس انداز سے بات کرنی چاہئے۔ کیا مزے سے کہہ رہی ہے کہ اب آئے گا تو غور سے دیکھوں گی۔"

صباحت نے دوسرا تکیہ بھی گھسیٹ کر اپنے سر کے نیچے رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ رہتا کہاں ہے، پہلے تو کبھی نظر نہیں آیا آپ کے یہاں۔"

"لاہور میں رہتا تھا۔"

"کیوں، وہاں کیا بیچتا ہے؟"

"کیا مطلب؟"

دلہن چچی نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، ان بے چاری کو بھی پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ صباحت نے اپنی زندگی میں بہت کم ہی سیدھے انداز سے بات کی تھی۔ اس کے لئے سب یہی کہتے تھے کہ اس لڑکی کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ لاہور میں کیا کرتا ہے؟"

"میڈیکل میں پڑھتا تھا، پھر ہاؤس جاب کر رہا تھا۔ اب تو وہ یہیں آ گیا ہے۔"

صباحت کو دلہن چچی کی بات سن کر بے ساختہ ہنسی جو آئی تو کسی طرح بریک لگنے میں ہی نہ آیا۔ دلہن چچی حیران پریشان بیٹھی ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھے جا رہی تھیں اور سوچ رہی تھیں۔

"میں نے ایسا کون سا لطیفہ سنا دیا جو یہ لڑکی بے تحاشا ہنسے چلی جا رہی ہے۔"

آخر کار وہ پوچھ ہی بیٹھیں تو صباحت نے اپنا پیٹ پکڑتے ہوئے کہا۔

"ایمان سے چچی، ایسا مذاق نہ کیا کیجئے کہ میری ہنسی بالکل ہی بے قابو ہو جائے۔"

"کیسا مذاق صبو!" دلہن چچی روہانسی ہو گئیں۔

"آپ کا وہ پریشان زلفوں والا بھائی اور ڈاکٹر۔ کیسی عجیب بات کہی آپ نے۔" وہ پھر ہنس پڑی۔

دلہن چچی نے اس کے ایک دھپ لگائی تو وہ بولی۔

"اسے تو شاعر ہونا چاہئے تھا۔ مریضوں کا تو وہ بیڑہ غرق کر دے گا۔"

دلہن چچی بھی ہنس پڑیں تو وہ قدرے سنجیدہ ہو کر بولی۔

"اچھا، ایک بات تو بتائیے۔"

"پوچھو۔"

"اس نے کوئی شکایت تو نہیں کی آپ سے میری؟"

"کس بات کی شکایت؟"

"اصل میں ہوا یہ تھا کہ اس نے جوتے سے میرا پاؤں کچل دیا تھا۔"

"اچھا، پھر؟"

"میں نے اسے بھالو کہہ دیا۔"

"بھالو؟" دلہن چچی ایک دم ہنس پڑیں۔

"ہاں، غصے میں اور کچھ نہ سوجھا تو میں نے اس کے بڑے بڑے بالوں پر چوٹ کر دی۔"

"نہیں، اس نے تو مجھ سے کچھ نہیں کہا۔"

"ڈر گیا ہو گا مجھ سے۔"

صباحت نے بڑے اطمینان سے کہا اور اپنا دوپٹہ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

دلہن چچی نے پوچھا۔

"کیوں، اٹھ کیوں گئیں۔"

"ابھی میں نے کھانا نہیں کھایا۔"

"ارے کیا واقعی؟"

"جی، تو اور کیا؟"

"تم بیٹھو، میں تمہارے لئے کھانا لے کے آتی ہوں۔"

"صلواتیں سنوائیں گی مجھے اماں سے۔"

"صلواتیں سنوانے کی کیا بات ہے اس میں؟"

"یہ بات بھول گئیں کہ ابھی آپ نئی دلہن ہیں؟"

"آخر کب تک نئی دلہن رہوں گی بھئی۔"

"جتنے دن عیش کر سکتی ہیں کر لیں، پھر تو ساری زندگی بھاڑ ہی جھونکنا ہے۔"

دلہن چچی اصرار ہی کرتی رہ گئیں، لیکن صباحت نے انہیں کمرے سے باہر قدم نہ نکالنے دیا۔ نہیں شانوں سے پکڑ کر دوبارہ ان کے بستر پر بٹھا دیا اور خود باورچی خانے کی طرف چل دی۔

رات کے کھانے کے وقت جب سب لوگ ڈائننگ ٹیبل کے گرد جمع ہوئے تو صباحت نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"کچھ اور بھی سنا آپ نے اماں۔"

"کیا، خیر تو ہے؟" اماں نے کچھ حیران اور کچھ پریشان ہو کر صباحت کی طرف دیکھا۔

''وہ دلہن چچی کا سوتیلا بھائی نہیں ہے-''

صباحت کے اس جملے پر سبھی نے حیران ہوکر اس کی طرف پھر اماں کی طرف دیکھا-

دلہن چچی نے اپنی مسکراہٹ ضبط کرنے کی بہت کوشش کی لیکن جب کوئی بس نہ چلا تو پانی کا گلاس منہ سے لگالیا-

ابا میاں نے پوچھا-

''کس کا ذکر ہو رہا ہے؟''

صباحت نے تفصیل بتانے کے لئے اپنی چونچ کھولی ہی تھی کہ اماں نے ڈانٹ کر اسے خاموش کر دیا اور نہایت غصے بھرے لہجے میں شادی والے روز کا واقعہ سب کو سنادیا-

ابا میاں کے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی ہنسی آگئی سوائے دادی اماں کے یہ ہنسی تو اماں سے بالکل برداشت نہ ہو سکی-ایک دم بپھر اٹھیں-

''اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے-ہنس ہنس کے اور شہ دے رہے ہیں اسے-''

صباحت نے بڑے اطمینان سے کہا-

''اور ابا میاں، دوسری لطف کی بات یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر ہے-''

''سچ -مجھے تو بالکل یقین نہیں آتا-''

''کیوں، یقین نہ آنے کی کیا وجہ ہے؟'' اماں نے پھر گھر کا-

''اس کا حلیہ نہیں دیکھا آپ نے؟''

''تمیز تو چھو کر بھی نہیں گزری تمہیں-'' اماں کو پھر تاؤ آ گیا- دادی اماں نے بھی اس موقع پر مداخلت ضروری سمجھی-

''کچھ تو سوچو بیٹیا، وہ بڑا ہے تم سے-''

''کوئی ایسا بڑا بھی نہیں ہوگا مجھ سے، ہوگا کوئی چار چھ مہینے کا فرق-''

اماں نے چور نگاہوں سے دلہن چچی کی طرف دیکھا- یقیناً وہ ان کے چہرے سے دلی تاثرات کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں، لیکن دلہن چچی کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہونے کے لئے بے قابو ہوئی جا رہی تھی-

صباحت نے دلہن چچی کی طرف دیکھ کر پوچھا-

''کیوں چچی، کیا عمر ہوگی ڈاکٹر کی؟''

دلہن چچی اپنی ہنسی نہ روک سکیں، اماں نے کہا-

''آخر تمہیں کیا دلچسپی ہے اس کی عمر سے، تم خاموشی سے کھانا کھاؤ-''

صباحت شاید مزید ڈانٹ سننے کے موڈ میں نہیں تھی-سر جھکا کر سنجیدگی سے کھانا کھانے لگی-

دو تین روز بعد دلہن چچی اپنے میکے گئیں تو ظفر کے سامنے صباحت کا ذکر چھیڑ دیا-انہوں نے سوچا، شاید اس طرح ظفر اس دن کے واقعے کا کوئی ذکر کرے-ظفر صباحت کا نام سن کر ایک دم چڑ گیا-

''نام نہ لو اس بدتمیز لڑکی کا-''

''کیوں آخر ایسی کون سی بات ہوگئی؟''

''ایسی جھگڑالو لڑکی میری نظر سے نہیں گزری-''

''کچھ بتاؤ بھی، کیا کیا اس نے؟''

ظفر نے بڑے طیش کے عالم میں شادی والے روز کے واقعے کا ذکر کیا اور بولا-

''اسے منہ نہ لگانا زیادہ-''

''ارے واہ-ایسی پیاری سی بھتیجی ہے-''

ظفر سلگ کر بولا-

''ہاں بھتیجی ہے، کسی ساس سے کم نہیں وہ-''

''تمہیں غلط فہمی ہوگئی ہے اس کی طرف سے-''

''سب کچھ سننے کے بعد بھی تم یہ بات کہہ رہی ہو-''

''غلطی تو تمہاری تھی-''

''اگر نادانستگی میں پاؤں کچل گیا تو اس کا یہ مطلب تو نہ تھا کہ وہ مجھے بھالو، کارٹونسٹ اور فوٹوگرافر بنا کر رکھ دے، اور جب کہ میں معذرت بھی کر رہا تھا-''

''چلو خیر جانے دو- غصے اور تکلیف میں انسان کی زبان سے اس قسم کی باتیں نکل ہی جایا کرتی ہیں-''

''معلوم نہیں کیا جادو کر دیا ہے اس نے تمہارے اوپر- برابر اس کا پارٹ لئے جا رہی ہو-''

''پارٹ لینے کی بات نہیں ظفر، وہ سچ مچ بڑی پیاری لڑکی ہے-بس ذرا شوخ ہے-''

''اور بدتمیز بھی تو ہے، یہ کیوں نہیں کہتیں-''

''نہیں، وہ بڑی معصوم اور سادہ فطرت لڑکی ہے-''

''ہونہہ'' ظفر نے کہا اور سگریٹ سلگا کر دریچے میں کھڑا ہو گیا-

ان دنوں موسم بہت خراب تھا، تقریباً ہر گھر میں ایک کے بعد دوسرا فرد فلو کا شکار ہو رہا تھا- دادی اماں پر بھی اچانک حملہ ہو گیا- دلہن چچی نے فون کر کے ظفر کو بلوایا-ظفر کے ساتھ ان کی اماں بھی

سمدھن کی عیادت کو چلی آئیں- ظفر کو دیکھتے ہی صباحت کے ہونٹوں پر شوخ سی مسکراہٹ مچل اٹھی- ظفر پر نگاہ پڑتے ہی خواہ مخواہ اس کا دل چاہتا تھا کہ اسے خوب چھیڑے، ستائے، تنگ کرے- مگر کچھ تو رشتے کی نزاکت کا احساس اور کچھ اماں کے ڈانٹنے کا ڈر- وہ اپنا دل مار کر رہ جاتی تھی-

ظفر جب تک دادی اماں کا معائنہ کرتا رہا وہ بڑی مودب اور سیریس بنی کھڑی رہی جب اس نے اسٹیتھسکوپ اتار کر رکھا تو صباحت نے بلاوجہ ہی کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا-

''ڈاکٹر صاحب، دو ایک انجکشن تو لگائیں گے ہی آپ-''

ظفر نے پلٹ کر اپنی چمکیلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا-

''جی نہیں، فی الحال اس کی ضرورت نہیں-''

''اچھا تو کتنے روپے پیش کیے جائیں آپ کی خدمت میں؟''

''کس بات کے روپے؟''

ظفر کی خوبصورت سی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں-

''فیس کے-''

''اگر فیس ہی دینی تھی تو کسی اور ڈاکٹر کو بلوا لیتیں-''

''میں نے تو آپ کو نہیں بلوایا-''

''تو پھر آپ دخل اندازی بھی نہ کیجئے-''

اماں نے اپنی جگہ بیٹھے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں صباحت کو تنبیہہ کی، پھر ظفر اور اس کی امی سے مخاطب ہو کر بولیں-

''اس کی باتوں کو محسوس نہ کیجئے گا- اس کی تو عادت ہے وقت بے وقت مذاق کرنے کی-''

ظفر کی امی جو بڑی دلچسپی سے اس کی باتوں کو سن رہی تھیں بہت محبت سے بولیں-

''ماشاءاللہ بڑی رونق رہتی ہے آپ کے یہاں اس کے دم سے-''

صباحت نے جھٹ سے پوچھا-

''آپ کو کیسے معلوم؟''

''تمہاری دلہن چچی تو اٹھتے بیٹھتے تمہارا ہی ذکر کرتی رہتی ہیں-'' ظفر کی امی نے کہا-

صباحت نے اس انداز سے ظفر کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو-

''کچھ سنا تم نے، کس قدر اہمیت ہے میری-''

ظفر اسی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن نگاہیں ملتے ہی اس نے بیزاری سے منہ دوسری طرف کر لیا-

صباحت نے دل ہی دل میں کہا-

''ہونہہ، جل گیا میری تعریف سن کر-''

دلہن چچی اٹھ کر اپنے کمرے میں گئیں تو ظفر بھی اٹھ کر ان کے پیچھے چل دیا- بوا ٹرالی لے کر اندر آئیں تو صباحت نے چائے بنا کر بڑے ادب سے ظفر کی امی کو پیش کی اور بہت اصرار کر کے بسکٹ اور پیسٹری انہیں کھلائی بوا ٹرالی لے کر دلہن چچی کے کمرے میں گئی تو چند منٹ بعد صباحت کا بلاوا بھی آ گیا- صباحت جانے کے لئے اٹھی تو اماں نے ایک بار پھر تنبیہہ کی-

''دیکھو ذرا تمیز کے دائرے میں رہنا-''

''میں کہاں بدتمیزی کرتی ہوں اماں- آپ تو بس ویسے ہی......''

صباحت نے اپنی ہنسی کو بڑی مشکل سے ضبط کیا اور دلہن چچی کے کمرے میں داخل ہو گئی-

انہوں نے بڑے پیار سے صباحت کی طرف دیکھا اور بولیں-

''تم نے یہ کیسے تصور کر لیا تھا صبو کہ ہم تمہارے بغیر ہی چائے پی لیں گے-''

''میں نے سوچا کہ آپ ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے شاید مجھے نہ بلائیں-''

ظفر نے ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالی اور دیوار پر لگی ہوئی پینٹنگ کی طرف متوجہ ہو گیا- دلہن چچی نے سر گھما کر ظفر کی طرف دیکھا اور بولیں-

''ظفر یہ تم سے بہت ڈرتی ہے-''

''جی ہاں- ضرور- اس کا اندازہ تو مجھے خوب اچھی طرح ہو چکا ہے-''

ظفر کا لہجہ سراسر طنز میں ڈوبا ہوا تھا-

دلہن چچی نے چائے بناتے ہوئے کہا-

''دیکھو بھئی ایسا ہے کہ اب تم دونوں صلح کر لو-''

صباحت نے بہت معصوم صورت بنا کر کہا-

''مگر میرا تو کوئی جھگڑا نہیں ہے ان سے-''

دلہن چچی نے ظفر کی طرف دیکھ کر کہا-

''اور ظفر تم......''

ظفر خاموش رہا-

صباحت بھی چپ چاپ بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی- دلہن چچی نے چائے بنا کر ظفر کی طرف بڑھائی- اس نے چائے لے لی لیکن اور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا-

صباحت کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی، بہت سنجیدگی سے بولی-

''میرا خیال ہے آپ یہ چیزیں کھالیں تو بہتر ہوگا کیونکہ ہم لوگ رات کے کھانے پر آپ کو روکنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے-''

ظفر بہت چڑ کر بولا-

''مجھے کوئی حسرت بھی نہیں ہے آپ کے گھر کھانا کھانے کی-''

دلہن چچی بولیں-

''افوہ ظفر، مذاق کی بات ہو رہی ہے-اتنی تو برداشت ہونی ہی چاہئے انسان میں-''

''لیکن سوال یہ ہے کہ جب میں ان سے مذاق نہیں کرتا تو یہ مجھ سے کیوں مذاق فرماتی ہیں؟''

صباحت ایک دم سنجیدہ ہوگئی اور بولی-

''اچھا آج کے بعد میرے اور آپ کے درمیان کوئی مذاق نہیں ہوگا-''

دلہن چچی نے گھبرا کر صباحت کی طرف دیکھا-کہیں صباحت ناراض نہ ہوگئی ہو-

انہوں نے پوچھا-

''ناراض ہوگئیں صبو؟''

''کس سے، آپ سے؟''

''نہیں، ظفر سے-''

''میرے اور ان کے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہیں جس کی بنا پر میں ان سے ناراض ہوسکوں یا مذاق کرسکوں-''

ظفر نے سوچا-

''ہوں-اب آئی ہیں یہ محترمہ راہ راست پر-''

دلہن چچی جانے کن سوچوں میں ڈوب گئیں-

پھر صباحت جب تک کمرے میں رہی- اس نے ظفر کو ایک دفعہ بھی مخاطب نہیں کیا-ظفر کے جانے کے بعد دلہن چچی نے صباحت سے دوبارہ پوچھا-

''تم نے ظفر کی بات کا برا مانا ہے نا صباحت-''

''نہیں، بالکل نہیں-''

''تو پھر تم......''

''دراصل بات یہ ہے چچی کہ کسی انسان کے مزاج کو سمجھے بغیر اس سے مذاق نہیں کرنا چاہئے-''

دلہن چچی پلکیں جھکائے بنا اس کی طرف دیکھتی رہیں-

''ہر شخص میں سنس آف ہیومر نہیں ہوتا-''

اس روز کے بعد سے صباحت اور ظفر کا جب بھی آمنا سامنا ہوا صباحت نے اس سے مذاق کرنا تو درکنار اس سے بات بھی نہیں کی یہ بات نہیں تھی کہ اس نے اپنی فطرت ہی بدل ڈالی تھی- دوسرے لوگوں کو ستانے تنگ کرنے اور ان سے مذاق کرنے کی عادت بدستور تھی-اس کا یہ سلوک صرف ظفر کے ساتھ ہی تھا-

اس نے سوچا تھا-

''ہونہہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ اس کو ستائے بغیر مر تو نہیں جاؤں گی، دیکھ لوں گی میں بھی اس کو، ناک نہ رگڑوا دی تو صباحت نام نہیں میرا- ہاتھ جوڑ کے کہے گا مجھ سے-

صباحت! مجھ سے مذاق کرو، مجھے ستاؤ تنگ کرو-

پھر میں اگلی پچھلی ساری کسر نکال دوں گی-

اور ظفر نے سچ مچ اس کی سنجیدگی اور خاموشی کو بہت محسوس کیا صباحت کا یہ روپ اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا-اپنے اس روپ میں وہ اسے بہت اجنبی اجنبی سی لگتی-ظفر کو جب بھی فرصت کے لمحات میسر آتے، دل نہ چاہنے کے باوجود وہ صباحت کے متعلق سوچنے پر مجبور ہو جاتا، اور ایسے میں دماغ کے جانے کس گوشے سے آواز آتی-

''ظفر آخر چاہتے کیا ہو؟ تمہیں نہ پہلے چین تھا نہ اب چین ہے' اس کا کوئی روپ تو برداشت کرو-''

ظفر کے بڑے بھائی کی ننھی منھی گڑیا ارم کی رسم بسم اللہ تھی سارا گھر مدعو تھا-صباحت نے دل ہی دل میں پکا پروگرام بنالیا کہ وہ ہرگز نہیں جائے گی- اس روز جان بوجھ کر وہ شام تک لائبریری میں بیٹھی رہی...... پڑھائی وڑھائی تو خاک نہیں کی- ریڈنگ روم کے باہر والی گیلری میں زمین پر پھسکڑا مارے اپنی لاڈلی فرحت کے ساتھ گپیں ہانکتی رہی اور واپسی پر فرحت کے گھر چلی گئی- مغرب کے وقت گھر میں کوئی نہیں تھا-اس کے گھر میں گھستے ہی بوا نے کہا-

''کہاں رہ گئی تھیں بیٹی، دلہن تمہارا انتظار کر کر کے سب سے بعد میں گئی ہیں-''

''آج میں نے سارا علم گھول کر پی ڈالا بوا بس اسی چکر میں دیر ہوگئی-''

''کبھی تو ڈھنگ سے بات کرو بٹیا تم-''

''جب میں خود ہی بے ڈھنگی ہوں تو ڈھنگ سے بات کیسے کرسکتی ہوں-''

بوا نے باورچی خانے کی طرف جاتے جاتے کہا-

''اور ہاں تم کپڑے بدل کر تیار رہنا-دلہن کہہ گئی تھیں کہ وہ کسی کو بھیجیں گی تمہیں بلوانے کو-''

صباحت نے اپنے کمرے کا رخ کرتے ہوئے چیخ کر کہا-

''اگر انہوں نے اپنے لمبے بالوں والے بھائی کو بھیجا تو میں ہرگز نہیں جاؤں گی- البتہ اگر اپنے والد بزرگوار کو بھیجیں گی تو سر کے بل جاؤں گی-''

''سوچ سمجھ کے بات کیا کرو بٹیا-''

''میں کیا کروں بوا- مجھے گرمی لگتی ہے اس کے بڑے بڑے بالوں کو دیکھ کر- میرا بس چلے تو میں آج ہی حجام کے یہاں لے جا کر اس کے بال چھوٹے چھوٹے کروا دوں بالکل شریف آدمیوں والے-''

عین اسی لمبے عبدل کے ساتھ ظفر اندر داخل ہو گیا- اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں انجانی سی چمک-

بوا انہیں دیکھ کر کچھ ایسی سٹپٹائیں کہ الٹے قدموں صباحت کے قریب آ کھڑی ہوئیں اور گھٹی گھٹی آواز میں بولیں-

''اسی لئے کہتے ہیں کہ آہستہ بولو- اب انہوں نے سب کچھ سن لیا ہوگا-''

صباحت نے بوا کے کان کے قریب منہ لے جا کر کھسر پھسر کی-

''ارے بوا نہیں سن پائے ہوں گے، کان تو بالوں سے ڈھکے ہوئے ہیں-''

بوا نے کچھ مسکراہٹ اور کچھ کھسیاہٹ کے ساتھ اپنا سر پیٹ لیا- صباحت کی کھسر پھسر اتنی اونچی تھی کہ قریب کھڑے ظفر نے یقیناً سن لی ہوگی-

مگر جانے کیا بات تھی کہ آج ظفر کو اس کا مذاق بالکل برا نہیں لگا تھا-

بوا نے گھبرا کر کہا-

''بیٹھئے ڈاکٹر صاحب-''

''میں بیٹھوں گا نہیں بوا، انہیں لینے آیا ہوں-''

ظفر نے صباحت کی طرف اشارہ کیا-

''بٹیا تو یونیورسٹی سے ابھی آئی ہے، منہ دھو کر تیار ہو گی- اتنے میں آپ کے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں-''

ظفر نے صباحت کی طرف دیکھ کر کہا-

''ذرا جلدی کیجئے آپ، صائمہ (دلہن چچی) کو آپ کا بڑا انتظار ہے، انہوں نے زبردستی مجھے بھیجا ہے آپ کو لانے کے لئے-''

صباحت نے دل ہی دل میں سوچا-

''ہونہہ، چار سو بیس، جتا رہا ہے کہ میں خود نہیں آیا ہوں بھیجا گیا ہوں اور وہ بھی زبردستی-''

صباحت نے کہا-

''آج میں بہت تھک گئی ہوں، کہیں جانے کا موڈ نہیں ہے میرا-''

''کمال کرتی ہیں آپ، سب آپ کا انتظار کر رہے ہیں-''

''کرنے دیجئے، میرا یا آپ کا کیا نقصان ہے؟''

ظفر نے کچھ کہنے کی کوشش کی- لیکن اس کی پوری بات سننے سے پہلے ہی صباحت اپنے کمرے میں چلی گئی-

ظفر دو ایک منٹ تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر بوا کی طرف دیکھ کر بولا-

''بوا جی، میں ذرا گھر پر ٹیلیفون کر لوں-''

''جی ہاں- ضرور-''

بوا نے عبدل کی طرف اشارہ کیا- عبدل انہیں ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا- چند ہی منٹ بعد صباحت کا بلاوا آ گیا- عبدل نے اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اپنے بڑے بڑے اور پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا-

''بٹیا، آپ کا ٹیلیفون ہے-''

صباحت اچھا کہہ کر ڈرائنگ روم کی طرف چل دی- ظفر صوفے پر بڑا لاتعلق سا بنا بیٹھا تھا- صباحت نے بھی ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور ریسیور اٹھا لیا-

دوسری طرف دلہن چچی بول رہی تھیں-

''صباحت! میں کوئی عذر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں، تم فوراً ظفر کے ساتھ آؤ-''

دلہن چچی کا لہجہ خاصا تحکمانہ تھا، لیکن صباحت ان کے لہجے سے مرعوب ہوئے بغیر بولی-

''مگر آپ یہ تو سوچیے کہ آپ نے بہت غلط قسم کے آدمی کو مجھے لانے کے لئے بھیجا ہے-''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ...... یہ جو صوفے پر ایک صاحب بیٹھے ہیں، بڑی بڑی زلفوں والے- میں ان کے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گی-'' صباحت نے کن انکھیوں سے ظفر کی طرف دیکھا-

''آخر کیوں؟''

''اس کی ایک وجہ تو یہ ہے چچی پیاری کہ میرے اور ان کے درمیان سفارتی تعلقات منقطع ہو چکے ہیں اور دوسری......''

دوسری طرف سے دلہن چچی کے ہنسنے کی آواز آئی-

''تم بہت شریر ہو صباحت-''

''جی، بجا ارشاد لیکن آپ دوسری وجہ بھی تو سن لیجئے-''

''سناؤ جلدی-''

''مجھے ان کے ساتھ جاتے ہوئے شرم آئے گی-''

''شرم کی کیا بات ہے اس میں-''

''دیکھئے نا، لوگ کیا کہیں گے کہ ایسے بڑے بڑے بالوں والے......''

''اچھا بابا، میں اس سے درخواست کر کے اس کے بال چھوٹے کروا دوں گی، لیکن اس وقت تم اس کے ساتھ آ جاؤ-''

''مجھے آپ کے گھر کا راستہ معلوم ہے میں اکیلی آ جاؤں گی-''

ظفر جواب تک صوفے پر بیٹھا بڑے صبر و تحمل سے اس کی باتیں سن رہا تھا، ایک دم اٹھ کر اس کے قریب آیا اور خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا-

''آپ کسی خوش فہمی میں نہ رہیئے گا، مجھے لوگوں کے دماغ درست کرنے بھی آتے ہیں-''

صباحت نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا-

''چچی، کیا آپ کے بھائی برین اسپیشلسٹ ہیں؟''

انہوں نے جواب میں جانے کیا کہا، عین اسی وقت ظفر نے اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا اور صائمہ سے کہا-

''تم ناحق اپنا وقت ضائع کر رہی ہو صائمہ؟''

''کیا بات ہے ظفر؟''

''بس تم ٹیلیفون بند کر دو، میں ابھی تمہاری لاڈلی کو لے کر آ رہا ہوں-''

دلہن چچی ظفر کی غصیلی آواز سن کر ایک دم گھبرا گئیں اور بولیں-

''دیکھو ظفر ڈانٹ ڈپٹ نہ کرنا-''

''نہیں تم بے فکر رہو-'' ظفر مسکرا کر بولا-

''ہاں بھئی- میری سسرال کا معاملہ ہے-''

''اچھا، اچھا ہوا نہ بناؤ سسرال کو-''

ظفر نے ریسیور کریڈل پر ڈالتے ہوئے گردن موڑ کر قریب کھڑی صباحت کی طرف دیکھا اور بے حد درشت لہجے میں بولا-

''آپ یا تو فوراً تیار ہو جایئے ورنہ پھر مجبوراً میں آپ کو اسی حلئے میں لے جاؤں گا-''

''میں نہیں جاؤں گی-''

''میں اس وقت کسی بات کا جواب انکار میں سننے کے لئے تیار نہیں ہوں-''

''میں بھی آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہوں-''

''کیوں؟''

''آپ کو یاد ہونا چاہئے کہ جس روز آپ دادی اماں کو دیکھنے کے لئے آئے تھے اسی روز میرے اور آپ کے درمیان سفارتی تعلقات منقطع ہو گئے تھے-''

ظفر اس کی بات سن کر مسکرایا اور دو تین سیکنڈ تک پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا پھر بولا-

''کوئی بات نہیں، سفارتی تعلقات ابھی اور اسی وقت بحال ہو جائیں گے-''

''لیکن مجھے اس کی بالکل ضرورت نہیں ہے-''

''آپ کو نہ سہی، مجھے تو اس کی ضرورت ہے-''

''کیوں؟'' صباحت نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، اور بات بھی چونک جانے والی تھی-ظفر کا نہ صرف لہجہ بدلا ہوا تھا بلکہ اس کی نگاہوں کا انداز بھی کچھ اور ہی کہتا ہوا معلوم ہو رہا تھا-

''صاف صاف سننا چاہتی ہو؟''

''ہاں-'' صباحت کی آواز کچھ دبی ہوئی سی تھی-

''اس لئے کہ تم مجھے بہت اچھی لگنے لگی ہو، اپنی تمام تر بدتمیزیوں کے باوجود سمجھ گئیں-'' ظفر نے درشت لہجے میں کہا-

صباحت کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا-

اس نے سوچا-

''باپ رے باپ، یہ کیا کہہ دیا اس شخص نے؟''

ظفر نے گہری نگاہوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا-

''کیوں- کچھ دماغ درست ہوا آپ کا؟''

''کچھ نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی درست ہو گیا-'' صباحت نے ایک طویل سانس لے کر کہا-

ظفر کی نگاہوں میں شمعیں سی جل اٹھیں-

صباحت نے دل میں سوچا-

''اور تم، ڈاکٹر ظفر وہاب، تم بھی تو راہ راست پر آ گئے، بہت اکڑتے تھے تم-''

صباحت نے شریری نگاہوں سے ظفر کی طرف دیکھا اور بولی-

''ہماری اماں بڑی ظالم و جابر ہیں، اگر آپ کی اس احمقانہ حرکت کا انہیں علم ہو گیا نا تو آپ کو تو

کچھ نہیں کہیں گی لیکن میرے سر پر ایک بال بھی نہ چھوڑیں گی۔‘‘
’’آپ بیکار باتیں نہ کیجئے، فوراً تیار ہو جایئے چلنے کے لئے۔‘‘
’’کیا آپ مجھے معاف نہیں کر سکتے؟‘‘
’’نہیں۔‘‘
’’تو پھر چلیے۔‘‘
’’اس حلیے میں؟‘‘ ظفر نے حیرت سے اس کو دیکھا۔
’’کیا فرق پڑتا ہے، مجھے وہاں اپنے آپ کو پسند تو کروانا نہیں۔‘‘
’’لیکن اس کا مطلب یہ بھی تو نہیں کہ آپ سر جھاڑ منہ پھاڑ وہاں پہنچ جائیں۔‘‘
’’کسی طرح چین نہیں آپ کو۔‘‘

صباحت نے کہا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ظفر دریچے میں کھڑا ہو کر جانے کیا سوچنے لگے۔ صباحت نے تیار ہونے میں بمشکل تمام دس منٹ لگائے۔ جب اس نے ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑے ہو کر نعرہ لگایا۔
’’چلیئے ڈاکٹر صاحب۔‘‘

تو ظفر نے پلٹ کر بہت حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اسے توقع نہیں تھی صباحت اتنی جلدی تیار ہو جائے گی۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ لڑکیاں اپنے آپ کو سنوارنے میں کس قدر وقت صرف کرتی ہیں مگر صباحت نے منہ دھو کر کپڑے بدلے تھے اور اپنے بالوں کو سمیٹ کر ربن سے باندھ لیا تھا بالکل سادھے نیوی بلیو سوٹ میں اس کی چمپئی رنگت کچھ اور کھل اٹھی تھی۔ نہ اس نے میک اپ کی ضرورت محسوس کی تھی اور نہ ہی زیور کی قسم کی کوئی چیز پہنی تھی، جبکہ ظفر اپنے گھر میں دیکھ کر آیا تھا کہ عورتوں اور لڑکیوں نے کیسے زرق برق لباس زیب تن کئے تھے۔

ظفر نے پوچھا۔
’’کیا آپ بالکل تیار ہیں؟‘‘
’’جی ہاں، کیوں، کیا آپ کے خیال میں کوئی کسر باقی رہ گئی ہے؟‘‘

ظفر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اس کے ساتھ باہر نکل آیا۔

اس شام کے بعد ظفر کی سوچیں کچھ اور بھٹک گئیں۔ صباحت کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات اس کے دل و دماغ پر تصویر کی طرح نقش ہو گئے۔ وہ ایک سراپا، کس قدر اس کی نگاہوں میں بس گیا تھا، وہ حیران تھا، بہت حیران۔ یہ کیسی تبدیلی آ گئی تھی اس کی زندگی میں۔

کئی دن گزر گئے۔ صباحت سے اس کی مڈبھیڑ نہیں ہوئی۔ دو دفعہ وہ صائمہ سے ملنے کے لئے آیا

بھی، لیکن صباحت جانے گھر کے کس گوشے میں تھی کہ نظر ہی نہ آئی۔ صائمہ سے پوچھنے کو دل تو بہت چاہا لیکن ہمت نہ ہو سکی۔

اس کے بعد بھی وہ کئی بار آیا لیکن صباحت اسے دیکھ کر جانے کہاں چلی جاتی تھی، کم از کم ظفر کا خیال یہی تھا کہ صباحت اس کے آتے ہی کہیں چل دیتی ہے۔ اگر گھر میں ہوتی تو صائمہ کبھی تو اسے بلواتی۔ ظفر جب تک بیٹھا رہتا، بڑی بے چینی سے صباحت کا منتظر رہتا۔ ہر آہٹ پہ اسے یہ گمان ہوتا کہ کہیں وہ نہ ہو۔ نگاہوں سے یہ دوری اس کی آتش شوق کو کچھ اور بھڑکاتی تھی۔

پھر ایک دوپہر جب ظفر کلینک سے گھر واپس آیا تو صباحت صائمہ کے ساتھ وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے ظفر اپنی جگہ پر ٹھٹھک کر رہ گیا، لیکن پھر فوراً ہی اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا صائمہ کی مزاج پرسی کرتے ہوئے اس کی نگاہیں بار بار بھٹک کر صباحت کے چہرے پر جم جاتی تھیں، لیکن وہ بالکل لاتعلق سی بنی بیٹھی ارم کے بال سنوار رہی تھی۔

ظفر اپنے کمرے میں چلا گیا، منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے تبدیل کر کے کھانے کی میز پر آیا تو اتفاق سے اسے صباحت کے بالکل سامنے والی کرسی خالی ملی، لیکن اس سے ظفر کو کوئی فائدہ نہیں ہوا سب لوگوں کی موجودگی میں وہ صباحت سے کوئی بات نہ کر سکا، اور صباحت...... وہ تو ایسی سنجیدہ خاتون بنی بیٹھی تھی جیسے شوخی اور شرارت سے اس کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ ظفر سے اس کا یہ روپ بالکل برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ صباحت اسے پہلے ہی کی طرح خوب چھیڑے تنگ کرے۔

کھانا کھانے کے بعد صائمہ صباحت کے ساتھ آرام کرنے کے لئے ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں آ گئی تو ظفر بھی وہیں آ گیا۔ صائمہ ابھی لیٹنے بھی نہ پائی تھی کہ ارم نے آ کر کہا۔
’’پھپھو آپ کو دادی اماں بلا رہی ہیں۔‘‘

ظفر کی تو جیسے دلی مراد بر آئی۔ اس کے ہونٹوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ بکھر گئی۔ صائمہ کے جاتے ہی وہ صباحت کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا۔
’’کہاں غائب تھیں آپ اتنے دنوں سے۔‘‘
’’کہیں بھی نہیں۔‘‘
’’پھر نظر کیوں نہیں آئیں؟‘‘
’’کسے؟‘‘
’’مجھے اور کسے؟‘‘
’’مصروفیت زیادہ تھی۔‘‘ صباحت نے بڑی مشکل سے اپنی شوخ مسکراہٹ کو ضبط کر رکھا تھا۔

ظفر ایک دم چڑ کر بولا-

''اتنی مصروفیت کہ دو منٹ کے لئے سامنے نہیں آ سکتی تھیں-''

''آپ کے سامنے آنا بہت ضروری تھا؟''

''ہاں-'' ظفر غصیلے لہجے میں بولا-

''کیوں؟''

ظفر نے کوئی جواب نہیں دیا- سر کرسی کی پشت سے ٹکائے ہوئے صباحت کی طرف دیکھتا رہا- صباحت میگزین پڑھتی رہی، ظفر نے کہا-

''تم نے اتنی سنجیدگی کیوں طاری کر رکھی ہے؟''

''پھر کیا کروں-''

''پہلے کیا کرتی تھیں؟''

''پہلے...... پہلے ایک شخص کو تنگ کیا کرتی تھی-''

''تو اب کیوں نہیں کرتیں؟''

''وہ برا مان جاتا ہے-''

''اب نہیں مانے گا برا، تم ستا کر تو دیکھو-''

''نہیں، مجھے اس کا اعتبار نہیں-''

ظفر چند لمحوں تک سر جھکائے کچھ سوچتا رہا پھر بولا-

''دیکھو صباحت! تم یوں سنجیدہ بیٹھی ہوئی مجھے اچھی نہیں لگتیں- تم ہنسا کرو شرارتیں کیا کرو- اپنے اس روپ میں تم مجھے بہت اجنبی اجنبی سی لگتی ہو-''

''اچھا!'' صباحت نے کچھ حیرت کا اظہار کیا اور سوچا کہ اگر تھیوری کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ناک رگڑوانا اسی کو کہتے ہیں اور اگر پریکٹیکل کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو ابھی کچھ کسر باقی ہے، مگر خیر اتنا ہی کافی ہے-

ظفر اس کی پلکوں کی گرتی اٹھتی چلمن کی طرف دیکھ رہا تھا اور صباحت کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ دیکھنے کا منتظر تھا، لیکن صباحت کی سنجیدگی میں ذرا سا فرق بھی نہیں آیا تھا- اس نے نہ ظفر کی طرف دیکھا اور نہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی- ظفر نے خود ہی کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر اسی وقت جانے کیا ہوا کہ صباحت ایک دم اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی- ظفر اسے روک بھی نہ سکا- پھر رات تک صباحت نے ظفر کو ایک دفعہ بھی اس بات کا موقع نہ دیا کہ وہ اس سے کچھ کہہ سکتا- ظفر ان دونوں کو گھر چھوڑ کر آیا- لیکن صباحت تمام راستے اس طرح انجان بنی بیٹھی رہی جیسے

اس کا کبھی ظفر سے واسطہ ہی نہ پڑا ہو-

ظفر کے لئے اس کا رویہ تکلیف دہ حد تک ناقابل برداشت تھا وہ جتنا اس سے دور ہٹنے کی کوشش کر رہی تھی ظفر اتنا ہی بے چین ہو رہا تھا- اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی زندگی میں کبھی ایسے لمحات بھی آئیں گے جب صباحت کے لئے وہ اپنے دل و دماغ کو اس قدر بے چین اور مجبور محسوس کرے گا-

اس کی حرکتوں سے تنگ آ کر وہ سوچتا-

''یہ لڑکی ہے یا معمہ، آخر یہ چاہتی کیا ہے؟''

ایسے میں دل کے جانے کس گوشے سے آواز آتی-

''تم خود کیا چاہتے ہو ظفر، کبھی اپنے بارے میں بھی سوچا؟''

اور اپنے اس سوال کا جواب اسے ہر بار یہ ملتا؟

''میں تو اپنے دل و دماغ اور روح کی تمام تر گہرائیوں کے ساتھ اسے پسند کرتا ہوں- میرے لئے جو کچھ وہ ہے وہ دنیا کی کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی-''

ایک روز تنگ آ کر اس نے اپنی بہن صائمہ کو اپنا ہمراز بنا لیا- بلاوجہ کی تمہید باندھنا اسے کبھی بھی پسند نہ تھا، اس نے بلا کسی جھجک کے اس سے کہہ دیا-

''صائمہ تمہاری لاڈلی صباحت مجھے پسند ہے-''

صائمہ نے کچھ حیران ہو کر ظفر کی طرف دیکھا- اسے کچھ کچھ اندازہ تو تھا مگر اتنا زیادہ بھی نہیں- اس نے پوچھا-

''پسند کرنے سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میرا مطلب ہے میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں-''

صائمہ جانے کیوں بڑی گہری سوچوں میں ڈوب گئی- ظفر چند سیکنڈ تک اس کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا پھر بولا-

''کیوں، کیا تمہارے نزدیک یہ بات نامناسب ہے؟''

''میں کچھ کہہ نہیں سکتی ظفر-''

''میں آج تک اس لڑکی کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکی ہوں-''

''تمہیں ناپسند ہے وہ؟''

''نہیں، وہ مجھے بہت پسند ہے-''

''تو پھر کیا وجہ ہے؟''

"اچھا، دو تین روز بعد میں اس موضوع پر تم سے بات کروں گی۔"

"چلو یونہی سہی۔"

پھر صائمہ نے ایک دم اس سے پوچھا۔

"کیا تم اس کے لئے بے حد سیریس ہو؟"

"ہاں۔ بہت زیادہ۔"

"اگر وہ تمہیں نہ مل سکے تو؟"

ظفر کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ لہرا کر رہ گیا۔ اس کی خاموش نگاہوں سے جلتی بجھتی شمعوں کی لویں تھرا تھرا کر رہ گئیں۔ اس نے دریچے سے باہر بادام کے خوبصورت درخت پر نگاہیں جمادیں اور بولا۔

"دیکھو صائمہ! موت اپنے مقررہ وقت پر آتی ہے۔ میں صباحت کے بغیر مروں گا تو ہرگز نہیں، لوگ مجھ پر تاریک الدنیا ہونے کا الزام بھی نہ لگا سکیں گے، شاید میں کسی دوسری لڑکی سے شادی بھی کرلوں۔ اپنی بہنوں اور اپنے ماں باپ کی خاطر، لیکن......"

ظفر اپنی بات پوری نہ کرسکا، اس کے سینے میں کوئی چیز ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی، بکھر گئی۔

وہ ایک دم اٹھ کر دریچے میں کھڑا ہوگیا اور لمحہ بہ لمحہ ڈوبتی ہوئی شام کو دیکھنے لگا۔ صائمہ اس کی پشت پر نگاہیں جمائے منتظر تھی کہ وہ آگے بھی کچھ کہے۔ اسے احساس ہوا کہ آج سے پہلے اسے کبھی ظفر پہ اتنی شدت سے پیار نہیں آیا تھا۔ وہ ایک دبی ہوئی سانس کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی ظفر کے شانے پر بڑے پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

"ظفر! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے جذباتی بھی ہو سکتے ہو، تم تو ایک ڈاکٹر ہو، پھر بھی تمہارا دل اتنا کمزور ہے۔"

ظفر نے گردن گھما کر صائمہ کی طرف دیکھا اور دریچے کی چوکھٹ کا سہارا لے کر بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے صائمہ، ڈاکٹر انسان نہیں ہوتے، ان کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کا ٹکڑا ہوتا ہے؟"

"نہیں، میرا یہ مطلب نہیں ظفر۔"

ظفر دونوں ہاتھ سینے پر باندھے سر جھکائے جانے کیا سوچ رہا تھا۔ صائمہ اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے اپنے خیالوں میں گم کھڑی تھی۔ کمرے میں ایک منجمد سی خاموشی طاری تھی اور لمحے چپ چاپ گزر رہے تھے۔

پھر ظفر نے کہا۔

"بہت سے لوگ ابتدائی ملاقاتوں میں ہمیں ذرا بھی متاثر نہیں کرتے ہمارے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ کبھی ان کی شخصیت ہمارے وجود پر چھا کر رہ جائے گی، لیکن کچھ وقت گزرنے کے بعد ہمیں احساس ہوتا ہے کہ وہ تو ہماری رگ وجاں سے بھی قریب تر ہیں......"

ظفر ایک لمحے کے لئے رکا اور بولا۔

"اور پھر جب وہ ہمیں نہیں ملتے تو ہماری اپنی شخصیت ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔ ہماری ہستی بکھر کر رہ جاتی ہے اور اپنے ہی وجود کے ریزوں سے ہمارے پاؤں اس قدر لہولہان ہو جاتے ہیں کہ نہ ایک قدم آگے بڑھا جاتا ہے اور نہ پیچھے ہٹا جاتا ہے۔"

صائمہ اس کے دکھ کو محسوس کرنے کے باوجود ایک دم ہنس پڑی جانے کیوں اس وقت اسے صباحت کی بات یاد آگئی۔

"اسے تو شاعر ہونا چاہئے تھا، مریضوں کا تو بیڑہ غرق کردے گا۔"

ظفر اس کے ہنسنے پر حیران ہوکر بولا۔

"تمہیں ہنسی کس بات پر آئی؟"

"صباحت کی بات یاد آگئی تھی؟"

"کیا؟"

صائمہ نے اس کا جملہ دہراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں واقعی شاعر ہونا چاہئے تھا۔"

ظفر مسکرا کر بولا

"تمہارا کیا خیال ہے، شاعری کیا زندگی کی حقیقتوں کی ترجمان نہیں ہوتی۔"

صائمہ ایک دم سیریس ہوکر بولی۔

"سب وقتی باتیں ہوتی ہیں ظفر، فرض کرو کہ صباحت سے تمہاری شادی نہ ہوسکے تو مجھے یقین ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم سب کچھ فراموش کردو گے۔"

"کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم بھول جانے کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھول نہیں پاتے یا پھر یوں کہہ لو کہ ہم سمجھتے یہی ہیں کہ ہم انہیں بھول گئے ہیں لیکن ان کا خیال ایک سائے کی طرح زندگی بھر ہمارا تعاقب کرتا رہتا ہے۔"

صائمہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اسی وقت صباحت اندر داخل ہوئی صائمہ نے سوچا کہ یہ وقت اور موقع اچھا ہے۔ گھر کے دوسرے افراد بھی آج موجود نہیں ہیں، مجھے کسی کام کے بہانے یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ شاید یہ لوگ اپنی زندگی کے بارے میں کوئی سمجھوتہ کرلیں۔

وہ چند منٹ باتیں کرنے کے بعد صباحت کو بیٹھا چھوڑ کر خود باورچی خانے میں چلی گئی۔

''کیا پٹی پڑھا رہے تھے آپ اپنی بہن کو؟''

''کوئی پٹی نہیں پڑھا رہا تھا۔''

''تو پھر میرے آتے ہی خاموش کیوں ہو گئے؟''

''خاموش اس لئے ہو گیا تھا کہ جو باتیں ہم دونوں کر رہے تھے وہ تمہارے سامنے نہیں کی جا سکتیں۔''

''کیوں نہیں کی جا سکتیں؟''

''کوئی فائدہ نہ ہوتا۔''

''آپ نے اپنی طرف سے یہ بات کیسے فرض کر لی؟''

ظفر خاموش رہا۔

صباحت نے کہا۔

''کچھ تو کہئے جناب۔''

''مجھے معلوم ہے، یا تو تم میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دو گی یا پھر ہنسی میں ٹال دو گی۔''

''آپ کچھ کہہ کر تو دیکھئے۔''

''اچھا تو سنئے صباحت بیگم۔''

''جی! سنائیے۔''

''میں اپنی بہن سے یہ کہہ رہا تھا کہ آپ یعنی مس صباحت عزیز سے مجھے شادی کر لینی چاہئے۔''

ظفر نے جتنے اطمینان سے یہ بات کہی تھی، صباحت نے اتنے ہی اطمینان سے اس کی بات سنی۔ اس نے نہ کسی حیرت کا اظہار کیا، نہ شرمائی نہ لجائی۔

''کر...... لینی...... چاہئے۔'' صباحت نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا اور ظفر کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

ظفر نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

صباحت کے ہونٹوں پر بکھری مسکراہٹ گہری ہو گئی وہ ظفر کی طرف ایک قدم آگے بڑھا کر بولی۔

''کیوں جناب، آپ کو یہ بات کسی حکیم نے نسخے میں لکھ کر دی ہے؟''

''کون سی بات؟'' ظفر انجان بن کر بولا۔

''یہی مجھ سے شادی کر لینے والی۔''

''نہیں۔''

''پھر یقیناً کوئی احمق ڈاکٹر ہو گا۔''

ظفر چڑ کر بولا۔

''تم اس موضوع پر سنجیدگی سے بات نہیں کر سکتیں؟''

''میرا خیال ہے میں کسی بھی موضوع پر سنجیدگی سے بات نہیں کر سکتی۔''

ظفر نے ایک دم تحکمانہ انداز اختیار کر لیا۔

''مجھے اور کسی موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن اس موضوع پر تم آج ہی مجھ سے صاف اور واضح بات کرو۔''

صباحت تمسخرانہ انداز سے بولی۔

''اچھا جی! بڑی شان ہے آپ کی۔''

''صباحت! میں بے حد سیریس ہوں۔''

''اچھا تو سنئے۔''

''سناؤ۔''

''میں آپ سے بھی زیادہ سیریس ہو کر یہ بات کہہ رہی ہوں کہ پہلے تو آپ اپنے بالوں کا یہ انداز بدلئے، مجھے سخت ناپسند ہے۔''

''اچھا منظور...... اور کچھ؟''

''دوسری بات میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ مجھے اپنی چچی کی بھاوج بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''کیا فضول بات کہہ رہی ہو تم؟''

''فضول بات تو آپ نے کہی ہے، کس قدر مضحکہ خیز رشتہ ہو جاتا ہے، آپ نے یہ بھی سوچا؟''

''اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''میرے نزدیک تو بہت بڑا حرج ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہارا جواب انکار میں ہے۔''

''ہاں یہی سمجھ لیجئے۔''

ظفر نے سوچا۔

''یہ جواب سننے کے بعد کچھ کہنا بے کار ہے اور پھر اب میرے پاس کچھ کہنے کے لئے رہا بھی تو نہیں۔''

صباحت مسکراتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی۔

''اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے ظفر صاحب کہ آپ مجھے اتنے زیادہ اچھے بھی تو نہیں لگتے۔''
ظفر اس کی یہ بات سن کر جانے کیوں مسکرا دیا اور بولا۔
''میں تمہیں تھوڑا سا تو اچھا لگتا ہوں نا؟''
''ہاں۔شاید۔''
''تو پھر یہی سوچ کر اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔''
''مگر بات یہ ہے ظفر صاحب کہ جو شخص تھوڑا سا اچھا لگے اس سے شادی تو نہیں کی جاسکتی نا۔''
''اچھا بابا، مت کرو شادی، مر نہیں جاؤں گا تمہارے بغیر۔''
ظفر کو ایک دم غصہ آ گیا، وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گیا اور اپنی بہن سے ملے بغیر گھر چلا گیا۔
صباحت بڑے اطمینان سے بیٹھی ہوئی کرسی پر آگے پیچھے جھولتی رہی اور مسکراتی رہی۔
کچھ دیر بعد صائمہ کسی کام سے اندر آئی اور ظفر کو وہاں نہ پا کر کچھ پوچھنے ہی والی تھی کہ صباحت نے کہا۔
''دلہن چچی، آپ کا بھائی چلا گیا منہ پھلا کر۔''
صائمہ نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔
''کیوں؟''
صباحت نے بڑے سکون سے کہا۔
''میں نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے نا، اس لئے۔''
صائمہ نے کچھ جھجکتے ہوئے پوچھا۔
''تم نے۔تم نے کیوں انکار کر دیا؟''
''وہ مجھے اچھا جو نہیں لگتا۔''
''کیا سچ مچ وہ تمہیں بالکل اچھا نہیں لگتا؟''
''اس میں اچھی لگنے والی بات ہی کون سی ہے؟'' صباحت نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لئے منہ دوسری طرف کر لیا۔
''وہ اتنا برا تو نہیں ہے۔''
''کیا کروں دلہن چچی، دل ہی تو ہے، نہیں آمادہ ہوتا اسے پسند کرنے پر۔''
صائمہ سوگوار سی ہوگئی۔ صباحت نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اپنی مسکراہٹ کو نہ روک سکی ایک دم اٹھ کر اس کے قریب آ گئی اور اس کے شانوں پر بڑے پیار سے اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

''آپ کیوں اداس ہوگئیں؟''
''تم میرے اتنے پیارے سے بھائی کو ٹھکراؤ گی تو میں اداس نہیں ہوں گی۔''
صباحت نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔
''اچھا بھئی لیجئے، میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔''
صائمہ نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
''میرا مطلب ہے کہ مجبوری ہے، کرلوں گی آپ کے بھائی سے شادی۔''
صائمہ کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔
صباحت نے کہا۔
''مجھے اعتراض اس بات پر ہے چچی کہ آپ اور آپ کے بھائی ظفر اس سلسلے میں مجھ سے کیوں بات کرتے ہیں، میری اماں سے کیوں نہیں کہتے؟''
''پہلے تو تمہاری مرضی معلوم کرنی تھی۔''
''جی ہاں، بڑا خیال ہے نا سب کو میرا؟''
''کم از کم مجھے تو ہے۔''
''جبھی اپنے بھائی کے پلے باندھ رہی ہیں، اس کی دراز زلفوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔''
صباحت کی نگاہوں میں پھر شوخی اتر آئی، صائمہ نے اس کی بات کا بالکل برا نہیں مانا۔
''اس سے کہہ دیجئے گا اپنے بالوں کی وضع قطع ٹھیک کروالے ورنہ میرا گزارہ نہ ہو سکے گا اس کے ساتھ۔''
صائمہ نے اٹھ کر اس کے ایک دھپ لگائی تو وہ جھوٹ موٹ منہ بسورنے لگی۔
پھر جب صائمہ نے ظفر کو یہ خوشخبری سنائی تو وہ یقین اور بے یقینی کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔
صائمہ نے پوچھا۔
''اب تم کیا سوچنے لگے؟''
''تمہاری یہ لاڈلی ایک معمہ ہے، بڑا مشکل کام ہے اس کو سمجھنا۔''
''لیکن اس نے شرط یہ لگائی ہے کہ تم اپنے بالوں کی وضع قطع تبدیل کروالو۔''
''اوہ۔روز اول سے یہ لڑکی میرے ہیر اسٹائل کے پیچھے پڑی ہے۔''
''بس اسے نہیں پسند۔''
''اچھا بابا، اس کی یہ شرط منظور ہے مجھے۔'' ظفر نے عاجز آ کر کہا۔

دو تین روز بعد ظفر ہاسپٹل سے واپسی پر جب صباحت کے گھر پہنچا تو تقریباً دو بج چکے تھے، اسے توقع تو نہیں تھی کہ صباحت گھر میں ملے گی، کیونکہ یونیورسٹی سے اس کی واپسی عموماً دیر سے ہی ہوا کرتی تھی- اس دن جانے کیسے وہ جلدی گھر آ گئی تھی- ذرا دیر پہلے ہی سب کھانا کھا کے اٹھے تھے- دادی اماں ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے وضو کر رہی تھیں- ظفر سے سب نے کھانا کھانے کے لئے اصرار کیا مگر وہ ہمیشہ کی طرح جھوٹ بول گیا-

''میں اپنے ایک دوست کے گھر کھانا کھا کے آیا ہوں-''

بہن کی سسرال میں بے موقع بے محل کھانا کھا لینا اسے ناپسند تھا چائے اور شربت تک تو غنیمت تھا- سچی بات تو یہ تھی کہ وہاں زیادہ آنا بھی اس کے نزدیک کوئی پسندیدہ حرکت نہیں تھی، لیکن اب وہ صباحت کی وجہ سے وہاں آنے پر مجبور تھا-

صباحت دادی اماں کی نماز کی چوکی پر ایسی لاتعلق سی بنی بیٹھی تھی جیسے اسے ظفر یا اس کی آمد سے کوئی دلچسپی نہ ہو، دادی اماں نماز پڑھنے آئیں تو وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی- ظفر صائمہ کے کمرے میں آ گیا لیکن وہ الجھ کر رہ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ ناحق ہی اس وقت آ گیا ہے- صباحت سے بات کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی- وہ اس کے کمرے میں کبھی نہیں گیا تھا تو پھر آج کیسے جا سکتا تھا- صائمہ سے اس کی دلی کیفیت پوشیدہ نہیں تھی، اس نے صباحت کو اپنے کمرے میں بلوا لیا اور چند منٹ بعد اپنی ساس کا ادھورا سویٹر اٹھا کر خود صباحت کے کمرے میں چلی گئی-

صباحت اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی دلہن چچی نے یہ چکر کس لئے چلایا ہے- کچھ دیر تو وہ اپنی مسکراہٹ ضبط کئے چپ بیٹھی رہی پھر بولی-

''جو کچھ آپ کو کہنا ہے کہہ کیوں نہیں دیتے-''

''کوئی خاص بات تو نہیں کہنی تھی-''

ظفر جب کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا تو صباحت جانے کے لئے کھڑی ہو گئی اور بولی-

''اچھا تو پھر میں جاؤں؟''

''نہیں-''

''تو پھر کوئی بات کیجئے-''

ظفر ذرا چڑ کر بولا-

''تم اس قدر بنتی کیوں ہو؟''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ اس دن تم نے میری بات کا جواب انکار میں دیا تھا پھر میرے جاتے ہی صائمہ کے سامنے اقرار کیوں کر لیا؟''

''آپ کو تنگ کرنا مقصود تھا-''

''معلوم نہیں تم نے اب بھی سنجیدگی سے فیصلہ کیا ہے یا نہیں؟''

صباحت خاموش بیٹھی مسکراتی رہی-

''اس وقت صاف صاف بتا دو کہ میں تمہاری بات کو مذاق سمجھوں یا حقیقت؟''

''جو چاہیں سمجھ لیں-''

صباحت نے کہا اور ایک دم اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی-

دلہن چچی نے جب ایک دن کچھ ڈرتے ڈرتے اور کچھ جھجکتے ہوئے اپنی ساس اور جٹھانی کے سامنے صباحت کے لئے ظفر کے رشتے کا ذکر کیا تو یہ سن کر ان کی امیدوں پر کچھ اوس سی پڑ گئی کہ صباحت کے لئے خاندان کے تین چار لڑکوں کے رشتے آئے ہوئے ہیں- چار پانچ رشتے باہر کے ہیں- ان پر بھی غور و خوض ہو رہا ہے لیکن فیصلہ بہر حال صباحت کو کرنا ہے- اس لئے ابا میاں کا مشورہ یہ تھا کہ تمام لڑکوں کی تصویریں مع ان کے کل کوائف کے صباحت کو دے دی جائیں- پھر وہ جسے چاہے منتخب کرے-

صباحت بظاہر انجان بنی رہتی تھی لیکن اسے ایک ایک بات کی خبر رہتی تھی-

اماں اور دادی اماں نے ابا میاں کے مشورے کو فی الحال ٹال دیا تھا کیونکہ صباحت امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھی- اس کا ایم اے فائنل ایئر تھا اور یہ بات سب اچھی طرح جانتے تھے کہ ایسے دنوں میں شادی بیاہ یا رشتوں ناتوں کا ذکر چھیڑنا اسے خواہ مخواہ غصہ دلانا ہے-

اس کے امتحان ختم ہونے کے بعد جب دوبارہ یہی ذکر چھیڑا گیا تو صباحت نے ایک دن دلہن چچی کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھماتے ہوئے کہا-

''اماں سے کہئے گا، ان تصویروں میں یہ تصویر بھی شامل کر لیں-''

دلہن چچی نے کچھ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا اور پھر لفافے سے تصویر نکالنے لگیں- تصویر پر نظر پڑتے ہی ان کی حیرانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا- انہوں نے پوچھا-

''صبو، کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا؟''

''مطلب صرف اتنا ہے کہ دوسرے تمام لوگ میرے امیدوار ہیں اور میں ان کی امیدوار ہوں-''

دلہن چچی نے پریشان ہو کر پوچھا-

''صبو تم ان سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

''آپ اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں؟''

''بات ہی حیران ہونے کی ہے۔''

''آخر کیوں، کیا یہ انسان کے بجائے جانور ہیں؟''

''بات یہ نہیں صبو۔''

''تو پھر؟''

''ایک تو بڑی مشکل یہ ہے کہ اتنے عرصے تمہارے ساتھ رہنے کے باوجود میں آج تک یہ نہیں سمجھ سکی کہ تم کون سی بات مذاق میں کہتی ہو اور کون سی سنجیدگی سے۔''

''اس وقت میں واقعی سنجیدہ ہوں۔''

''نہیں بھئی، میں تمہارا یہ کام بالکل نہیں کر سکتی۔''

''اچھی بات ہے، پھر مجھے اپنی مدد آپ کے اصول پر عمل کرنا پڑے گا۔''

''یعنی تم خود یہ لفافہ انہیں دو گی اور کہو گی کہ......''

''جی۔ بالکل۔''

''میں ایک بار پھر یہ بات پوچھتی ہوں صبو کہ تم اپنے ہوش و حواس میں رہ کر یہ بات کہہ رہی ہو؟''

''آپ کو کوئی شبہ ہے؟'' صباحت نے مسکراتے ہوئے کہا اور دلہن چچی کو حیران پریشان چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اگلے ہی روز جب اماں اور دادی اماں سر جوڑے جانے کس موضوع پر چپکے چپکے باتیں کر رہی تھیں تو صباحت نے ان کے قریب جا کر انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''آپ سے ایک بات کہنی ہے اماں۔''

''کہو کیا ہے؟''

صباحت نے ہاتھ میں پکڑا ہوا لفافہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ جو تصویریں عنقریب ہی مجھے دینے والی ہیں ان میں اس تصویر کا اضافہ اور کر لیجئے۔''

اماں اور دادی اماں اس کی بات بالکل نہ سمجھ سکیں، دونوں تصویر حیرت بنی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، پھر جب اماں کے حواس کچھ بجا ہوئے تو انہوں نے اس کے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''کس کی تصویر ہے یہ؟''

''آپ خود دیکھ لیجئے۔''

اماں نے لفافے سے تصویر نکالی تو دادی اماں بھی اپنی عینک درست کرتے ہوئے تصویر پر جھک گئیں۔ تصویر پر نظر پڑتے ہی دونوں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

''ارے یہ تو اختر کی تصویر ہے۔''

صباحت نے سنجیدگی سے کہا۔

''جی ہاں۔''

اماں نے پوچھا۔

''یہ تصویر تمہیں اختر نے دی ہے؟''

''نہیں، وہ کیوں دیتے؟''

''پھر۔؟''

''میں نے ان کے البم میں سے چرائی ہے۔''

''صبو۔'' اماں نے ایک دفعہ پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا صباحت نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

دادی اماں نے کہا۔

''بٹیا، کیا تم اختر میاں سے شادی کرنا چاہتی ہو؟''

صباحت نے دادی اماں سے نظریں ملائے بغیر کہا۔

''جی ہاں، دادی اماں۔''

اماں نے کہا:

''تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو صباحت؟''

''نہیں اماں، میں پورے ہوش و حواس میں رہ کر یہ بات کہہ رہی ہوں۔''

''مگر مجھے شبہ ہے کہ تمہارا دماغی توازن درست نہیں۔''

صباحت نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی اور بولی۔

''نہیں اماں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''اس کی بات پر نہ جاؤ بڑی بہو، یہ مذاق کر رہی ہے۔'' دادی اماں ہنس کر بولیں۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' اماں نے کہا۔

صباحت کو ایک دم ہنسی آ گئی، مگر فوراً ہی وہ سنجیدہ کر بولی ''آپ دونوں کا خیال بالکل غلط ہے۔''

''میں نہیں جانتی بٹیا، تمہارے لئے ایک سے ایک اچھے رشتے آئے ہوئے ہیں، آخر تمہیں یہ کیا سوجھی؟'' دادی اماں نے کہا۔

صباحت خاموش رہی۔

اماں نے دادی اماں سے کہا۔

''اس کی تو ہمیشہ سے مذاق کرنے کی عادت رہی ہے، زندگی میں اس نے کبھی کوئی بات سنجیدگی سے بھی کہی ہے؟''

''اماں یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔'' صباحت نے کہا۔

دادی اماں نے کچھ کہنا چاہا مگر صباحت اٹھ کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد دونوں صباحت کے فیصلے پر رائے زنی کرنے لگیں، رات کو یہ بات ابا میاں اور دو چچا کے گوش گزار کی گئی۔ دلہن چچی بھی موجود تھیں مگر ان کے لئے یہ بات نئی نہیں تھی، پھر متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ یہ ذمہ داری دلہن چچی کے سپرد کی جائے کہ وہ صباحت سے اس مسئلے پر تفصیل سے بات کر کے معلوم کریں کہ آیا وہ سنجیدہ ہے یا اس نے مذاق کیا ہے۔ سبھی کو اس بات کی خبر تھی کہ دلہن چچی اور صائمہ ایک دوسرے کو چچی بھتیجی سے زیادہ سہیلیاں سمجھتی ہیں۔ دلہن چچی نے ہامی تو بھر لی لیکن ان کا دل بہت بجھا سا تھا۔

دلہن چچی نے دوسرے ہی روز صباحت کو پاس بٹھا کر بہت تفصیلی بات کی۔ اس ساری تفصیل کے بعد صباحت کا جواب یہی تھا کہ وہ اختر بھائی سے ہی شادی کرے گی۔ پھر اس کے بعد کچھ پوچھنے کی گنجائش نہیں رہی تھی صباحت چلی گئی تو دلہن چچی اپنے چہیتے بھائی ظفر کے بارے میں سوچتے ہوئے تکیے میں منہ چھپا کر لیٹ گئیں۔ صباحت کے فیصلے پر وہ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ دکھی بھی تھیں۔ لیکن صباحت کی ہنسی اور مسکراہٹ بار بار انہیں کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔

دلہن چچی سے ساری تفصیلات معلوم کرنے کے بعد صباحت کو سمجھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے دبے دبے الفاظ میں پھر واضح طور پر ہر شخص نے اپنی بساط بھر اسے سمجھانے اور اپنا فیصلہ بدل دینے کی کوشش کی، مگر صباحت کا ہر بار وہی جواب تھا اور وہی فیصلہ۔

پھر اختر بھائی کو سب اونچ نیچ سمجھا کر انہیں آمادہ کیا گیا کہ وہ صباحت کو سمجھائیں۔ اختر بھائی کو اس سلسلے میں مورد الزام اس لئے نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا کہ وہ بالکل بے قصور تھے، ان بے چاروں کو تو خبر بھی نہیں تھی کہ صباحت نے اپنے ہی طور پر اپنی زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کر لیا تھا ان تک جب یہ بات پہنچی تو انہیں اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا اور جب انہیں یقین ہو گیا کہ انہوں نے جو کچھ سنا ہے وہ درست ہے تو انہیں شبہ ہوا کہ کہیں صباحت کا دماغی توازن نہ بگڑ گیا ہو پھر انہیں یہ خیال آیا کہ کہیں وہ کوئی بہت بڑا مذاق نہ کر رہی ہو، اس کی شوخی، شرارت اور موقع محل دیکھے بغیر مذاق کرنے کی عادت سارے خاندان میں مشہور تھی۔

مگر اختر بھائی کا دل یہ بات مان لینے پر بھی آمادہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ اتنا بڑا مذاق کر کے اس کے جذبات کو اس طرح مجروح بھی کر سکتی ہے۔

انہیں بہرحال صباحت سے بات کرنی تھی اور اسے ہر صورت میں اس کے ارادے سے باز رکھنا تھا منصوبے کے مطابق انہوں نے ٹیلیفون کر کے اسے بلایا۔ صباحت نے نہ کسی حیرت کا اظہار کیا اور نہ ان کے پاس جانے میں کوئی پس و پیش کیا۔

صباحت جب ان کے گھر پہنچی تو دوپہر ڈھل چکی تھی اور گھر میں بے حد سناٹا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اختر بھائی کے سوا گھر میں کوئی نہ ہو اختر بھائی ذرا دیر پہلے ہی سو کر اٹھے تھے اور تکیوں کا سہارا لئے اپنے بستر پر لیٹے تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ ملازم شام کی چائے لے کر ان کے کمرے میں آئے گا۔ انتظار کی کوفت سے بچنے کی خاطر انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر سے میگزین اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ صباحت آئی تو ملازم نے اسے اختر بھائی کے کمرے میں پہنچا دیا۔

صباحت بڑی سنجیدگی سے سلام کر کے ان کے سامنے بیٹھ گئی اختر بھائی کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اصل موضوع کی طرف آ گئے۔ انہوں نے بڑی گہری نگاہوں سے صباحت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے کیا سوچ کر یہ فیصلہ کیا؟''

''کچھ تو سوچا ہی ہو گا۔''

''وہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''ضروری نہیں، ہر بات ہر شخص کو بتا دی جائے۔''

''میں اور کسی شخص کی بات نہیں کر رہا ہوں، صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔''

''آپ اپنی بات بھی نہ کیجئے۔''

''کیوں نہ کروں۔ اس کا تعلق تمہاری اور میری ذات سے ہی تو ہے۔''

صباحت خاموش رہی۔

''کیا تم نے میری اجڑی ہوئی اور ویران زندگی پر ترس کھا کر یہ فیصلہ کیا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو پھر؟''

''کوئی اور بات کیجئے اختر بھائی۔''

''میں نے تمہیں اسی موضوع پر بات کرنے کے لئے بلایا ہے۔''

''لیکن میں اس موضوع پر اب کسی سے کوئی بات کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔''

اختر بھائی نے سوچا۔

''عجیب سر پھری لڑکی ہے، آخر اسے یہ سوجھی کیا ہے؟ حالانکہ یہ اکثر میرے پاس آتی رہتی ہے لیکن کبھی بھی تو اس کی کسی بات سے ظاہر نہیں ہوا کہ......''

پھر اختر بھائی نے کہا۔

''صباحت میرا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

''تم نے غلط سنا ہوگا۔'' اختر بھائی کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ پھیل گیا۔

ملازم ٹرالی گھسیٹتا ہوا اندر آیا تو صباحت نے کہا۔

''تم جاؤ، میں خود بنالوں گی چائے۔''

''بہت اچھا بی بی۔'' وہ نظریں جھکائے باہر چلا گیا۔

صباحت نے چائے بنا کر اختر بھائی کی طرف بڑھائی۔ انہوں نے چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا صباحت بھی انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اختر بھائی سنجیدہ تھے۔

''دیکھئے نا اختر بھائی! کتنا اچھا لگ رہا ہے۔''

''کیا اچھا لگ رہا ہے؟''

''یہی کہ ہم دونوں اس طرح بیٹھے ہوئے ہیں، میں آپ کو چائے بنا کر دے رہی ہوں۔''

اختر بھائی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بس اسی طرح مسکرایا کیجئے، آپ مسکراتے ہوئے بہت اچھے لگتے ہیں۔''

''بکومت۔'' اختر بھائی نے مصنوعی ناراضگی کا اظہار کیا۔

''آپ جو اتنے پیار سے مجھے ڈانٹ رہے ہیں۔ مجھے یہ بھی بہت اچھا لگ رہا ہے۔''

''تمہارا تو دماغ خراب ہوگیا ہے صباحت۔''

''اگر آج کو خالہ امی زندہ ہوتیں تو میں یقیناً ان سے آپ کی شکایت کرتی اور وہ آپ کو......''

اختر بھائی نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ لے کر اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہے، چائے ختم ہوئی تو صباحت نے کہا۔

''ایک بات بتایئے اختر بھائی۔''

''پوچھو؟''

''کیا میں آپ کو ذرا بھی اچھی نہیں لگتی۔''

اختر بھائی نے سگریٹ سلگائی اور سگریٹ کا ایک کش لیتے ہوئے بولے۔

''تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو صباحت مگر میں نے تمہارے بارے میں اس انداز سے کبھی نہیں سوچا جس طرح تم سوچ بیٹھی ہو۔''

''تو اب سوچ لیجئے۔''

''نہیں، اب بھی نہیں سوچ سکتا۔''

''نہ سوچئے، مگر میں آپ ہی سے شادی کروں گی۔''

صباحت کھڑی ہوگئی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''میں گھر جا رہی ہوں۔''

''گھر جانے سے پہلے مجھ سے وعدہ کرو کہ تم یہ بے جا ضد نہیں کروگی۔''

''کون سی بے جا ضد؟'' صباحت نے انجان بن کر کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ میرے ساتھ شادی کرنے کا حماقت آمیز فیصلہ بدل دو۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔''

اختر بھائی نے ایک طویل سانس لے کر اس کی طرف دیکھا اور بولے۔

''اچھا تم میرے سامنے آ کر بیٹھو۔''

صباحت کرسی سرکا کر دوبارہ بیٹھ گئی۔

پھر تقریباً ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اختر بھائی نے ہر انداز سے اسے سمجھایا، ڈانٹا، ڈپٹا، پیار سے سمجھایا۔ اس کے فیصلے کا برے سے برا اور خطرناک سے خطرناک پہلو اسے سمجھایا مگر وہ چکنا گھڑا بنی بیٹھی رہی۔ ان کی بات کا جواب دیا بھی تو صرف یہی۔

''اختر بھائی، میں کوئی ناسمجھ بچی نہیں ہوں۔ آپ ناحق اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔''

اختر بھائی ایک دم غصے میں آ کر بولے۔

''تو پھر دفع ہو جاؤ میرے سامنے سے۔''

''ٹھیک ہے، جا رہی ہوں۔''

وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے ایک دفعہ پلٹ کر دیکھا۔ اختر بھائی جھکے ہوئے دوسرا سگریٹ سلگا رہے تھے۔ لائٹر کے ننھے سے شعلے کی لو ان کے چہرے پر کانپ رہی تھی۔ ان کی خوبصورت پیشانی پر بکھرے ہوئے خمدار بال پنکھے کی ہوا سے ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ ان کا من موہنا سا چہرہ سچ مچ ایسا تھا جو چپ چاپ نگاہوں کی راہ سے دل میں اتر جائے، مگر صباحت نے ان سے شادی کرنے کا فیصلہ اس لئے نہیں کیا تھا اور شاید اس نگاہ سے تو اس نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا اختر بھائی کی نگاہیں اوپر اٹھیں۔ صباحت چپ چاپ ان کے قریب

بلی گئی اس نے مدھم آواز میں کہا۔
''اختر بھائی؟''
''کیا ہے؟'' اختر بھائی کا انداز ناراضگی لئے ہوئے تھا۔
''پلیز اختر بھائی، آپ کو اس کی قسم جو آپ کو دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو۔''
اختر بھائی خاموش بیٹھے بڑی گہری سوچوں میں ڈوبے رہے اور صباحت گھر چلی گئی۔ اس کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی اختر بھائی نے اس کے گھر ٹیلیفون کیا۔
''میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے خالہ امی، مگر میں اسے سمجھا نہیں سکا اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ آپ لوگ جہاں چاہیں اس کی شادی زبردستی کر دیں۔''
''وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں ہے اختر، جن کے ساتھ زبردستی کی جا سکے۔'' انہوں نے کہا اور ریسیور رکھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے دل میں کہا۔
''خدا کرے صباحت! یہ بھی تمہارا کوئی مذاق ہو۔''
دلہن چچی نے جب یہ دیکھا کہ اب پانی سر سے اونچا ہو چکا ہے تو انہوں نے ظفر کو سب کچھ بتا دینا ہی مناسب سمجھا۔ اور ظفر سے یہ سب کچھ کہہ دینے کے لئے وہ کئی دنوں تک اپنے آپ کو تیار کرتی رہیں۔ ظفر کو جانے کیوں یقین نہ آ سکا، اس نے کہا۔
''مذاق نہ کرو صائمہ۔''
''اسے حقیقت سمجھ کر تسلیم کر لو ظفر۔'' صائمہ نے دکھ سے کہا۔
''نہیں صائمہ وہ ایسا نہیں کر سکتی، میں اسے اتنا بڑا مذاق نہیں کرنے دوں گا۔''
''اس کے اوپر کسی کے سمجھانے کا اثر نہیں ہوتا ظفر تم کیا کر لوگے۔''
''جانے کیوں مجھے اپنے اوپر ایک اعتماد سا ہے، شاید میری بات کا اثر ہو ہی جائے۔''
''ٹھیک ہے، تم بھی کوشش کر کے دیکھ لو۔''
''اچھا میں کل آؤں گا۔''
''کل نہیں، پرسوں آنا۔''
''کیوں؟''
''پرسوں شام ہم لوگ ہاسپٹل جائیں گے، رقیہ چچی کی بڑی بہو کے یہاں بیٹا ہوا ہے، صباحت گھر میں تنہا ہوگی۔''
اس روز صبح ہی سے آسمان ابر آلود تھا۔ گھٹائیں اس طرح تھمی کھڑی تھیں جیسے اب برسیں کہ تب برسیں۔ دوپہر کے بعد وقفے وقفے سے رم جھم رم جھم ہونے لگی۔ شام کو دادی اماں، اماں اور دلہن

چچی ہاسپٹل چلی گئیں۔ گھر کے دوسرے لوگوں کو وجو چچا اپنی گاڑی میں بھر کر سیر کرانے لے گئے۔ صباحت کا موڈ ان دنوں بہت عجیب و غریب ہو رہا تھا، وہ وجو چچا کے بہت اصرار کے باوجود نہیں گئی۔ ان لوگوں کے جاتے ہی پھر ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں۔ صباحت ٹرانسسٹر کھول کر دریچے کے قریب بیٹھ گئی۔ بڑی خوبصورت غزل نشر ہو رہی تھی۔

دیکھ تو دل کہ جاں سے اٹھتا ہے
یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے

وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے غزل سنتی رہی اور خود بھی گنگناتی رہی۔ اسی وقت مخصوص انداز میں گاڑی کا ہارن بجا۔ صباحت سمجھ گئی کہ کون ہو سکتا ہے، تھوڑی دیر بعد ملازم نے ظفر کے آنے کی اطلاع دی تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر کہا۔
''انہیں یہیں بھیج دو۔''
چند سیکنڈ بعد ظفر اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔
''بیٹھ جایئے۔'' صباحت نے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔
''میں بیٹھنے کے لئے نہیں آیا ہوں۔''
''پھر؟''
''تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں۔''
''کھڑے کھڑے باتیں کریں گے؟'' صباحت مسکرائی۔
ظفر خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔
''آخر ناراضگی کس بات کی ہے جو اس انداز سے دیکھ رہے ہیں، اور عجلت کس بات کی ہے جو دو گھڑی کے لئے بیٹھنا بھی نہیں چاہتے۔''
صباحت اپنے مخصوص شوخ انداز سے ہنسی۔
''جو کچھ میں نے سنا ہے اس کے بعد مجھے ناراض ہی ہونا چاہیے۔'' ظفر نے کہا۔
''اچھا، کیا سنا ہے؟ بتایئے، مگر بیٹھ جایئے۔''
ظفر نے غصیلے انداز سے کرسی گھسیٹی اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔
''میں نے سنا ہے تم اپنے کسی اختر بھائی سے شادی کرنا چاہتی ہو۔''
''جی ہاں، آپ نے ٹھیک سنا ہے۔'' صباحت کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔
''کیا تم سنجیدہ ہو؟''
''جی، بالکل۔''

"مجھے یقین نہیں آتا۔"

"کیوں؟"

"مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ بھی تمہاری کوئی شرارت ہے۔"

"اگر یہ میری شرارت ہے تو آپ اس قدر ناراض کیوں ہیں؟"

ظفر نے بڑی پریشانی سے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا جو صباحت کے اصرار کی وجہ سے اس نے چھوٹے کروالئے تھے، پھر کچھ تلخ لہجے میں بولا۔"صباحت تم معمہ بننے کی کوشش کیوں کرتی ہو؟"

"ممکن ہے اس کی کوئی نفسیاتی وجہ ہو۔"

"یعنی؟"

"شاید میں نے یہ محسوس کیا ہو کہ مجھے دوسروں کی توجہ نہیں ملی، لہٰذا دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاطر......"

"میں بہت سنجیدہ ہوں صباحت۔"

"میں بھی مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"میں ایک بار پھر پوچھتا ہوں کہ تم اختر بھائی کے لئے سیریس ہو؟"

"ہاں۔"

"تو پھر میں اپنے بارے میں کیا سوچوں؟"

"کبھی کبھی مذاق کرنے کو بھی دل چاہتا ہے ظفر۔" صباحت مسکرائی۔

"یعنی تم نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا۔"

"ہاں۔"

"مجھے یقین نہیں آتا۔"

"اس بے یقینی کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو صباحت، صائمہ نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے بڑی خوشی سے میرے ساتھ شادی پر آمادگی ظاہر کی تھی۔"

"وہ مذاق تھا ظفر، آپ آخر سمجھتے کیوں نہیں۔"

"تم نے میرے ذہن کو اس قدر مفلوج کر کے رکھ دیا ہے صباحت کہ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم نے اس وقت مذاق کیا تھا یا آج مذاق کر رہی ہو۔"

صباحت کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر ہنس پڑی، ظفر اس کی ہنسی سے چڑ کر بولا۔

"کبھی تو سنجیدہ ہو جایا کرو صباحت۔"

صباحت نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

"بعض لوگوں کو کسی طرح چین نہیں آتا، سنجیدہ ہو جاؤں تو کہتے ہیں کہ ہنسا کرو، مسکرایا کرو، ہمیں تنگ کیا کرو، تمہارا یہ روپ پسند نہیں اور جب ان کے کہنے پر عمل کرو تو کہتے ہیں......"

ظفر اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"کل تم اختر بھائی سے بھی کہہ دینا کہ میں نے آپ سے مذاق کیا تھا مجھے آپ سے شادی نہیں کرنی۔"

"شادی کیا بڑی اہم چیز ہے ظفر؟"

ظفر اس کی یہ بات سن کر غصے سے کھول اٹھا اور بولا۔

"تم جیسی لڑکیوں کے نزدیک یہ مقدس بندھن واقعی کوئی اہمیت نہیں رکھتا جو محبت کے مفہوم سے بھی ناواقف ہیں اور مردوں سے مسکرا کر صرف اس لئے بات کرتی ہیں کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو جائیں۔تم جیسی لڑکیاں صرف فلرٹ کرنا جانتی ہیں۔"

صباحت مسکرا کر بولی۔

"بہت خوف ظفر، بڑی جلدی اندازہ لگا لیا آپ نے میرے خیالات کا۔"

ظفر نے نفرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور مجھے تو تم نے روز اول سے اپنے مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔"

صباحت ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔

"اتنی بدگمانی اچھی نہیں ہوتی ظفر۔"

"مجھے مزید بیوقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔"

ظفر غصے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔اسی وقت بادل بڑی زور سے گرجے اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔

"ظفر اگر میں نے اپنا فیصلہ بدل کر بہت بڑا جرم کیا ہے تو یہی سہی لیکن مجرم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا موقع تو دیتے ہی ہیں نا۔"

"مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی، تم انتہا سے زیادہ جھوٹی لڑکی ہو جس کی کسی بات کا اب میں زندگی بھر کوئی اعتبار نہیں کر سکتا۔"

"ظفر!" صباحت نے بڑی مشکل سے اس کے زہر میں بجھے ہوئے الفاظ کو برداشت کیا۔

ظفر انتہائی غصے سے دروازہ کھول کر بارش میں بھیگتا ہوا باہر نکل گیا۔گاڑی میں بیٹھ کر اس نے بڑی زور سے دروازہ بند کیا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

صباحت نے ٹرانسسٹر کی آواز اونچی کر دی- غزل کے بول سن کر اس کے سینے میں کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی-

ستم گر مرے کہ اپنی راتوں میں
اب ہجر کی کوئی رات نہیں

اس نے ٹرانسسٹر بند کر دیا اور دریچے میں جھک کر بارش میں بھیگے ہوئے سبزے کو دیکھنے لگی- بڑا حسین موسم تھا لیکن موسم کا یہ حسن اس کے دل کی سوگواری کو کم نہ کر سکا- آج زندگی میں پہلی بار اس کا دل درد کی بڑی عجیب لذت سے آشنا ہوا تھا- دکھ اسے اس بات کا تھا کہ ظفر نے اس کی بات تک سننا گوارہ نہیں کی، ہوا کے ایک جھونکے کے ساتھ بوچھار دریچے کی راہ کمرے میں آ گئی اور اس کے چہرے اور بالوں کو بھگو گئی-

وہ دریچے سے ہٹ کر اپنے بستر پر آ گئی اور تکیوں میں منہ چھپا کر لیٹ گئی- بند پلکوں تلے پھر وہی ایک شبیہہ تھی...... ظفر کی شبیہہ-

"اگر محبت کی بات کرتے ہو ظفر تو اب زندگی بھر میں تم سے یہ نہ کہہ سکوں گی اور نہ کہوں گی کہ تم سے زیادہ مجھے دنیا میں کوئی عزیز نہیں کوئی بھی تو نہیں- تم نے سمندر کی سطح کو دیکھ کر اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی، اتنی نادانی کی توقع نہیں تھی تم سے- اگر تم دو گھڑی کے لئے صبر سے بیٹھ جاتے تو شاید میں تمہیں بتا ہی دیتی کہ زندگی کے اتنے بڑے اور اہم فیصلے بلا کسی وجہ اور سبب کے نہیں کئے جاتے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کی زبان سے نکلے ہوئے چند الفاظ ہماری سوچوں کے انداز یکسر بدل کے رکھ دیتے ہیں- ہمارے وجود تک کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں اور ہمارے خیالات کو اس قدر پریشان کرتے ہیں کہ ہم اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے حسین خوابوں کے دھنک رنگ پیرہن تار تار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں-

میری زندگی میں بھی ایک روز بالکل اچانک ایسا ہی موڑ آ گیا ظفر اختر بھائی کی بڑی بیٹی ترنم کو شاید تم نے دیکھا ہو- بلکہ شاید تم نے ان کی تینوں بیٹیوں کو دیکھا ہو- تم نے دو ایک بار ہی دیکھا ہو گا مگر میں نے انہیں اکثر دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ماں کی محبت اور ممتا سے محروم وہ بچیاں کس طرح پل رہی ہیں- ان کی کوئی نانی نہیں، خالہ نہیں جو ان کے دکھ کو محسوس کر کے انہیں سینے سے لگا لے- چچی کو کوئی پرواہ نہیں کہ کبھی آ کر اس اجڑے ہوئے گھر میں بھی جھانک لیں، پھوپھیوں کو کوئی دلچسپی نہیں- اختر بھائی ان کے لئے کتنی دفعہ چھان بین کر کے آیائیں رکھیں انہیں دنیا میں صرف یہی ایک کام تو نہیں، خاندان کی تقریبات میں وہ لڑکیاں جس حلیے میں شریک ہوتی ہیں، اسے دیکھ کر کم از کم میرا دل تو بہت دکھتا ہے-

جانتے ہو ظفر پچھلے دنوں کیا ہوا؟ چھوٹی پھپھو کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی، میں نے ان بچیوں کے کپڑے خود تیار کئے تھے اور شام کو تیار ہو کر میں اختر بھائی کے گھر اس لئے گئی تھی کہ ان بچیوں کو تیار کر کے اپنے ساتھ شادی میں لے جاؤں گی- اختر بھائی تو جانے کدھر تھے مگر بچیوں کے کمرے میں ایک چیخ پکار مچی ہوئی تھی- چار سالہ افشین اور دو سالہ نوشین بے تحاشا رو رہی تھیں- نوشین نے امی، امی کی صدا لگا رکھی تھی اور ترنم...... وہ اتنی ننھی سی گڑیا، پھول سی بچی اس سے کہہ رہی تھی-

"مت رو نوشین! ابو کہہ کر گئے ہیں کپڑے بدل لو پھر وہ ہمیں شادی میں لے جائیں گے-"

"میں امی سے کپڑے بدلوں گی-" نوشین نے سسکیوں کے درمیان کہا-

تمہیں کیسے بتاؤں ظفر کہ ترنم نے کتنی حسرت سے کہا-

"نوشین! امی تو مر گئیں، اب میں تمہاری امی ہوں، کیونکہ میں گھر میں بڑی ہوں نا-"

میں کسی کو کیسے بتاؤں کہ یہ چند الفاظ سن کر میں سر تا پا لرز کر رہ گئی- میرا دل درد کے انبار تلے دب کر چور چور ہو گیا-

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے آپ کو ہنستے مسکراتے پایا ہے- اس روز میری آنکھوں میں پہلی بار آنسو آئے-

وہ پوری رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی ظفر! دل اور دماغ میں اتنی شدید جنگ ہوئی کہ میرا وجود پس کر رہ گیا- دل یہ کہتا تھا کہ اپنے حسین خوابوں کے دھنک رنگ پیرہن اپنے ہاتھوں سے تار تار نہ کرو اور دماغ یہ کہتا تھا کہ اپنے لئے تو ساری دنیا جیتی ہے، تم اگر دوسروں کی خاطر زندہ ہو گی تو ہنگامہ روز و شب میں کوئی فرق نہیں پڑے گا- اختر بھائی کہیں اور بھی شادی کر سکتے ہیں، ان بچیوں کی ماں کوئی اور بھی بن سکتی ہے، لیکن میں کسی دوسری عورت پر اعتماد کیسے کر لوں؟

کاش! تم یہ ساری داستان مجھ سے سن لیتے ظفر، پھر میں تم سے پوچھتی کہ-

"سچ کہو، کیا میں نے غلط فیصلہ کیا ہے- میں نے غلط قدم اٹھایا ہے؟"

سب یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے اختر بھائی سے عشق ہو گیا ہے، چلو یونہی سہی، میں کسی کے خیال کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کروں گی مجھے کسی سے کوئی شکوہ بھی نہیں، شکوہ ہے تو صرف تم سے کہ ابھی تو اختر بھائی نے میری بات بھی نہیں مانی اور تم یوں بدگمان ہو کر چلے گئے- بڑا مان تھا مجھے تمہارے اوپر کہ تم یہ سب کچھ سن کر مجھے سراہو گے مگر تم......"

صباحت کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا- باہر گاڑی کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، اماں وغیرہ واپس آ گئی تھیں دلہن چچی تھوڑی دیر بعد اس کے چہرے کا جائزہ لے کر کچھ

اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں اور ہر بار ناکام ہو رہی تھیں۔

اگلے روز صباحت اماں سے فرحت کے گھر جانے کا کہہ کر اختر بھائی کے پاس پہنچ گئی۔ اختر بھائی بک شیلف کے قریب کھڑے کسی کتاب کا انتخاب کر رہے تھے۔ قدموں کی آہٹ پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ صباحت کا خاموش چہرہ اور متورم آنکھیں دیکھ کر وہ چونکے، پھر بولے۔

''آؤ صباحت؟''

صباحت اندر آئی تو وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

''بیٹھو۔'' انہوں نے کہا۔

صباحت کھڑی رہی۔

''کیا بات ہے؟''

صباحت خاموش رہی۔

اختر بھائی مسکرا کر بولے۔

''کیا وہ حماقت آمیز فیصلہ تم نے اب تک نہیں بدلا؟''

صباحت نے ایسی زخمی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا کہ اختر بھائی کی نظریں جھک گئیں۔ کچھ لمحے بڑی خاموشی سے گزر گئے۔ پھر اختر بھائی نے خود کو سنبھالا اور بولے۔

''بولو صباحت، اتنی چپ کیوں کھڑی ہو؟''

صباحت آہستہ آہستہ ہوتی ان کے قریب پہنچی اور ان کے برابر ہی بیٹھ گئی۔ اختر بھائی نے ذرا سا مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ صباحت کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ پھر ایک دم وہ اختر بھائی کے شانے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

اختر بھائی پریشان ہو گئے۔

''کیوں رو رہی ہو صباحت، کچھ تو بتاؤ۔''

صباحت نے کوئی جواب نہیں دیا، روتی رہی۔ اختر بھائی نے بھی تھوڑی دیر تک اس سے کچھ نہیں پوچھا۔ خاموش بیٹھے اس کی پیٹھ تھپکتے رہے۔

خالہ زاد بہن ہونے کے ناتے وہ بچپن سے ان کے بہت قریب رہی تھی، لیکن انہوں نے کبھی اسے اس نگاہ سے نہیں دیکھا تھا۔

صباحت کی سسکیاں تھمیں تو اختر بھائی نے پھر اس سے رونے کا سبب پوچھا۔

صباحت نے کہا۔

''میں اس روز آپ کو آپ کی سب سے عزیز ہستی کی قسم دے کر گئی تھی۔ پھر بھی آپ نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔''

''نہیں۔''

''پھر آپ میرے رونے کا سبب پوچھتے ہیں؟''

اختر بھائی خاموش رہے۔

''اپنا سب کچھ کھو کر بھی اگر مجھے اپنے جذبے کا قدرداں کوئی نہ ملے تو پھر مجھے رونا ہی چاہئے۔''

اختر بھائی بالکل نہ سمجھ سکے کہ سب کچھ کھونے سے اس کی کیا مراد ہے۔ انہیں ظفر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

صباحت ایک دم اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد وہ نوشین کو گود میں اٹھائے اور ترنم کا ہاتھ تھامے ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی اور زخم خوردہ لہجے میں بولی۔

''مجھے آپ سے عشق نہیں ہے اختر بھائی۔ میں ان کی خاطر آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

اس نے ترنم اور نوشین کی طرف اشارہ کیا۔

''ان کی خاطر میں بے حیا اور بے غیرت بن کر بار بار آپ سے کہتی ہوں کہ میں آپ سے شادی کروں گی۔

میری شادی کہیں اور بھی ہو سکتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ایک نہ ایک دن کہیں شادی کر لیں گے۔ اس کے بعد اگر یہ بچیاں برباد ہوئیں تو نہ میں سکون سے رہ سکوں گی اور نہ آپ۔''

اختر بھائی تصویرِ حیرت بنے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صباحت نے ترنم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ نوشین سے کہتی ہے کہ میں تمہاری امی ہوں، اس سے پوچھئے یہ اس کی امی کیسے ہو سکتی ہے؟''

اختر بھائی کی نگاہیں جھک گئیں۔ صباحت نے ملامت آمیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور ترنم اور نوشین کے ساتھ باہر نکل گئی۔ اختر بھائی نے صوفے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے سوچا۔

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا صباحت کہ تمہارا انداز فکر تمہیں اتنی بلندیوں پر بھی لے جا سکتا ہے، تم جو اتنی بے فکری سے ہنستی مسکراتی رہتی ہو، تمہاری سوچوں کا انداز ایسا بھی ہو سکتا ہے، تم اتنی حساس بھی ہو سکتی ہو؟''

صباحت دوبارہ کمرے میں آئی تو اختر بھائی دریچے میں کھڑے تھے، انہوں نے پلٹ کر صباحت کی طرف دیکھا اور اپنے آپ کو بہت کمتر محسوس کیا۔

صباحت نے پوچھا-

''اختر بھائی، میں واپس جاؤں؟''

اختر بھائی نے کہا-

''ہاں-مگر لوٹ کر یہیں آنا اور خدا سے دعا کرنا کہ زندگی میں کوئی لمحہ ایسا نہ آئے جب اختر بھائی کے دل میں تمہاری قدر و قیمت ذرا سی بھی کم ہو-''

صباحت ایک دم مسکرادی اور اختر بھائی کے قریب آ کر بولی-

''یہ جذبہ اور قدر و قیمت تو سب لفظی باتیں ہیں-اصل میں تو آپ کی صورت پہ فریفتہ ہوگئی تھی میں-کیوں آپ تو یہی سمجھ بیٹھے تھے نا؟''

''نہیں صباحت! ایسی بات کبھی نہیں سوچی میں نے-''

''تو اب سوچ لیجئے-'' صباحت ہنسی اور صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی-''کیسی عجیب بات ہے، مجھے اپنے گھر میں چائے بھی نہیں ملتی-''

اختر بھائی چائے کے لئے کہنے گئے تو اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور دل ہی دل میں بولی-

''ظفر مجھے معاف کر دینا، تمہارے خوابوں کے دھنک رنگ پیرہن میں نے تار تار کر دیے مگر چند دوسرے لوگوں کی زندگی تو سنور جائے گی-کتنا پرسکون محسوس کر رہی ہوں میں اس وقت اپنے آپ کو-''

آؤ اب لوٹ چلیں

نومبر 1982ء

برسات کی پھواروں میں بھیگی ہوئی سرد ہواؤں کے جھونکے کھڑکی کے پردوں سے ہل رہے تھے' اور میز پر رکھے ہوئے رسالے کے صفحات ''پھڑ پھڑ'' کی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ اڑ رہے تھے-ثمرین نے شیدی کا مفلر رفو کرتے ہوئے سر اٹھا کر چند لمحوں کے لئے کھڑکی سے باہر دیکھا اور دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی-

موسم آج صبح سے ہی بہت خوشگوار اور حسین تھا-شیدی اور سہیل بھائی پچھلی رات دیر تک تاش کھیلنے کے بعد صبح دس بجے سو کر اٹھے تھے' سہیل بھائی کو تو خیر امی کیا کہتیں' وہ ان کے چہیتے بھانجے ٹھہرے' اور یوں بھی ان کی حیثیت ایک طرح سے مہمان کی سی تھی-ان کا کچھ ٹھیک نہیں تھا جانے کب' کس وقت ان کا ٹرانسفر ہو جائے اور وہ اپنا بوریا بستر لپیٹ کر چل دیں-شیدی کو البتہ امی نے خوب ڈانٹا' مگر شیدی بھی چکنا گھڑا تھا-اس کے اوپر کسی کی ڈانٹ ڈپٹ کا اثر بالکل نہیں ہوتا تھا-ہر سنیچر کو وہ رات گئے تک تاش کھیلتا تھا-اتوار کو نو دس بجے سو کر اٹھتا تھا' امی کی ڈانٹیں سنتا تھا اور دانت نکالے ہوئے جلدی جلدی ناشتہ کرتا رہتا-جب سے سہیل بھائی آئے تھے' شیدی اور امی کے اس معمول میں فرق نہیں آیا تھا-

آج بھی معمول کے مطابق شیدی نے امی کی ڈانٹ سنتے ہوئے ناشتہ کیا اور مسکرا مسکرا کر سہیل بھائی کی طرف دیکھتا رہا-ناشتے کے بعد سے جو دونوں غائب ہوئے تو شام کو ہی ان کی صورتیں نظر آئیں-ثمرین نے بڑے ہونے کے ناطے جب شیدی کو ڈانٹنے کی کوشش کی تو شیدی نے

شرارت آمیز نگاہوں سے سہیل بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
''مجھے ڈانٹے جارہی ہیں انہیں کچھ نہیں کہتیں۔''
''کیا مطلب؟'' ثمرین نے کہا۔
''مطلب یہ کہ میرا کوئی قصور نہیں۔ میں تو بڑوں کے نقش قدم پر چلنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔'' شیدی نے سعادت مندی سے کہا۔
''بیکار باتیں مت کرو۔'' ثمرین نے کہا۔
''یہ بیکار بات نہیں ہے جناب' آپ ذرا سنجیدگی سے سوچئے آپ مجھے ناحق ڈانٹ رہی ہیں۔'' شیدی نے کہا۔
''تو پھر کسے ڈانٹوں؟'' ثمرین غصے سے بولی۔
''سہیل بھائی کو۔'' شیدی نے کہا۔
ثمرین چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی۔
''انہوں نے ہی مجھ سے کہا تھا' چلو میں چلا گیا۔'' شیدی نے کہا۔
''ہاں بڑے سعادت مند ہونا تم۔'' ثمرین نے کہا۔
''میری سعادت مندی میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔'' شیدی نے ڈھٹائی سے کہا۔
''میری بھی شامت آئی تھی جو تمہارے منہ لگی۔'' ثمرین نے زچ ہوکر کہا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے ایک سرسری نگاہ سہیل بھائی پر ڈالی جو سینے پر دونوں ہاتھ باندھے بڑے اطمینان سے دریچے سے ٹیک لگائے کھڑے تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرے بڑے غور سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔
''آپ ذرا ادھر تشریف لائیے!''
ثمرین کے بڑھتے قدم رک گئے' اس نے پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور قریب آتے ہوئے بولی۔
''جی فرمائیے!''
''آپ شیدی سے اتنی زیادہ بڑی بھی نہیں ہیں کہ اس طرح اس پر رعب جھاڑیں۔'' سہیل بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔
''آپ سے کیا مطلب' آپ کو تو نہیں ڈانٹا میں نے؟'' ثمرین نے کہا۔
''تو مجھے بھی ڈانٹ لیجئے' یہ حسرت بھی پوری ہوجائے۔'' سہیل بھائی مسکرائے۔
''خواہ مخواہ ہی آپ سے میرا کیا واسطہ؟'' ثمرین نے کہا۔

''خوب' بلکہ بہت خوب۔'' سہیل بھائی نے کہا۔
''جی!'' ثمرین نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔
''میں ناحق ہی خوش فہمی کا شکار تھا۔''
سہیل بھائی کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔
''کیسی خوش فہمی سہیل بھائی؟'' شیدی چونکا۔
''اماں یار یہی کہ رشتے میں میں بھی ان کا ــــــ کچھ لگتا ہوں۔'' سہیل بھائی نے مایوسانہ انداز سے کہا۔
''سہیل بھائی' مجھے تو شبہ ہے کہ میرے ساتھ بھی ان کی کوئی رشتہ داری ہے یا نہیں۔'' شیدی نے کہا۔
سہیل بھائی نے کہا۔ ''نہیں یار' تمہارے ساتھ تو ان کی رشتہ داری پکی ہے' دیکھو نا تمہیں تو خوب ڈانٹتی ہیں۔''
''لاحول ولاقوۃ کیا بچکانہ باتیں ہیں؟''
ثمرین پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔
ثمرین کا موڈ آج دوپہر سے ہی خراب تھا۔ اتوار کے دن عموماً اس کے اوپر اس قسم کی جھنجھلاہٹ سوار ہوتی تھی۔ وجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوتی تھی کہ صبح سے لے کر رات گئے تک گدھوں کی طرح جتے رہنا پڑتا تھا۔ ہفتے بھر کے سارے رکے ہوئے کام اتوار کو ہی کرنے پڑتے تھے۔ اتوار کے دن امی کو مکمل طور پر چھٹی دے دی جاتی تھی کہ وہ جی بھر کے آرام کرلیں۔ گھر کی صفائی ستھرائی' کھانا پکانا' اپنے کپڑوں کی دھلائی' استری' غرضیکہ اتنے کام ہوتے تھے کہ دوپہر کو کمر ٹکانے کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ تقریباً ہر اتوار کو ماہین آپا بھی اپنے بچوں اور عثمان بھائی کے ساتھ آجاتی تھیں۔ عثمان بھائی کی وجہ سے کھانے کا کچھ بہتر ہی انتظام کرنا پڑتا تھا۔ کام کرنے والی وہ تھی یا ثروت آپا۔ فرحت گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے بچی ہی سمجھی جاتی تھی۔ اس سے برائے نام ہی کوئی کام کروایا جاتا تھا۔
ماہین آپا شام کی چائے کے بعد ہی چلی گئی تھیں' ورنہ عموماً ان کو رات کے کھانے پر بھی روکا جاتا تھا۔ صبح سے ہی بارش کے آثار تھے' اس لئے امی اور ابا میاں نے بھی ان کو رات کے کھانے تک ٹھہرنے کے لئے اصرار نہیں کیا۔ ان لوگوں کو رخصت کرنے کے بعد ثمرین اپنے کپڑوں پر استری کرنے کھڑی ہی ہوئی تھی کہ شیدی آدھمکا۔ اس نے آتے ہی حکم دے دیا:
''دو کپ چائے ثمرین آپا!''

ثمرین کے کچھ کہنے سے پہلے ہی سہیل بھائی بھی آ موجود ہوئے' ثمرین جھنجھلائی ہوئی تھی- اس نے شیدی پر برسنا شروع کر دیا- آخر کار تھک ہار کر پیر پٹختی ہوئی چائے بنانے چل دی- ان دونوں کے لئے چائے بنا کر لائی تو شیدی نے ایک نیا شگوفہ چھوڑا-

''آپا' سہیل بھائی چائے نہیں پئیں گے-''

''کیوں؟'' ثمرین نے پوچھا-

''وہ کہتے ہیں کہ جب آپ کا ان سے کوئی واسطہ' کوئی رشتہ داری نہیں تو وہ آپ کے ہاتھوں کی چائے بھی کیوں پئیں-'' شیدی نے اپنے چہرے کو انتہائی سنجیدہ بنا کر کہا-

''پئیں چاہے نہ پئیں-''

ثمرین نے چائے کا کپ میز پر رکھتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی-

اپنے کپڑوں پر استری کر کے وہ بیٹھی ہی تھی کہ سامنے والی کھڑکی میں سہیل بھائی نظر آئے- چوکھٹ پر دونوں کہنیاں ٹیک کر وہ اندر کی طرف جھکتے ہوئے بولے:

''ایک بات کہوں؟''

''جی؟'' ثمرین نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا-

''آج مجھے اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ....''

وہ ایک لمحے کے لئے رکے-

''کس بات کا اندازہ ہو گیا؟'' ثمرین ایک دم پوچھ بیٹھی-

''یہی کہ آپ کو میری قطعی پروا نہیں-''

''اچھا!''

''لیکن فرض کیجئے کہ آپ کو ساری زندگی میرے ساتھ رہنا پڑے تو؟''

سہیل نے بات ادھوری چھوڑ دی-

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی-''

''میرا مطلب ہے کہ پھر اس کہانی کا انجام کیا ہوگا؟''

ثمرین نے ایک سیکنڈ کے لئے خشمگیں نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور درشت لہجے میں بولی-

''سنئے سہیل بھائی' میں اپنی زندگی میں کسی کہانی یا افسانے کو جگہ دینا نہیں چاہتی اور اگر آپ کا دل و دماغ کہانی کا آغاز کر چکا ہے تو اسے یہیں پر ختم کر دیجئے-''

''ثمرین!''

سہیل بھائی نے حیرت زدہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا-

''جی ہاں' اسی میں آپ کی بہتری ہے اور شاید میری بھی-''

''اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی آپ بیشک مجاز ہیں لیکن ....'' سہیل بھائی ایک لمحے کے لئے رکے پھر بولے- ''میرے لئے کیا بہتر ہے اور کیا بدتر' یہ میں آپ سے زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں-''

''بہرحال کچھ بھی سہی' آئندہ آپ مجھ سے اس قسم کی باتیں نہ کیجئے گا-'' ثمرین کا لہجہ سپاٹ تھا-

''بہت بہتر' اور کوئی حکم؟''

سہیل نے انتہائی سنجیدگی سے کہا-

ثمرین نے کوئی جواب نہیں دیا-

سہیل بھائی مزید کچھ کہے بغیر کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئے-

سہیل بھائی کے جانے کے بعد ثمرین کافی دیر تک الجھی الجھی سی بیٹھی رہی- اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اتنے سخت لہجے میں سہیل بھائی سے کیوں بات کی' لیکن اس کا دماغ اسے مسلسل یہی سمجھا رہا تھا کہ تم نے جو کچھ کہا بالکل ٹھیک کہا-

سہیل بھائی کو یہاں آئے تقریباً ایک سال ہو چکا تھا- تین چار مہینے اس طرح گزر گئے کہ ثمرین کو ان کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوا- اس کی اپنی مصروفیات بہت تھیں- پڑھنے لکھنے کے علاوہ گھر کے کام بھی تھے' اور خود سہیل بھائی کی طرف سے بھی کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو اسے چونکنے پر مجبور کرتی' اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ اس سے بات ہی نہیں کرتے تھے' اس سے گفتگو کرتے وقت ان کا انداز بالکل ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ثروت آپا یا فرحت سے باتیں کرتے وقت ہوتا تھا' لیکن پھر ایک دم جانے انہیں کیا ہوا کہ ان کی نگاہوں کے انداز بدل گئے- کچھ وقت اور گزرا تو ثمرین کو اچھی طرح احساس ہو گیا کہ سہیل بھائی اسے کسی اور ہی نظر سے دیکھنے لگے ہیں' ان کی نگاہیں ثمرین کو ایک خاموش پیغام دینے لگیں- جب تک ان کے دلّ کے جذبات نے الفاظ کا سہارا نہ لیا ثمرین پرسکون رہی- لیکن بات جب نظروں سے زبان پر آئی تو اس کا ذہن الجھن میں پڑ گیا-

جب تک سہیل بھائی اشاروں کنایوں میں بات کرتے رہے وہ خاموش رہی مگر آج جب انہوں نے صاف صاف اپنا مدعا بیان کر دیا تو اس نے چند جملوں میں بات ختم کر دی-

یوں زبان سے کچھ کہہ دینا بہت آسان ہے- ثمرین نے بھی بڑی آسانی سے سہیل بھائی کو اپنا فیصلہ سنا دیا لیکن اس کے بعد سے اس کے خیالات منتشر ہو کر رہ گئے تھے' سوچیں بکھر کر رہ گئی تھیں-

بے شمار لمحے اس نے چپ چاپ بیٹھ کر سوچتے ہوئے گزار دیئے‘ جب اپنے سوچتے ذہن کے ہاتھوں بالکل پریشان ہوگئی تو تنگ آ کر اس نے اونچی آواز سے ٹرانسسٹر کھول دیا- ثروت آپا نے کمرے میں آ کر اسے ٹوکا تو وہ ٹرانسسٹر بند کر کے کھڑکی میں کھڑی ہوگئی اور جھک کر باہر دیکھنے لگی-

اتنا خوبصورت دن‘ اس قدر حسین موسم کس طرح گزر گیا-

اس نے دل ہی دل میں کہا اور اس سے پہلے کہ اس کی سوچیں اسے پھر پریشان کرتیں‘ وہ شیدی کا مفلر رفو کرنے بیٹھ گئی- مگر سوچوں نے پھر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا‘ ہاتھ اپنے کام میں مصروف رہے اور ذہن اپنے کام میں مشغول رہا-

شیدی کا مفلر رفو کر کے وہ اس کے کمرے کی طرف چل دی جب سے سہیل بھائی آئے تھے‘ یہ شیدی اور سہیل بھائی کا مشترکہ کمرہ بن گیا تھا-

’’یہ لو اپنا مفلر-‘‘

ثمرین نے مفلر شیدی کے سامنے پلنگ پر ڈالتے ہوئے کہا-

’’اچھا جناب‘ نوازش‘ یہ ٹھیک ہوگیا؟‘‘

’’ہاں!‘‘

’’پکا کام ہوا ہے نا؟‘‘

شیدی نے مفلر کی تہہ کھول کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا-

’’پکا یا کچا تو مجھے معلوم نہیں بس رفو کر دیا ہے-‘‘

’’بس اب ذرا تکلیف کر کے ایک جوڑی جرابیں بھی لیتی جائیں-‘‘

’’کیوں‘ جرابوں کو کیا ہوگیا؟‘‘

’’انہیں بھی دو ایک جگہ سے کیڑوں نے کھا لیا ہے-‘‘

شیدی نے الماری میں سے جرابیں نکالتے ہوئے کہا-

’’آخر کہاں پھینک دیتے ہو اپنی ساری چیزیں جو کیڑوں کی نذر ہو جاتی ہیں؟‘‘ ثمرین کو غصہ آ گیا-

’’الماری میں ہی پھینکتا ہوں اور کہاں پھینکوں؟‘‘ شیدی نے بڑے اطمینان سے کہا اور جرابیں ثمرین کی طرف بڑھا دیں-

’’اتنی توفیق نہیں ہوتی تمہیں کہ کبھی فینائل کی گولیاں ہی لا کر ڈال دیا کرو گرم کپڑوں میں؟‘‘ ثمرین نے کہا-

’’پہلے تو میں لے آیا کرتا تھا گولیاں‘ اس دفعہ سہیل بھائی کے آسرے پہ بیٹھا رہ گیا تو سارا کام بگڑ گیا-‘‘

شیدی نے شریر نگاہوں سے سہیل بھائی کی طرف دیکھا جو کرسی پر نیم دراز ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے- شیدی کی اس بات پر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی-

’’تم فینائل کی گولیاں بھی نہیں خرید سکتے- آخر کون سی ہزار پانچ سو روپے کی آتی ہیں-‘‘ ثمرین نے درشت لہجے میں کہا-

’’میں بے چارہ ایک مفلس طالب علم ہوں- میرے لیے دو چار روپے خرچ کرنا بھی بڑی بات ہے‘ یہ ٹھہرے کماؤ پوت یہ تو ان کا فرض ہے-‘‘ شیدی نے مسکین صورت بنا کر کہا-

سہیل بھائی مسکرا کر بولے- ’’ایک سال کی بات ہے میاں تم بھی کماؤ پوت بن جاؤ گے-‘‘

’’ایک سال تو تعلیم ختم ہونے میں ہے- اس کے بعد نہ جانے کتنے جوڑی جوتے گھسنے پڑیں گے- تب کہیں جا کے نوکری ملے گی-‘‘ شیدی نے کہا-

’’کیوں بنتے ہو یار‘ تمہاری نوکری تو رکھی ہوئی ہے ڈپارٹمنٹ میں-‘‘ سہیل بھائی نے کہا-

’’کیوں شرمندہ کرتے ہیں سہیل بھائی!‘‘ شیدی نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہا-

ثمرین نے کہا- ’’ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں سہیل بھائی-‘‘

’’اچھا- آپ بھی ان کی ہم خیال ہیں؟‘‘ شیدی ہنس کر بولا-

’’ویسے بات ہے تعجب کی‘ اس ایک سال کے عرصے میں یہ پہلا موقع ہے کہ آپ نے سہیل بھائی کی حمایت کی-‘‘

’’ارے میرے بھائی اتنا بھی غنیمت سمجھو-‘‘

سہیل بھائی نے کن انکھیوں سے ثمرین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا-

’’تم لوگوں کو تو بس فضول باتیں کرنی آتی ہیں-‘‘ ثمرین جھلا کر بولی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی-

’’جا کہاں رہی ہیں- ایک بات تو سن لیجئے-‘‘ شیدی چھلانگ لگا کر دروازے میں آ کھڑا ہوا-

’’کیا ہے‘ جلدی بکو؟‘‘ ثمرین نے کہا-

’’عرض یہ ہے حضور کہ پچھلے سال جو جرسی مابدولت کے لئے بنائی گئی تھی اس میں بھی کیڑوں نے کچھ کارستانی کی ہے-‘‘

شیدی نے انتہائی عاجزی سے کہا-

’’تم تو دو دن کے بچے بنے ہوئے ہو شیدی- آخر تم اپنی چیزیں سنبھال کر کیوں نہیں رکھتے؟‘‘

ثمرین کو اس دفعہ سچ مچ غصہ آ گیا۔

''اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ عورتوں کا شعبہ مردوں کے کیوں سپرد کیا گیا ہے؟'' سہیل بھائی نے کہا۔

''جی' کیا مطلب۔ کون سا شعبہ؟'' ثمرین چونکی۔

''ہمارے گھر میں تو یہ سارے کام امی کرتی ہیں' یا پھر روحی اور یاسمین کرتی ہیں۔'' سہیل بھائی نے کہا۔

''کون سے کام؟'' ثمرین ایک دم چڑ گئی۔

''میرا مطلب ہے کپڑوں کو دھوپ میں ڈالنا' ان میں فینائل کی گولیاں رکھنا' بٹن ٹانکنا' رفو کرنا وغیرہ وغیرہ۔'' سہیل بھائی نے کہا۔

''یہاں بھی سب کام ہم ہی لوگ کرتے ہیں۔'' ثمرین نے جواب دیا۔

''تو پھر اس غریب کے ساتھ یہ سلوک کیوں ہے؟'' سہیل بھائی نے کہا۔

''آپ کو کچھ پتہ وتہ ہے نہیں۔ خواہ مخواہ ہی بیچ میں بولے جا رہے ہیں۔'' ثمرین نے ناگواری سے کہا۔

''مجھے کیا نہیں پتہ ہے؟''

''یہ نالائق اپنی چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتا ہے۔ میری الماری کو ہاتھ نہ لگانا' میرے صندوق کو نہ چھیڑو' میری کتابیں نہ چھوؤ۔ اماں تک کو اجازت نہیں ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر اس کی کسی چیز کو ہاتھ لگائیں تو پھر یہاں بھی کس کو غرض پڑی ہے؟'' ثمرین نے کہا۔

''سب بے بنیاد باتیں ہیں' مجھ سے تو آج تک اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔'' سہیل بھائی نے کہا۔

''ہاں' سب جھوٹے ہیں' بس آپ دونوں ہی سچے ہیں۔'' ثمرین جھنجھلا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

برآمدے کی ریلنگ کے قریب رک کر اس نے سوچا۔ معلوم نہیں آج صبح اٹھ کر کس کا منہ دیکھا تھا۔ سارا دن بوریت میں گزر گیا۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا اور بوندوں سے اس کا سارا چہرہ بھیگ گیا۔ وہ پیچھے ہٹ کر ڈرائنگ روم کی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی' اور بھاگتے ہوئے بادلوں کو دیکھنے لگی اور بڑی عجیب سی سوچوں میں کھو گئی۔ کئی لمحے چپ چاپ بنا آہٹ کے گزر گئے' پھر قدموں کی آہٹ پر وہ چونکی' اس نے سر گھما کر دیکھا۔ سہیل بھائی اس کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔

''میری ایک بات کا جواب دو ثمرین؟''

ان کے لہجے میں خاصا رعب تھا۔

''جی پوچھئے' لیکن یہ آپ اس قدر رعب کیوں جما رہے ہیں؟'' ثمرین نے کہا۔

''تم نے جو فیصلہ سنایا ہے' کیا وہ آخری اور قطعی ہے؟''

سہیل بھائی نے جانے کس آس کا سہارا لے کر پوچھا۔

''جی ہاں!'' ثمرین نے بڑی بے باکی سے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

''دیکھو بھئی ثمرین بیگم' مجھ میں قوت برداشت بہت زیادہ ہے' مجھے تمہارا فیصلہ سن کر دکھ ضرور پہنچا ہے۔ لیکن تمہارے بغیر میں مر نہیں جاؤں گا مگر....'' وہ ایک لمحے کے لئے رکے۔

''یہ سوچ لو کہ کہیں تمہیں زندگی کے کسی موڑ پر اپنے اس فیصلے پر پچھتاوا نہ ہو؟''

''مجھے یقین ہے۔ میری زندگی میں ایسا لمحہ کبھی نہیں آئے گا؟'' ثمرین نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

''اچھا۔ کیا واقعی؟'' سہیل نے طنزیہ انداز سے کہا۔

''جی ہاں۔ اپنی آئندہ زندگی کے لیے میرے ذہن میں جو تصور ہے وہ بکھر کر رہ جائے گا۔ اگر میں نے آپ کو یا آپ جیسے کسی شخص کو اپنا شریک زندگی بنا لیا۔'' ثمرین نے کہا۔

''بہت خوب!'' سہیل طنز سے مسکرائے۔

ثمرین خاموش رہی۔

''اگر کوئی حرج نہ ہو تو مجھے بھی اس تصور سے آگاہ کر دو۔''

''اگر اس سے آپ کو کوئی فائدہ پہنچنے کی امید ہوتی تو میں ضرور بتا دیتی۔'' ثمرین نے کہا اور سہیل بھائی کو وہیں چھوڑ کر اندر چلی گئی۔

جہاں کچھ دیر پہلے ثمرین سوچوں میں ڈوبی کھڑی تھی وہیں اب سہیل بھائی کھڑے رہ گئے۔ تنہا۔ کھوئے کھوئے سے۔ الجھے الجھے سے۔

اور جب رات آئی تو ثمرین کی سوچوں کے دریچے ایک بار پھر کھل گئے۔ باری باری سب سو گئے تو اس نے بھی اپنی کتاب ہاتھ بڑھا کر میز پر رکھ دی۔ ثروت آپا اور فرحت پر ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہوئے اس نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔ پل' ساعت' لمحے گزرتے گئے۔ لیکن اس کی بے خواب آنکھیں نیند کا انتظار کرتی رہیں۔ وہ اٹھ کر کھڑکی کے قریب کھڑی ہو گئی۔ بھیگی ہوئی سرد ہوا کا جھونکا آیا اور اس کا سارا وجود کانپ کر رہ گیا۔ ابھی تو موسم سرما کی ابتدا تھی۔ لیکن آج کا دن روزانہ کی نسبت کچھ زیادہ ہی سرد تھا۔ صبح جس وقت سے بادل چھائے تھے۔ ہوائیں ایک دم ہی خشک ہو گئی تھیں۔ اس نے کرسی کی پشت پر پڑی ہوئی ثروت آپا کی شال اٹھا کر لپیٹ لی

اورآہستہ سے دروازہ کھول کر برآمدے میں نکل آئی- برآمدے کی ریلنگ پر دونوں کہنیاں ٹیک کر وہ باہر کی طرف جھک گئی-

سرد اور تاریک رات باہیں پھیلائے خاموش کھڑی تھی- آسمان پر کہیں کوئی ستارہ نہیں تھا- گہرے کالے بادل ادھر سے ادھر ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے پھر رہے تھے- رات کے کسی بھی حصے میں چھاجوں مینہ برسنے کے آثار تھے- گیٹ کے سامنے والی سڑک بالکل سنسان تھی- سڑک کے دونوں طرف جلتے ہوئے بلبوں کی روشنی بھیگی ہوئی سیاہ چمکدار سڑک پر دور دور تک پھیلی ہوئی تھی- کہیں کوئی آواز نہیں تھی- سوائے مینڈکوں کی ٹراہٹ کے' برآمدے کی سیڑھیوں کی داہنی طرف والے سفید کھمبے سے لپٹی ہوئی چنبیلی کی بیل میں بڑی مدھم سی سرسراہٹ تھی- صدا بہار کے پودے پھولوں کے بوجھ تلے جھکے جارہے تھے اور چمپا کی پھیلی ہوئی شاخیں کیلے کے جھالردار پتوں سے الجھی ہوئی تھیں-

اوائل سرما کی اس بھیگی ہوئی رات کے سائبان تلے چپ چاپ کھڑی ہوئی ثمرین نے بیتے ہوئے لمحوں کے اداس پھول چنتے ہوئے سوچا-

جو وقت گزر گیا' سو گزر گیا- اچھا یا برا- لیکن اب جو وقت آئے گا میں اس کے ایک ایک لمحے کو اس طرح بسر کروں گی جس کے میں خواب دیکھتی ہوں-

میں سہیل بھائی کو یہ بات سمجھانے کو تو سمجھا دیتی کہ میرے ذہن میں آئندہ زندگی کا کیا تصور ہے- لیکن اس سمجھانے بجھانے کا بھلا فائدہ ہی کیا ہوتا جب کہ وہ اس پر یقین ہی نہ کرتے-

لیکن اس میں ان بے چاروں کا کوئی قصور نہیں- انہیں کیا معلوم کہ ہمارے گھر کی اس چھوٹی سی دنیا نے مجھے کن تجربات سے آشنا کیا ہے- وہ کیا جانیں کہ ہمارے گھریلو ماحول نے میرے ذہن میں کیسی سوچوں کو جنم دیا ہے- آج اگر وہ ہمارے گھر کے حالات بہتر دیکھتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہمیشہ سے اسی طرح رہتے آئے ہیں- میں نے محبت کو جس انداز سے' نفرت اور ''بیزاری'' کا روپ بدلتے دیکھا ہے- اس کے بعد تو اس جذبے کے لئے میرا اعتماد متزلزل ہو گیا ہے- کبھی کبھی تو مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ محبت کچھ نہیں' صرف نفرت اور بیزاری کا دوسرا نام ہے- دنیا میں ہر جذبہ اور احساس بس اس ایک چیز کے دم سے ہے' جسے ''زر'' کہتے ہیں- دل کا چین' ذہن کا آرام اور دماغ کا سکون' سب کچھ دولت کے دم سے ہے- محبت اسی وقت تک زندہ رہتی ہے جب تک زندگی میں سکون ہے اور سکون شاید دولت کے بغیر نہیں ملتا-

اگر میری سوچوں کا انداز غلط ہے تو پھر امی اور ابا میاں کی محبت' نفرت اور بیزاری کا لبادہ کیوں اوڑھے ہوئے ہے ممکن ہے لفظ نفرت استعمال کر کے میں نے ان لوگوں کے ساتھ زیادتی کی ہو

لیکن بیزاری تو یقیناً صحیح لفظ ہے- میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا ہے' لفظ محبت کو مجروح ہوتے دیکھا ہے- دوسروں سے سنا کہ امی اور ابا میاں کی شادی محبت کی شادی ہے- ابا میاں نے امی کی خاطر سارے خاندان سے ٹکر لی تھی- نتیجے کے طور پر خاندان والوں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا- جب سے ابا میاں خاندان والوں سے الگ تھلگ زندگی گزار رہے تھے- شادی کے بعد چند سال بڑی ہنسی خوشی ایک خواب کی مانند گزر گئے- لیکن جیسے جیسے گھریلو ذمہ داریوں اور اخراجات میں اضافہ ہوا' محبت اور چاہت سب ایک ڈھکوسلہ معلوم ہونے لگی- ابا میاں کی قلیل آمدنی تیزی سے بڑھتے ہوئے اخراجات کی متحمل نہ ہو سکی- دونوں کی خوش مزاجی' بدمزاجی میں بدل گئی- شگفتگی کی جگہ چڑچڑے پن نے لے لی- آئے دن دونوں کے درمیان بدمزگی ہونے لگی- ان کی باہمی رنجشوں نے یہ رنگ دکھایا کہ ان کی محبت نے بیزاری کا روپ دھار لیا- گھر کا ماحول بالکل گھٹ کر رہ گیا-

کئی برس سرکاری کوارٹر میں رہتے بستے گزر گئے- گھر کے اتنے سارے افراد دو کمروں اور ایک کوٹھڑی پر مشتمل چھوٹا سا کوارٹر' بیرونی برآمدے میں ایک خیمہ لگا کر ایک اور کمرہ سا بنا لیا گیا تھا- اسی گھر کے گھٹے گھٹے سے ماحول میں ان ساتوں بہن بھائیوں نے اپنا بچپن اور لڑکپن گزارا- ماہین آپا اور ثروت آپا نے تو لڑکپن کی حدود کو بھی اسی گھر میں پھلانگا- پھر خدا خدا کر کے ان کا ذاتی گھر بنا تو ابا میاں کا بال بال قرضے میں بندھ گیا- لیکن پھر بھی ان سب نے سکھ کا سانس لیا کہ سر چھپانے کے لئے اپنا ٹھکانہ تو ہے-

ماہین آپا کی شادی کے بعد امی اور ابا میاں نے اپنے آپ کو قدرے ہلکا پھلکا محسوس کیا- دوسری طرف ثروت آپا نے بھی انٹر کے بعد پڑھائی بھی جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک اسکول میں سروس کر لی' اب تو وہ کالج میں لیکچرر ہیں- اس کے بعد سے گھر کے حالات قدرے بہتر ہوئے ہیں- لیکن امی اور ابا میاں کی بیزاری بدستور ہے-

دوسری طرف ماہین آپا نے بھی اسی قسم کی مثال پیش کی ہے- ماموں جان کے بیٹے عثمان بھائی انہیں اس وقت سے پسند کرتے تھے جب سے انہوں نے ہوش سنبھالا تھا- لیکن ادھر ایک سال سے میں محسوس کر رہی ہوں کہ ماہین آپا کے مزاج میں بیزاری اور چڑچڑا پن پیدا ہو گیا ہے- وہ جب آتی ہیں اخراجات کی زیادتی اور پیسوں کی کمی کا رونا روتی ہیں- بچوں کو بغیر کسی وجہ کے جھڑک دیتی ہیں- بعض اوقات تو انہیں بری طرح پیٹ کر رکھ دیتی ہیں-

ان حالات میں اگر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شادی کروں گی تو کسی دولت مند آدمی سے ورنہ ساری زندگی یونہی گزار دوں گی تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں-

ثمرین نے برآمدے کی ریلنگ پر جھکے جھکے یہ ساری باتیں سوچ ڈالیں- ایک لمحے کے لئے اس

کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں زندگی کے کسی لمحے میں مجھے اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے‘ سہیل بھائی کی بات سچ ہی ثابت نہ ہو-

لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر دل ہی دل میں کہا-

اپنے خوابوں کی تعبیر کی خاطر زندگی کو داؤ پر تو لگانا ہی پڑے گا-

اس کی نگاہوں میں سہیل بھائی کا خوبصورت سراپا ابھرا-

”یہ سچ ہے سہیل بھائی کہ آپ میں کسی چیز کی کمی نہیں‘ لیکن میں اپنی سوچوں کے سامنے کیسے ہار مان لوں؟ اپنے تصورات کے سامنے کیسے شکست قبول کر لوں-“ ثمرین نے ایک دبی ہوئی سانس لے کر زیر لب کہا اور تھکے تھکے قدموں سے اندر آ گئی-

پھر بہت سارے دن گزر گئے- بڑی تیزی سے‘ بڑی سرعت سے‘ ثمرین ایم-اے فائنل کا امتحان دینے کے بعد بالکل فرصت سے تھی مگر کام کرنے کے بعد بھی اس کے پاس اتنا وقت ہوتا تھا کہ اس کے پاس اس وقت کا کوئی مصرف نہیں تھا- گرمیوں کی طویل‘ سنسان اور ویران دوپہر کاٹنا اس کے لئے سخت دشوار مسئلہ تھا- دوپہر کو اسے سونے کی عادت نہیں تھی- ثروت آپا کے لئے جہیز کی کچھ چیزیں سینے کاڑھنے کے لئے پڑی تھیں- وہ انہیں ہی نکال کر بیٹھ جاتی‘ لیکن سلائی کڑھائی میں بھی زیادہ دیر اس کا دل نہیں لگتا تھا- گھر میں کتابوں اور رسالوں کا بھی ذخیرہ نہیں تھا کہ انہی کو پڑھ کر وقت گزاری کرتی- چند عدد پرانے رسالے تھے جنہیں بار بار پڑھنے کو اس کا دل بھی نہیں چاہتا تھا- ویسے وہ ان لڑکیوں میں تھی بھی نہیں جنہیں کتابیں پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک ہوتا ہے- وہ تو ان لڑکیوں میں سے تھی جو اپنے شعور کی پہلی منزل سے آخری منزل تک کی سیڑھیاں سوچوں میں گم رہ کر چڑھتی ہیں‘ جن کی آنکھیں جاگتے لمحوں میں بھی خواب دیکھتی ہیں- جن کے سینے میں آسمان کی وسعتوں پر اڑنے والے بادلوں کو چھو لینے کی خواہش ایک شدید آرزو کی صورت میں جنم لے کر پرورش پاتی رہتی ہے-

ثمرین بھی سوچتی تھی- اور بے تحاشا سوچتی تھی- بڑی عجیب باتیں‘ بے حد انوکھی باتیں- اس کی سوچوں کی راہ گزر کبھی‘ کسی وقت بھی سونی نہیں رہتی تھی- جب کسی کام میں بھی دل نہ لگتا تو وہ کمرے کی کھڑکی میں جھکی‘ باہر کی طرف دیکھتے ہوئے سوچے جاتی- دھوپ کی شدت سے تپتی ہوئی سیاہ چمکدار سڑک‘ جھلستے ہوئے پتوں‘ سوکھی ہوئی گھاس اور ریت کے اڑتے ہوئے بگولوں کو تکے جاتی- یوں لمحات ایک ایک کر کے گزرتے رہتے‘ پیچھے سرکتے رہتے اور دھندلکوں میں گم ہوتے رہتے-

نہ کوئی سیر تھی‘ نہ تفریح زندگی بے حد سپاٹ تھی- بیکار دن تھے اور بے کار راتیں- ددھیال کے دو

چار رشتے دار اس شہر میں تھے ان سے ملنا جلنا تھا ہی نہیں- ننھیال میں بھی شادی بیاہ کی کوئی تقریب تھی ہی نہیں جو وہیں کے ہنگاموں میں کچھ وقت گزرتا- بوریت کے انداز میں گزرتے ہوئے دنوں میں بعض اوقات ثمرین کا دل مرجانے کو چاہتا-

ایسے میں ایک شام آفس سے واپسی پر ابا میاں کے ہاتھ میں بڑے سائز کا سفید لفافہ دیکھ کر ثمرین قدرے چونکی-

اس قسم کے لفافوں میں عموماً تقریبات کے کارڈ ہی ہوتے ہیں- ثمرین نے سوچا-

ہوسکتا ہے ابا میاں کے کسی دوست کے گھر شادی کی تقریب ہو‘ اگر ایسی بات ہے تو اس میں میرے لئے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں- انہوں نے ابا میاں کو مدعو کیا ہوگا‘ ساری فیملی کو تو نہیں مدعو کیا ہوگا-

اس نے بجھے ہوئے دل سے سوچا-

جب ابا میاں نے کارڈ میز پر ڈالا تو اس پر ”مع اہل و عیال“ کی عبارت دیکھ کر جانے کیوں وہ کچھ زیادہ ہی خوش ہوئی اور پھر ایک دم ہی وہ اپنی اس بچکانہ حرکت پر خفیف سی ہوگئی- جب ابا میاں کپڑے تبدیل کر کے باہر برآمدے میں بیٹھے اور وہ ان کے لئے چائے بنا کر لائی تو پوچھے بغیر نہ رہ سکی-

”کس کی شادی کا کارڈ ہے ابا میاں؟“

”بیٹے.....وہ ہماری فرم کے مالک ہیں نا ستار صاحب‘ ان کی بیٹی کی شادی ہے-“

ابا میاں نے کہا-

”اچھا.....آپ کو بھی بلایا ہے انہوں نے؟“

ثمرین نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا-

”ہاں- وہ بڑے آدمی ضرور ہیں لیکن مغرور بالکل نہیں‘ اپنے ماتحتوں کے ساتھ ان کا سلوک بہت اچھا ہے-“

ابا میاں نے گرم گرم چائے کا گھونٹ لے کر کہا-

”آپ جائیں گے؟“

”ہاں بھئی- ضرور جائیں گے-“

”صرف آپ جائیں گے؟“ ثمرین نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد ابا میاں سے پوچھا-

ابا میاں نے اس کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکے ہوں-

”میرا مطلب ہے ابا میاں کہ دعوت تو سب کے لئے ہے-“ ثمرین نے کہا-

"تم چلنا چاہتی ہو؟" ابا میاں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ اور کیا؟" ثمرین نے جھٹ سے کہا۔

"ضرور چلو!"

ابا میاں ایک دم ہنس پڑے۔

"بلکہ اور جس جس کو چلنا ہے چلے۔"

"ثروت آپا اور امی کو بھی چلنا چاہئے۔" ثمرین نے کہا۔

"تمہاری امی شاید ہی چلیں۔"

ابا میاں کی آواز قدرے مدھم ہوگئی۔

"امی ضرور چلیں گی' میں ان کو راضی کروں گی۔" ثمرین نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اور امی دو ایک دفعہ انکار کرنے کے بعد رضا مند ہوگئیں۔ ثروت آپا کو تو ان کی بات ماننے میں کوئی اعتراض ہی نہیں تھا۔ فرحت نے البتہ انکار کر دیا۔ اسی روز اس کی ایک سہیلی کی بڑی بہن کی شادی ہونے والی تھی۔

جس روز شادی میں شرکت کرنی تھی' ثمرین کا سارا دن مصروفیت میں گزرا۔ صبح سے دوپہر تک وہ باورچی خانے میں مشغول رہی۔ کھانے سے فراغت ملی تو وہ بڑے آرام اور اطمینان سے امی' ابا میاں' ثروت آپا کے کپڑوں پر استری کرتی رہی۔ امی اور ثروت آپا کے لئے بھی کپڑوں کا انتخاب اس نے خود کیا۔ شام کی چائے کے بعد وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ یہ اس کی خاص عادت تھی' کہیں جانا ہوتا تھا تو وہ اپنی تیاری پر بہت وقت صرف کرتی تھی اور ایسے مواقع پر شیدی سے اس کی جھڑپ ضرور ہوتی تھی۔ وہ اس کے آرام آرام سے تیار ہونے پر بری طرح چڑ جاتا تھا اور ثروت آپا' ماہین آپا کی مثال دیتا تھا جو ذرا سی دیر میں جھٹ پٹ تیار ہو جاتی تھیں۔ ویسے بھی شیدی کا خیال یہ تھا کہ ثمرین کو اپنی تیاری میں قطعی اہتمام نہیں کرنا چاہئے۔ اس کا حسن نہ تو خوبصورت کپڑوں کا محتاج ہے نہ کسی قسم کے میک اپ کا۔ شیدی کا یہ خیال غلط بھی نہیں تھا۔ صورت شکل تو خیر ان سب بہن بھائیوں کی اچھی تھی لیکن ثمرین کو حسن عطا کرنے میں اللہ میاں نے بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔

اکثر اوقات شیدی موڈ میں آکر کہتا۔

"ایمان سے ثمرین آپا' آپ اتنی خوبصورت ہیں کہ مجھے تو لوگوں سے یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں آپ کا بھائی ہوں۔ جیدی البتہ آپ کا بھائی لگتا ہے۔"

ثمرین کی طرح جیدی کی رنگت بھی بے حد گلابی تھی اور نقوش بھی خوبصورت تھے۔

آئینے میں آخری بار اپنا جائزہ لے کر وہ مڑی ہی تھی کہ شیدی اندر آگیا۔ شرارت آمیز نگاہوں سے ثمرین کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے زبردستی کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولا۔

"افوہ۔ ثمرین آپا۔ آج تو مجھے کسی کی خیریت نہیں معلوم ہوتی۔"

"کس کی خیریت؟"

ثروت آپا مسکرائیں۔

"کسی مخصوص آدمی کا ذکر تھوڑی کر رہا ہوں' جتنے بھی آدمی شادی میں شرکت کے لئے آئے ہوں گے سب کی بات کر رہا ہوں۔"

"تمہارا اس وقت یہاں نازل ہونا ضروری تھا۔"

"میں بھی کوئی شیطان ہوں جو آپ میرے لئے لفظ "نازل" استعمال کر رہی تھیں؟"

"تم تو شیطان کے بھی باپ ہو۔"

ثمرین ہنس پڑی۔

"خوب۔ یعنی کسی نہ کسی بہانے سے آپ مجھے یا میری اولاد کو برا ضرور کہیں گی۔" شیدی نے کہا۔

"یہ تمہاری اولاد کہاں سے ٹپک پڑی؟" ثمرین نے کہا۔

"ابھی نہ سہی' لیکن اللہ بڑا کارساز ہے۔ کبھی نہ کبھی تو ٹپکے گی۔" شیدی نے سنجیدگی سے کہا۔

"بڑا ارمان ہے۔" ثروت آپا کو اس کی بات پر ہنسی آگئی۔

"ارے ثروت آپا؟"

شیدی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"خیریت' ٹھنڈی سانس کیوں لے رہے ہو؟" ثمرین مسکرائی۔

"آپ کیا جانیں، اس پڑھائی نے مجھے بے موت مار دیا، ورنہ آج میں بھی کم از کم آدھا درجن بچوں کا باپ ہوتا۔"

شیدی نے سنجیدہ بننے کی انتہائی کوشش کی لیکن شرارت آمیز مسکراہٹ اس کی آنکھوں سے ناچ رہی تھی۔

"اچھا بس' زیادہ ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں، جلدی سے ایک گلاس پانی پلاؤ مجھے۔"

ثروت آپا نے رعب جھاڑا۔

"پانی آپ خود پی لیجئے، میں ذرا مصروف ہوں۔"

شیدی نے پھر سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ لیا۔

"کیوں، کیا مصروفیت ہے تمہیں اس وقت؟"

"مجھے ثمرین آپا کی تعریف کرنی ہے۔"

"احمقانہ باتیں مت کرو، جاؤ جلدی سے میرے لئے بھی پانی لاؤ۔" ثمرین بولی۔

"ابھی لاتا ہوں لیکن یہ جملہ عرض کرنے کی اجازت مجھے ضرور دیجئے کہ اپنی نظر اتروا کر جایئے گا۔" شیدی نے کہا۔

"بکواس تو تم اجازت لینے سے پہلے ہی کر گئے۔"

ثمرین جھینپ کر بولی۔

"کمال ہے صاحب، یعنی بندہ یہاں عرض کرتا ہے، درخواست کرتا ہے اور پبلک اسے بکواس قرار دیتی ہے۔"

شیدی نے مسکین صورت بنا کر کہا۔

"خدا کا واسطہ شیدی تم یہاں سے جاؤ۔"

ثمرین نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

"چلا جاتا ہوں، ذرا ثروت آپا سے ایک بات کی تائید تو کروالوں۔" شیدی نے کہا۔

ثمرین چپ چاپ اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"ایمانداری سے کہئے ثروت آپا، میں نے جو کچھ ان محترمہ کے بارے میں کہا۔ غلط تو نہیں ہے۔"

"نہیں، اس میں تو کوئی شک نہیں۔"

ثروت آپا نے تعریفی نگاہوں سے ثمرین کی طرف دیکھا۔

"آپ سب لوگ ایک طرف ہو کر مجھے خوب بیوقوف بناتے ہیں۔"

ثمرین جھینپ کر کمرے سے نکل گئی امی کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سہیل بھائی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ انہوں نے ایک لمحے کے لئے ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی نظروں سے محبت، چاہت پسندیدگی کے جذبات کا اظہار کئے بغیر آگے بڑھ گئے اپنے کمرے کے دریچے میں جھکتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

"وہ میرے لئے نہیں، وہ میری نہیں، پھر مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اپنی نگاہوں سے اسے کوئی پیغام دوں؟

جب اس کے خیالات اسے کسی اور سمت لے جا رہے ہیں تو پھر راز غم کو عام کرنے کا کیا فائدہ؟"

انہوں نے دل سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو بڑی مشکل سے روکا اور میز پر سے میگزین اٹھا کر

زبردستی پڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔

ٹیکسی جب ستار صاحب کی کوٹھی کے نزدیک پہنچی تو طویل و عریض شامیانے، گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاروں اور خود ان کی کوٹھی کا طول و عرض دیکھ کر ثمرین کو ایک لمحے کے لئے احساس ہوا کہ شاید ان لوگوں نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ اب جب کہ غلطی ہو ہی چکی ہے تو کسی قسم کے کمزور احساسات کا مظاہرہ کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ وہ بے حد سنبھلے ہوئے انداز سے ٹیکسی سے اتری جب تک ابا میاں ٹیکسی کا کرایہ ادا کرتے رہے وہ اطمینان سے کھڑی اس ہنگامہ پرور ماحول کا جائزہ لیتی رہی اور پھر بڑی خود اعتمادی کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔

شامیانے کے اندر بے پناہ ہلچل تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زندگی کا سارا حسن، ساری خوبصورتی اور تمام خوشیاں اس ایک جگہ پر سمٹ آئی ہوں، مسکراہٹوں، قہقہوں، خوشبوؤں اور رنگ و نور کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا تھا۔ لیکن اتنی بڑی محفل، اتنے بڑے ہجوم میں ان لوگوں کا کوئی واقف، کوئی شناسا نہیں تھا۔ یہ امیر و کبیر لوگوں کی دنیا تھی بڑے بڑے رئیسوں کی ——— ۔ ان لوگوں کی جن کے دن اور رات اس فکر اور پریشانی میں گزرتے ہیں کہ اس بے پناہ مال و دولت کو کہاں اور کس طرح خرچ کریں؟

یہاں بڑے بڑے مل مالکان، تاجروں سرمایہ داروں کی بہو، بیٹیاں اور بیویاں شریک محفل تھیں۔ اپنے قیمتی جھلملاتے کپڑوں اور زیورات کی نمائش کے لئے۔

ثمرین نے سوچا۔

غنیمت ہے کہ ثروت آپا اور امی ساتھ ہیں، ورنہ اس ہنگامے میں جہاں نہ میں کسی کو جانتی ہوں اور نہ مجھے کوئی جانتا ہے، میں نہ صرف بور ہوتی بلکہ بے وقوف بھی نظر آتی ایک بات ثمرین نے خاص طور سے محسوس کی کہ آس پاس بیٹھی ہوئی اور کھڑی ہوئی خواتین اسے بار بار دیکھ رہی تھیں۔ ثروت آپا اور امی نے بھی محسوس کیا کہ ثمرین بے شمار نگاہوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

ثروت آپا نے سوچا۔

ثمرین آج، روزانہ کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہی خوبصورت نظر آ رہی ہے فیروزی رنگ کے غرارہ سوٹ، ہلکے ہلکے زیورات اور پھر میک اپ میں وہ سچ مچ قیامت ڈھانے کی حد تک حسین لگ رہی تھی اور امی...... وہ تو گھر میں جس وقت ثمرین تیار ہو کر ان کے سامنے آئی تھی، اس کے چہرے پر بے پناہ نکھار اور ایک انوکھا سا روپ دیکھ کر سہم سی گئی تھیں اس وقت جب انہوں نے کئی تحسین آمیز نگاہوں کو اس کی طرف اٹھتے دیکھا تو وہ بڑی گہری سوچوں میں ڈوب گئیں۔

اور ستار صاحب کی بیٹی کی شادی کا وہ ہنگامہ خیز دن ثمرین کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ کر

گیا، اسے ایک نئے موڑ پر لا کر چھوڑ گیا- زندگی کے ان آنے والے لمحات میں وہ کچھ ہو گیا جس کی اسے توقع بھی نہیں تھی- اس کے تو وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ شادی کے روز اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی وہ معمر خاتون جو اس سے باتیں کرتی رہی تھیں، سارا وقت ان لوگوں کے ساتھ ساتھ رہی تھیں- ایک دن اچانک ان کے چھوٹے سے گھر میں بغیر کسی خبر اور اطلاع کے آ جائیں گی-

ثروت آپا اور امی نے ثمرین میں ان خاتون کی غیر معمولی دلچسپی کو محسوس ضرور کیا تھا- لیکن پھر بھی وہ اپنے آپ کو کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ کر سکیں- اس روز کی مختصر سی ملاقات میں ہی انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں- معمر خاتون کی بے پناہ دولت وثروت کا اندازہ کرنے کے بعد ثروت آپا اور امی کے تو خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ وہ ثمرین کے لئے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئیں گی- ثروت آپا تو انہیں اپنے گھر کا ایڈریس بتاتے ہوئے بھی بہت ہچکچائی تھیں- ان لوگوں کو اس حقیقت پر ایک خواب کا سا گمان ہوا، ایک افسانے کا سا دھوکہ ہوا- ثمرین کی قسمت میں اتنے بڑے گھر کی بہو بننا لکھا تھا اسے وہ خواب نہ سمجھتیں تو کیا کرتیں؟ آسمان کا ملاپ زمین سے ہو رہا تھا، مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگ رہا تھا- بات حیران ہونے کی ہی تھی- مگر حیران ہونے سے وقت اور زمانے کی حقیقتیں تو نہیں بدلا کرتیں، ہونے والی بات ہو چکی تھی- لمحے لمحے کے دامن میں چھپی ہوئی کہانی حقیقت کا روپ دھار چکی تھی-

ثمرین نے بھی یہ سب کچھ دیکھا اور سنا- اور آسمان کی وسعتوں اور رفعتوں پر اڑتے ہوئے بادل اسے نیچے، زمین کی طرف آتے ہوئے محسوس ہوئے جنہیں وہ بڑی آسانی سے چھو سکتی تھی- اپنے خوابوں کی تعبیر اسے بغیر کسی تگ ودو کے مل رہی تھی- لیکن جب ابا میاں نے اس رشتے کو منظور کرنے سے انکار کر دیا تو ثمرین بڑی گہری سوچوں میں ڈوب گئی-

ابا میاں کا کہنا یہ تھا کہ رشتے ہمیشہ اپنی ہی جیسی حیثیت کے لوگوں میں کرنے چاہئیں، ورنہ لڑکی زندگی بھر کے لئے احساس کمتری کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے، کمزور بنیادوں پر رشتوں کی عمارت کے گر جانے کا خطرہ زندگی کے ہر لمحے میں ہوتا ہے- کسی بھی موڑ پر یہ عمارت خوفناک آواز کے ساتھ گر جاتی ہے اور اس کے گرنے کا تماشا سب دیکھتے ہیں-

امی کے نزدیک ابا میاں کے یہ نظریات بالکل فضول تھے وہ اس بات پر مصر تھیں کہ رشتہ ضرور قبول کر لیا جائے- نظریات کے اس تصادم کے نتیجے میں گھر کی فضا ناخوشگوار ہو گئی- امی اور ابا میاں کے تعلقات یوں بھی ناخوشگوار تھے- دونوں کے درمیان اس قدر کج بحثی ہوئی کہ ثمرین کو اپنے پاگل ہونے کے آثار نظر آنے لگے-

اور جب شجاع الدولہ کی والدہ ثمرین کے گھر کے پھیرے کر کر کے تھک جانے کے قریب تھیں تو ابا میاں نے جانے کیا سوچ کر امی کے سامنے ہار مان لی اور ایک شام ثمرین کی انگلی میں منگنی کی خوب صورت اور بیش قیمت انگوٹھی چمکنے لگی-

ابا میاں کے نزدیک یہ جوڑ کسی لحاظ سے بھی مناسب نہیں تھا نہ خاندانی حیثیت کے لحاظ سے، نہ دولت وثروت کے لحاظ سے اور نہ عمروں کے لحاظ سے- شجاع الدولہ کی عمر پینتیس، چالیس کے درمیان تھی اور ثمرین ابھی پورے بائیس سال کی بھی نہیں ہوئی تھی- یہ الگ بات تھی کہ شجاع الدولہ اپنی اصل عمر سے چھوٹے نظر آتے تھے- لیکن بہرحال عمروں کا تفاوت اپنی جگہ پر تھا- وہ اگرچہ حسین یا خوبصورت نہیں تھے، مگر ان کی وجاہت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا تھا-

گھر میں صرف شیدی ابا میاں کا ہم خیال تھا- جس روز اس کو یہ معلوم ہوا کہ ثمرین کو بھی یہ رشتہ منظور ہے، زندگی میں پہلی بار اسے ثمرین پر بے انتہا غصہ آیا- اس دن کے بعد سے اس کے اور ثمرین کے درمیان کوئی بات ہی نہیں ہوئی- ثمرین کو احساس بھی نہ ہو سکا کہ شیدی جان بوجھ کر اس سے کترا رہا ہے-

منگنی کے اگلے روز ثمرین برآمدے میں دھوپ میں کھڑی بال سکھا رہی تھی کہ شیدی گیٹ سے اندر داخل ہوا، سہیل بھائی بھی اس کے ہمراہ تھے- سہیل بھائی کچھ کہے بغیر، وہاں رکے بغیر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے، شیدی کی کوشش بھی یہی تھی لیکن ثمرین نے اسے آواز دے کر روک لیا-

''شیدی!''

''جی، فرمایئے؟''

شیدی کا لہجہ بیگانگی لئے ہوئے تھا-

''کہاں رہتے ہو تم، نظر ہی نہیں آتے؟'' ثمرین نے کہا-

''یہیں رہتا ہوں-'' شیدی کا انداز نہیں بدلا-

''چار پانچ دن سے میری اور تمہاری بات ہی نہیں ہوئی؟'' ثمرین نے کہا-

''شکر ہے آپ کو احساس تو ہوا-'' شیدی نے ریلنگ کا سہارا لے کر کہا-

''کیوں؟'' ثمرین چڑ گئی-

''ظاہر ہے بھئی، اب آپ بڑی آدمی ہو گئی ہیں-''

''بڑی آدمی ہو گئی ہوں-'' ثمرین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا-

''ہاں ظاہر ہے اتنے بڑے آدمی کے ساتھ منگنی ہوئی ہے تو......''

''شیدی......'' ثمرین نے خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

شیدی سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

''تم کس قسم کی گفتگو کر رہے ہو مجھ سے؟'' ثمرین نے درشت لہجے میں کہا۔

''کیا میں نے بہت بدتمیزی کی ہے؟'' شیدی نے سر اوپر اٹھا کر پوچھا۔

''اور۔تمہارا کیا خیال ہے؟'' ثمرین نے ناراضگی سے کہا۔

شیدی نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

''ہم بہن بھائیوں کے درمیان بہت بے تکلفی سہی لیکن، پھر بھی......'' ثمرین نے بات ادھوری چھوڑ کر شیدی کی طرف دیکھا۔

''ثمرین آپا۔شاید میں اپنے دل کی بھڑاس نکال رہا ہوں اس طرح گفتگو کر کے۔'' شیدی نے قدرے ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔

''کیسی بھڑاس؟

''اگر ایک شخص کو دوسرے شخص کی کسی بات، کسی عمل سے تکلیف پہنچے تو وہ اپنے جذبات کا اظہار کسی نہ کسی طرح تو کرے گا ہی۔''

''تمہارا مطلب ہے، میں نے اپنی کسی بات یا کسی عمل سے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے؟''

''ممکن ہے۔'' شیدی نے آہستہ سے کہا۔

''پہیلیاں بجھوانے کی ضرورت نہیں۔'' ثمرین نے کہا۔

''چھوڑیئے اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔''

''صاف بات کہہ دینے میں کیا حرج ہے؟''

''حرج تو کوئی نہیں لیکن سوچ لیجئے آپ اس تلخی کو برداشت بھی کر سکیں گی؟'' شیدی کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مسکراہٹ تھی۔

''تم کہہ کر تو دیکھو۔'' ثمرین نے قدرے آہستہ سے کہا۔

''تو سنیئے، آپ نے اس سرمایہ دار سے منگنی کر کے سخت غلطی کی ہے۔'' شیدی نے بے باکی سے کہا۔

ثمرین حیرت زدہ سی کھڑی اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ دولت کو خلوص پر ترجیح دیں گی۔'' شیدی نے کہا۔

''خلوص کس کا خلوص؟'' ثمرین نے مدھم آواز سے کہا۔

''اس قدر رانجھا بننے کی کوشش بھی نہ کیجئے۔''

''میں اپنے بارے میں دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر فیصلہ کر سکتی ہوں۔''

''اب تو میں صرف یہی دعا کر سکتا ہوں کہ آپ کو زندگی میں کبھی اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے۔'' شیدی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''تم شیدی......'' ثمرین کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

''جی ہاں، کہیے رک کیوں گئیں؟''

''تم اتنے بڑے کب سے ہو گئے جو اس قسم کے معاملات میں دخل اندازی کرنے لگے؟''

''عمر میں مجھ سے ایک سال بڑی ہو کر آپ نے کوئی تیر نہیں چلا دیا۔'' شیدی چڑ کر بولا۔''اور آپ کے ہر معاملے میں دخل اندازی کرنا میں اپنا حق سمجھتا ہوں۔''

''آخر کیوں؟'' ثمرین نے پوچھا۔

''ثمرین آپا، شاید آپ کو احساس نہیں کہ میں نے ہمیشہ آپ کے اور اپنے درمیان بہن بھائی کی بہ نسبت ایک دوست کے رشتے کو زیادہ محسوس کیا ہے۔'' شیدی نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے کہا۔

''اور اگر بچپن سے ہی ڈانٹ ڈپٹ کر یہ نہ کہا جاتا کہ ثمرین کو ''آپا'' کہو تو میں کبھی آپ کو آپا نہ کہتا۔''

شیدی لمحہ بہ لمحہ سنجیدہ ہوتا جا رہا تھا اور ثمرین کو اچھی طرح احساس تھا کہ شیدی جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل صحیح تھا۔وہ سر جھکائے بڑی گہری سوچوں میں ڈوب گئی۔

''بہر حال، میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ نے سہیل بھائی کے ساتھ سخت زیادتی کی ہے۔'' شیدی نے آہستہ سے کہا اور ثمرین کی طرف دیکھے بغیر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

منگنی کے بعد ثمرین کی شادی کی تیاریاں بڑی تیزی سے ہوئیں۔لہٰذا ایک شام کے ہنگامہ خیز ماحول میں وہ ثمرین شجاع بن گئی پھر اس نے زندگی کا ایک نیا روپ دیکھا، ایک انوکھا انداز دیکھا۔لمحوں کو ایک نئے انداز سے پیچھے سرکتے دیکھا اور وقت کو ایک خوبصورت انداز سے گزرتے دیکھا۔زندگی میں اتنا حسن اور اتنی دلکشی اسے اس سے پہلے کبھی نظر نہیں آئی تھی۔

وسیع و عریض کوٹھی، طویل لان، قیمتی فرنیچر، خوبصورت جھلملاتے لباس، بیش قیمت دمکتے زیورات اور یہ سب کچھ اس کا اپنا تھا یہ سوچ سوچ کر ہی اس کا دل مسرت کے ایک ناقابل بیان احساس سے چور چور ہو جاتا۔کبھی کبھی تو ثمرین کو یہ سب کچھ ایک خواب لگتا۔ایک دھوکہ ایک فریب معلوم ہوتا، ایک طلسم نظر آتا۔

اور...... یہ سچ تھا، یہ حقیقت تھی- اس کا احساس ثمرین کو کچھ عرصہ بعد ہوا- شجاع الدولہ کی چمکتی دمکتی دنیا خوشی اور مسرت کے صحیح مفہوم سے نا آشنا تھی، یہاں سب کچھ تھا لیکن وہ ایک چیز جسے ''سکون'' کہتے ہیں' ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا تھا- محبت تھی، خلوص بھی تھا- مگر ہر جذبے پر ثمرین کو ایک بناوٹ، ایک تصنع کا احساس ہوتا تھا-

کچھ وقت اور گزرا تو شجاع الدولہ اسے کارخانوں اور ملوں میں کام کرنے والی مشین سے زیادہ اور کچھ نظر نہ آسکے- ''بزنس ایگریمنٹ'' ''بزنس ٹرپ'' اور اسی قسم کے الفاظ سن سن کر ثمرین کے کان پک گئے- گھر میں شجاع الدولہ بہت کم وقت گزارتے تھے، آج یہاں جانا ہے تو کل وہاں- آج فلاں جگہ میٹنگ ہے تو کل فلاں جگہ پارٹی ہے- زندگی جیسے بذات خود ایک بزنس بن کر رہ گئی تھی-

لیکن اب جبکہ ثمرین اپنی عمر کے چند سال اس دنیا میں گزار چکی تھی تو یہ سارے احساسات بعد از وقت تھے، جو بے شمار لمحے بیت چکے تھے، وہ اب کبھی لوٹ کر نہیں آسکتے تھے- الجھے الجھے خیالات اور بکھری بکھری سوچیں ذہن میں بسائے وہ امی کے گھر جاتی تو دل اور بھی اداس ہو جاتا- ثروت آپا کی شادی ہو چکی تھی- شیدی اسکالرشپ پر امریکہ گیا ہوا تھا اور سہیل بھائی ٹرانسفر ہو کر دوسرے شہر جا چکے تھے- فرحت جیدی اور پرویز کی اپنی مصروفیتیں تھیں- ویسے بھی وہ ان سے کیا بات کرتی امی اور ابا میاں کے پاس جتنا وقت گزار سکتی تھی، گزار کر تھکے ہارے قدموں سے واپس آجاتی-

انہی دنوں اس نے فرحت سے سنا، سہیل بھائی کا ٹرانسفر پھر اسی شہر میں ہو گیا ہے لیکن اب وہ یہاں نہیں رہیں گے، خالو جان کے ریٹائر ہو جانے کی وجہ سے ان کی پوری فیملی اب یہیں آجائے گی ان حالات میں ان کے لئے الگ گھر لینا ضروری ہو گیا-

کئی دنوں بعد ایک روز ثمرین امی کے گھر گئی تو گیٹ کے باہر سفید رنگ کی لمبی سی گاڑی کھڑی تھی اور سہیل بھائی سمیت ان کے گھر کے بھی افراد گھر میں موجود تھے، روحی، یاسمین تو شادی ہو کر اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں- پروین اور باقی تینوں بھائی تھے جنہیں پہلے تو ثمرین پہچان ہی نہ سکی، کئی سالوں بعد دیکھا تھا- سہیل بھائی کو دیکھ کر ثمرین چونک گئی ان کا چہرہ اسے بڑا عجیب اور بڑا انوکھا سا لگا- سہیل بھائی اسے اتنے اچھے کبھی بھی نہیں لگے تھے- وہ ثمرین سے اس انداز سے ملے جیسے ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی بات کوئی رنجش اور کوئی بیزاری نہ ہوئی ہو- یہ سوچ کر ثمرین کے دل میں دکھ کی ایک لہر سی اٹھی کہ سہیل بھائی نے اب تک شادی نہیں کی- خالہ امی بڑے حسرت بھرے لہجے میں ان کے شادی نہ کرنے کا ذکر کر رہی تھیں اور پروین بہت خوش ہو کر فرحت کو بتا رہی تھی کہ سہیل بھائی کی ترقی ہو گئی ہے، یہ گاڑی انہیں بینک کی طرف سے ملی ہے، اب ہم جلد ہی سہیل

بھائی کی شادی کر دیں گے-

پھر ایسا ہوا کہ کبھی کبھار امی کے گھر اس کی سہیل بھائی سے ملاقات ہونے لگی- یہ ملاقاتیں عموماً بہت مختصر ہوا کرتی تھیں- لیکن بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ مختصر سے لمحات زندگی کو کسی نئے حادثے سے آشنا کر دیتے ہیں- ہر نئی ملاقات ثمرین کو ایک انجانے سے احساس سے قریب تر کرتی گئی اور اس کی زندگی کا رہا سہا سکون بھی اس کی طویل اور لامتناہی سوچوں کی نذر ہو گیا- قصور وار سہیل بھائی نہیں تھے، وہ خود تھی- ان کی نگاہیں تو اب بھولے سے بھی ثمرین کو کوئی پیغام نہیں دیتی تھیں ان کی زبان اب اپنے جوابات کے اظہار کے لئے الفاظ کے سہارے کی بھی محتاج نہیں رہی تھی- انہوں نے تو عرصہ ہوا اپنی ہر آرزو اور ہر احساس کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا- اب ان خفتہ احساسات اور جذبات کو پیدا کرنے کی نہ انہیں تمنا تھی اور نہ ہی وہ کسی گری ہوئی حرکت کے مرتکب ہو سکتے تھے- انہوں نے تو اس لمحے سے جب ثمرین نے شجاع الدولہ کے رشتے کے لئے ہامی بھری تھی، یہ سمجھ لیا تھا کہ اب کھیل ختم ہو گیا کہانی پوری ہو چکی اور افسانے کا انجام ہو چکا- اب ثمرین ان کے لئے ہے اور نہ وہ ثمرین کے لئے-

ثمرین کا دل اب کیا چاہتا تھا- یہ خود ثمرین کو بھی نہیں معلوم تھا- لیکن وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ زندگی کے پچھلے تمام لمحوں میں وہ کبھی بھی اتنی بے سکون، اس قدر بے چین اور اس طرح مضطرب نہیں ہوئی تھی اس کی سوچیں اس انداز سے کہیں نہیں بکھری تھیں-

اور عمر کے اس دوراہے پر کھڑی وہ سوچ رہی تھی کہ یہ وقت یہ حالات اب اسے زندگی کے کس موڑ پر لے جائیں گے اس کا ماضی بجھی ہوئی راکھ کے ڈھیر کے سوا اور کچھ نہ تھا- حال کے لمحات سوکھے پتوں کی مانند اڑتے ہوئے اپنی منزل کی تلاش میں بھٹکتے پھر رہے تھے اور مستقبل کے لمحات پر ایک دھند چھائی ہوئی تھی، گہری اور دبیز-

پھر...... ایسا ہوا کہ بے شمار دن گزر گئے، دھیرے دھیرے رک رک کر، تھم تھم کر، بہار ایک دفعہ پھر لوٹ آئی- بہار کی انہی ابتدائی شاموں میں سے ایک شام روحی اور یاسمین اپنے میکے آئیں- آئے دن پروگرام بننے لگے، سیر و تفریح کے، پکنک کے، پکچر کے اور کافی ہاؤس کے- ایسے ہی میں ایک دن ثمرین امی کے یہاں آئی تو سب موجود تھے ثروت آپا اور ماہین آپا سمیت- ماہین آپا اب اپنی گھریلو زندگی سے بہت خوش تھیں، عثمان بھائی کی ترقی ہو گئی تھی- اب وہ پیسوں کی کمی کا رونا بھی نہیں روتی تھیں- سب بیٹھے ہوئے بڑے گرما گرم طریقے سے گفتگو کر رہے تھے- زیر بحث موضوع ''پکنک'' تھا- بڑا لمبا چوڑا پروگرام ترتیب دیا جا رہا تھا- ثمرین آئی تو سب اس کے پیچھے پڑ گئے کہ اسے بھی ضرور ساتھ چلنا پڑے گا- سب کہہ کہہ کر ہار گئے لیکن ثمرین کی ''ناں'' ''ہاں''

میں نہ بدلی- بس! جانے کیوں اس نے ہامی نہ بھری ان دنوں تو شجاع الدولہ بھی کراچی میں موجود نہ تھے- ویسے اگر وہ ہوتے تو بھی اس کے لئے پکنک پر جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا- شجاع الدولہ نے اس کے کہیں آنے جانے پر کبھی بھی پابندی نہیں لگائی تھی-

سب کو باتوں میں مصروف چھوڑ کر ثمرین دوسرے کمرے میں چلی گئی اسی کمرے میں...... جہاں اس نے اپنی زندگی کے گزشتہ کئی سال گزارے تھے- وہ کمرہ جو اس کا ثروت آپا اور ماہین آپا کا مشترکہ کمرہ تھا- اسی کمرے کی کھڑکی میں جھک کر اس نے بیتی ہوئی گھڑیوں کو دہرانے کی کوشش کی اس کا دل چاہتا تھا- اس وقت اس کے پاس کوئی نہ آئے، اس سے کوئی نہ بولے اس کے کانوں میں کسی کی آواز نہ آئے- لیکن چند منٹ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی- ثمرین نے پلٹ کر دیکھا اور دروازے کے قریب آ گئی- سہیل بھائی کھڑے تھے-

''آپ، آیئے، اندر آیئے-''

ثمرین باوجود کوشش کے اپنے لہجے کی بیزاری چھپا نہ سکی- سہیل بھائی نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا-

''آخر تمہیں ہم لوگوں کے ساتھ چلنے سے انکار کیوں ہے؟''

ثمرین نے ایک لمحے کے لئے ان کی طرف دیکھا اور بولی-

''بس- میرا دل نہیں چاہتا-''

سہیل بھائی نے پوچھا-

''کیوں بھئی؟ آخر کیا ہو گیا تمہارے دل کو؟''

ثمرین نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا-

سہیل بھائی نے ایک نگاہ کھلے ہوئے دریچوں سے باہر ڈالی- اور بولے-

''ثمرین بیگم، انسان کو ہر حال میں خوش رہنے کی کوشش کرنی چاہیے-''

ثمرین نے گھبرا کر سہیل بھائی کی طرف دیکھا اور بولی-

''میں...... میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی-''

سہیل بھائی نے قدرے مسکرا کر کہا-

''میرا مطلب ہے تمہیں خوش رہنا چاہیے-''

ثمرین نے سر جھکا کر کہا-

''میں تو بہت خوش ہوں، بہت مطمئن-''

سہیل بھائی نے کہا-

''اگر سچ مچ ایسا ہے تو یہ بڑی خوشی کی بات ہے، مگر جانے میری نگاہیں دھوکہ کیوں کھا گئیں-''

ثمرین سر جھکائے خاموش کھڑی رہی-

سہیل بھائی کی نگاہیں چند سیکنڈ کے لئے گزرے ہوئے وقت کی راکھ پر جم گئیں- جانے کس چیز کی تلاش میں، مگر فوراً ہی انہوں نے بیتے ہوئے لمحوں کی گرد کو ذہن سے جھٹک کر کہا-

''بہرحال، ثمرین بیگم، تم ہمارے ساتھ پکنک پر ضرور چلو گی-''

ثمرین نے انکار کر کے ایک بار پھر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی لیکن سہیل بھائی نے بڑی گہری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر کہا-

''خوش رہنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ انسان بجائے سوچوں میں ڈوبے رہنے کے اپنے آپ کو ہر لمحہ مصروف رکھے- تمہیں ہر صورت میں ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا-''

اس سے پہلے کہ ثمرین کچھ اور کہتی سہیل بھائی کمرے سے باہر نکل گئے اور ثمرین کے دل کا اضطراب کچھ اور بڑھ گیا-

جب پکنک کا مقررہ دن آیا تو ثمرین کا کوئی عذر اس کے کام نہ آیا سب کے سامنے اسے شکست قبول کرنی ہی پڑی-

اتنی حسین اس قدر اجلی اور شگفتہ صبح سب کے چہرے مسرت سے کھلے ہوئے اور ثمرین کا دل اتنا ہی اداس، اتنا ہی بے سکون اور مضطرب! لیکن پھر بھی وہ سب کا ساتھ دینے پر مجبور تھی کس قدر تکلیف دہ بات تھی؟ مگر کبھی کبھی ایسا ہوا ہی کرتا ہے-

صبح گزر کر دوپہر آئی اور دوپہر کی گھڑیاں بیت کر شام آ گئی...... خوشگوار اور حسین شام...... بہار کی ہواؤں کے دوش بدوش چلتی ہوئی، لمحہ بہ لمحہ گزرتی ہوئی اور پل پل بیتی ہوئی شام- سب مصروف تھے، خوش تھے، ہنس رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے- ثمرین بھی سب کے درمیان بیٹھی تھی- باتیں بھی کر رہی تھی مسکرا بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی- مگر ذہن الجھا الجھا سا تھا- مسکراہٹیں پھیکی تھیں اور قہقہے کھوکھلے تھے- دل پہ اتنا بوجھ تھا کہ ڈھیروں آنسو بہانے کو جی چاہ رہا تھا، پھر...... ایک دم ہی اسے اس ہنستے مسکراتے ماحول سے اتنی وحشت ہوئی کہ وہ کسی سے کچھ کہے بغیر چپ چاپ باہر نکل آئی-

برابر والے ہٹ کی سیڑھیوں پر وہ تھکے تھکے سے انداز میں اس طرح بیٹھ گئی جیسے میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو-

ڈوبتی ہوئی شام-

افق پہ لمحہ لمحہ پھیلتی ہوئی سرخی-

دور سبز پانیوں کا سینہ چیر کر چپ چاپ آگے بڑھتے ہوئے جہاز......

جانے کن منزلوں کی طرف رواں دواں؟

تنہائی، خاموشی۔

اس خاموشی کو جھنجوڑتی بے کل و بے قرار لہروں کی آواز۔

اور......دل کی ان ویرانیوں اور تنہائیوں کا احساس جہاں نہ کوئی آواز تھی اور نہ دستک! ثمرین کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا۔ دل کا طوفان آنکھوں تک آیا لیکن آنکھوں کے ساحل کو رونے سے پہلے ہی ثمرین نے بند باندھ دیئے' طوفان تو رک گیا' تھم گیا لیکن دل گھٹ کر رہ گیا۔

ایسے میں ہی اس نے سہیل بھائی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ ان کی چال میں ایک وقار تھا اور چہرے پر سنجیدگی اور تمکنت۔ وہ ثمرین کے قریب آ کر رکے تو ثمرین کھڑی ہوگئی۔

سہیل بھائی نے کہا۔

''یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟''

ثمرین نے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدتے ہوئے کہا۔

''اندر دل گھبرا رہا تھا۔''

سہیل بھائی ایک ذرا سا مسکرائے اور بولے۔

''آخر تمہارے دل کو کیا ہوگیا ہے؟ یہ کیوں اس قدر گھبرانے لگا ہے؟''

ثمرین نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''جی! جی......معلوم نہیں۔''

''اچھا!''

سہیل بھائی نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔

ثمرین خاموش کھڑی رہی۔

سہیل بھائی نے دور تک پھیلے ہوئے سمندر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بات پوچھوں؟''

ثمرین نے ایک لمحے کے لئے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

''پوچھیے۔''

سہیل بھائی نے کہا۔

''کیا تم اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن نہیں ہو؟''

ثمرین نے بڑی ہمت کر کے ان کی طرف دیکھا اور کہا۔

''میں بہت خوش ہوں اور بہت مطمئن ہوں۔''

سہیل بھائی نے کہا۔

''اگر تمہارا جواب اس سے مختلف ہوتا تو......'' وہ یہ کہتے کہتے رک گئے کہ ''میں تمہارے منہ پر بھرپور طمانچہ رسید کر دیتا۔''

لیکن یہ سوچ کر کہ یہ بدتمیزی ہے، بداخلاقی ہے، اور انہیں ثمرین سے یہ کہنے کا کوئی حق بھی نہیں ہے وہ خاموش رہے۔

ثمرین استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتی رہی لیکن سہیل بھائی کچھ دیر چپ چاپ کھڑے رہے۔

''سنو ثمرین بیگم۔''

سہیل بھائی نے کہا۔

ثمرین نے کہا۔

''جی میں سن رہی ہوں۔''

''تم کس قدر خوش اور مطمئن ہو، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں اور گزشتہ چند مہینوں سے تمہاری سوچیں تمہیں کس سمت لے جا رہی ہیں؟ یہ بھی مجھے اندازہ ہے اور اس بات کا بھی یقین ہے کہ آئندہ کسی وقت بھی تمہارے یہ الجھے ہوئے خیالات تمہیں یا تو مستقل طور پر ذہنی مریض بنا دیں گے یا پھر تمہیں اپنے حالات سے بغاوت کر دینے پر مجبور کر دیں گے۔ کیونکہ......''

سہیل بھائی ایک لمحے کے لئے رکے اور بولے۔

''کیونکہ ان حالات میں، جن سے تم دوچار ہو، اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔''

ثمرین نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''آپ......آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔''

سہیل بھائی نے اس کی جھکی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

''میرے اندازے بہت کم ہی غلط ثابت ہوتے ہیں اور پھر...... اگر میں غلط سمجھ رہا ہوں تو تمہاری نگاہیں اوپر کیوں نہیں اٹھتیں؟ مجھ سے نظر ملا کر یہ بات کہو۔''

ثمرین نے چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا، سر اوپر اٹھایا اور سہیل بھائی کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات دہرانے کی کوشش کی، لیکن بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کا دل بھر آیا۔ آنکھیں چھلک پڑیں اس نے پلکیں جھپکا کر آنسو پینے کی کوشش کی، لیکن آنسو رخساروں سے پھسلتے ہوئے نرم ریت میں جذب ہوگئے۔

سہیل بھائی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''تمہارے آنسو میری بات کا صحیح اور سچا جواب ہیں! لیکن اب تم زندگی کے ایسے موڑ پر آ کر کھڑی ہوگئی ہو کہ یہ آنسو نہ تمہارے غم کا مداوا ہوسکتے ہیں اور نہ میرے اس غم کا جو برسوں سے میں دوسروں کی نگاہوں سے چھپائے پھر رہا ہوں۔''

سہیل بھائی کی ان باتوں نے ثمرین کا دل کچھ اور دکھا دیا۔

''مشکل تو یہ ہے کہ میں تمہیں قصوروار بھی نہیں ٹھہرا سکتا، کیونکہ عام طور پر لڑکیوں کے سوچنے کا انداز وہی ہوتا ہے، جو کبھی تمہارا تھا۔''

سہیل بھائی نے کہا، رک کر ایک دبی ہوئی سانس لی، بولے۔

''لڑکیاں اور چڑیاں عموماً بہت اونچی شاخ پر آشیانہ بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔''

ثمرین نے سوچا۔

''میں دوسری لڑکیوں کے بارے میں تو نہیں جانتی، لیکن اپنے بارے میں ضرور جانتی ہوں کہ میں نے ہمیشہ اونچی شاخ پر آشیانہ بنانے کے خواب دیکھے تھے۔''

لیکن ثمرین کے پاس ان باتوں کے جواب میں کہنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔

سہیل بھائی نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

''اب میں تمہیں سوائے اس کے اور کوئی مشورہ نہیں دے سکتا کہ وقت اور حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرو، خوش رہنے کی کوشش کرو، اور اگر خوش نہیں رہ سکتیں تو دوسروں پر یہ بھی مت ظاہر کرو، کہ تم خوش نہیں ہو۔''

ثمرین نے سوچا۔

''اب سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہیں۔''

اور جب...... بہار کی شام ڈھل کر رات آئی، تو سب اپنا رخت سفر باندھ کر واپس آنے کے لئے تیار ہوگئے۔

پھر...... اس رات کے خاموش سناٹوں میں، اپنے کمرے کی ویران تنہائیوں اور نیلگوں مدھم روشنی میں مغربی سمت کے دریچے میں جھکی ہوئی ثمرین کی سوچوں کے در ایک بار پھر کھل گئے۔

کچھ گھڑیاں تھیں گزری ہوئیں۔

کچھ لمحے تھے بیتے ہوئے۔

انہی گھڑیوں، انہی لمحوں کی کہانی دہراتے ہوئے ثمرین کو سات سمندر پار...... دور دیس گئے ہوئے جمشید کا خیال بڑی شدت سے آیا۔ اس نے پلکوں پہ چمکتے ہوئے تاروں کو آنچل میں

چھپاتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

''سنو شیدی! تم اگرچہ میری آواز نہیں سن سکتے، لیکن پھر بھی میں تمہیں پکارنے پر مجبور ہوں۔ آج کی شام بھی گزر گئی۔ کسی کے لوٹ کر نہ آنے کے لئے۔ میں جانے کس آس پر منتظر ایک جملہ سننے کے لئے، محض ایک جملہ......

''میں آج بھی تمہارا منتظر ہوں، آؤ اب لوٹ چلیں۔''

مگر جانتے ہو شیدی! انہوں نے دل چاہتے ہوئے بھی یہ جملہ نہیں کہا۔ اب ان کے پاس میرے لئے صرف نصیحتیں ہیں۔ میں ہار گئی ہوں۔ میں سچ مچ ہار گئی ہوں۔ تم نے مجھ سے کہا تھا۔

''آپ نے سہیل بھائی کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔''

میں سمجھتی ہوں میں نے صرف انہی کے ساتھ زیادتی نہیں کی بلکہ اپنے ساتھ بھی زیادتی کی ہے۔ اور آج...... تم مجھے بڑی شدت سے یاد آرہے ہو شیدی! میرے پیارے بھائی...... میرے پیارے دوست...... اگر وقت کے ان لمحات میں آسکو تو آ کر دیکھو کہ تمہاری ثمرین آپا آج اپنے خوابوں کے اس تاج محل میں تنہا، بالکل تنہا اپنی شکست کی آواز بنی گونجتی پھر رہی ہے، در و دیوار سے ٹکراتی پھر رہی ہے۔ اس صدائے بازگشت کو سن کر ہر لمحہ مرجانے کو دل چاہتا ہے، ایسے میں اگر تم آ کر میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر، میرے سر کو پیار سے تھپک کر بس اتنا کہہ دو۔

''صبر کیجئے ثمرین آپا، یہ دنیا ہے یہاں ایسی ہی باتیں ہوا ہی کرتی ہیں۔'' تو شاید سچ مچ مجھے صبر آجائے۔

شیدی کو یاد کرتے ہوئے ثمرین کے دل کا درد امنڈ کر آنکھوں میں آگیا۔ اس نے دریچے کے پردے برابر کیے اور تکیوں میں منہ چھپا کر سسک پڑی۔

❖ ○ ◆ ○ ❖

اک سودائی لڑکی

نومبر 1973ء

تیز چلچلاتی دھوپ سے بھری دوپہریا میں وہ آنگن کے بیچوں بیچ اکڑوں بیٹھی آپا کی سفید موٹی تازی بلی کو دودھ میں روٹی بھگو بھگو کر کھلا رہی تھی- بھورے بھورے بال ہمیشہ کی طرح شانوں پر بکھرے ہوئے تھے- جنہیں وہ بار بار جھٹک کر پیچھے کر رہی تھی- اماں کو اس کی اس عادت سے خاص چڑ تھی- اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو وہ جھونٹے کہا کرتی تھیں- اسے اس حالت میں دیکھتے ہی ان کی آنکھیں لال پیلی ہو جاتی تھیں-

''اپنے ان جھونٹوں کو تو باندھ لیا کر اللہ کی بندی-''

وہ قریب آ کر اس کے بالوں کو سمیٹ کر بل دینے کی کوشش کرتیں تو وہ کسی گھوڑی کی طرح سر ادھر ادھر مار کر جھٹکے سے اپنے بال چھڑا کر دور جا کھڑی ہوتی-

''دیوانی ہوئی ہے کچھ؟''

اماں اور بپھر جاتیں-

''ہمیں ایسے ہی اچھا لگتا ہے-''

وہ گردن مٹکا کر کہتی-

''اے ہے! اے یہ بھی کوئی فیشن ہے؟''

اماں ڈپٹ کر کہتیں ''ہم نے نکالا ہے یہ فیشن-''

کبھی بلی کو تنگ کرنے کو دل چاہتا تو اسے گوشت کی بوٹی یا چھیچھڑا دکھا کر دور بھاگ کھڑی ہوتی- خود بھی سارے گھر میں ناچتی اور بلی کو بھی نچاتی- سیاہی سے سوتے ہوئے اصغر کی داڑھی مونچھیں بنا دینا تو اس کا محبوب مشغلہ تھا- اپنی اس حرکت کے پیچھے اس نے مار بھی بہت کھائی تھی، مگر اپنی عادت نہیں چھوڑی تھی-

اور...... اس وقت تپتی ہوئی دوپہر میں بلی غریب کو اچھی طرح تنگ کر لینے کے بعد اس پر بڑی مہربان بنی بیٹھی تھی- بڑی محبت سے اسے دودھ روٹی کھلائی جا رہی تھی- اپنے کام میں پوری طرح مصروف تھی کہ ''اطلاعی گھنٹی'' بڑے زور سے بجی- کال بیل کے لئے یہ اصطلاح اسی نے اختراع کی تھی اور بڑی وضعداری کے ساتھ کال بیل کو ہمیشہ اطلاعی گھنٹی کہتی تھی- اس وقت کال بیل کی آواز اسے زہر سے بھی زیادہ بری لگی اور اسے بجانے والا اور بھی زیادہ برا لگا- پہلے تو وہ ڈھیٹ بنی بیٹھی رہی- لیکن جب دوبارہ گھنٹی بڑی زور سے بجی تو آنے والے کو دل ہی دل میں سینکڑوں صلواتیں سناتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی- اور فرش پر دھم دھم پیر مارتی ہوئی دروازے کی طرف چل دی-

''ہنہ، نہ شام دیکھیں گے نہ دوپہر، منہ اٹھائے چلے آتے ہیں-''

اس نے بڑی زور سے دروازہ کھولا-

دروازہ کھلا تو محمود بھائی کی صورت نظر آئی- وہ بڑی خشمگیں نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے-

''کیوں بھئی؟ کیا ہے؟''

انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا-

''دوپہر ہے اور کیا ہے؟''

وہ مسکرا کر بولی-

''دوپہر ہے؟''

محمود بھائی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا-

''جی ہاں، دوپہر ہے اور وہ بھی تپتی جھلستی-''

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے بھئی-''

''بس تو پھر؟''

''کیا مطلب ہے؟ میں سمجھا نہیں-''

''میرا مطلب ہے کہ کس احمق نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ اس دھوپ میں کوئلے کی طرح کالے

وہ بڑی بے نیازی سے کہتی۔

ایسے میں اگر کہیں نسرین آپا اُدھر آ جاتیں تو جھٹ اماں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہتیں۔

''ٹھیک ہی تو کہتی ہیں اماں، یہ بھی کوئی فیشن ہے؟''

ان دونوں کی آواز سن کر پروین آپا کا بھی کسی کونے کھدرے سے نکل آنا ضروری ہوتا تھا۔

''اتنے لمبے اور گھنے بال بکھرائے پھرتی ہو، تمہیں گرمی بھی نہیں لگتی؟''

پروین آپا اپنی چونچ ہلانا ضروری سمجھ کر کہتیں۔

''میں نے کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔''

وہ شوخی سے مسکراتی۔

''مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ چڑیلوں کی طرح بال بکھرائے پھرنا۔''

نسرین آپا کہتیں۔

''آپ خود ہوں گی چڑیل۔''

وہ اماں کے گھورنے کی پرواہ کیے بغیر پھٹ سے کہتی شوخ و شریر ہونے کے ساتھ وہ بدتمیزی میں بھی گزوں چھوڑ میلوں آگے تھی۔

بچپن بیتا، لڑکپن بھی گزرا۔ کئی فضول عادتیں خودبخود چھوٹ گئیں۔ مگر جھونٹے بکھرائے پھرنے کی عادت بڑے ہونے پر بھی نہ گئی۔ اکثر و بیشتر ''ہم'' کہہ کر بات کرنے کا شاہانہ انداز بھی بدستور قائم رہا۔ اور شوخی و شرارت تو بجائے کم ہونے کے دوچند ہوگئی۔ ابا میاں کا خیال تھا کہ وہ بڑی ہو کر کچھ پاگل اور احمق سی ہوگئی ہے۔ اشرف بھائی اور اکبر بھائی کے نزدیک وہ چلتا پرزہ تھی۔ اصغر عمر میں اس سے ڈیڑھ سال چھوٹا ہونے کے باوجود بغیر کسی ادب لحاظ کے اسے بدھو کہتا تھا۔ اماں شکو اس کے لئے ''چلتی پرجی'' کی اصطلاح زیادہ مناسب سمجھتی تھیں۔ لیکن حقیقت میں وہ کیا تھی؟ یہ نہ کوئی دوسرا سمجھ سکا تھا اور نہ وہ خود اس بارے میں کوئی فیصلہ کر سکی تھی۔ وہ تو بس یہ جانتی تھی کہ شوخی اور شرارت اسے پسند تھی۔ سب کو تنگ کرنے میں اسے بے حد لطف آتا تھا۔ انسان تو ایک طرف رہے، وہ تو جانوروں اور پرندوں کو بھی نہیں بخشتی تھی۔ کبھی طوطے کو تنگ کرنے کے لئے بلی کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر پنجرے کے قریب بیٹھ جاتی۔ بلی کو دیکھ کر طوطا ٹیں ٹیں کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتا۔ ایک طرف سے اماں پھٹکارتیں، دوسری طرف سے آپا نسرین غراتیں۔ اور اپنی بلی کو چیل کی طرح اس کے ہاتھوں سے جھپٹ کر لے جاتیں۔ اور وہ خود ڈانٹ پھٹکار کی پرواہ کیے بغیر بڑے اطمینان سے ہنس کر کہتی۔

''لو، خواہ مخواہ ہی جھپٹ لے گئیں اپنی بلی...... اتنی تو رونق ہوگئی تھی۔''

ہوتے چلے آئیں۔''

''کیا فضول باتیں کر رہی ہو؟''

محمود بھائی چڑ گئے۔

''میری بات فضول لگتی ہے تو جا کر آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ فرما لیجئے۔''

''تم کسی طرح راستہ بھی دو۔''

محمود بھائی جل کر بولے۔

انہیں اس وقت فرحین کے اوپر غصہ آ رہا تھا، جو بیچ دروازے میں کسی پہریدار کی طرح ڈٹی کھڑی تھی۔

''اچھا تو کیا راستہ بھی دینا پڑے گا۔''

فرحین نے کہا۔

''پھر کیا تمہارے سر پر سے کود کر اندر جاؤں۔''

''نہیں، یہ کوشش ہرگز مت کیجئے گا، کیونکہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ ہائی جمپ میں ہمیشہ پھسڈی رہے ہیں......''

''ہٹ کے چلی جاؤ گی یا میں دوبارہ گھنٹی بجا کر خالہ اماں کو اٹھاؤں۔''

''اس میں ہمارا قصور نہیں۔ ہمارا دل اس وقت بکواس کرنے کو ہی چاہ رہا ہے اور کوئی تو ہے نہیں گھر میں......''

''کیا گھر میں کوئی نہیں ہے؟''

محمود بھائی نے جلدی سے پوچھا۔

''ہیں کیوں نہیں، سب ہیں۔''

''تم خود ہی تو بک رہی تھیں ابھی۔''

محمود بھائی زچ ہو کر بولے۔

''کہنے کا مطلب تو یہ ہے کہ فرصت تو کسی کو نہیں ہے، سبھی عبادت میں مصروف ہیں۔''

''عبادت میں مصروف ہیں؟''

''ہاں، عبادت کا مطلب نہیں سمجھتے آپ؟''

''یعنی تمہارا مطلب ہے سب نماز یا قرآن شریف پڑھ رہے ہیں۔''

''جی ہاں، اگر بستروں پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے خرخر کی آوازوں کے ساتھ نماز قرآن شریف پڑھی جا سکتی ہے تو پھر یہی مطلب ہوگا۔''

''لاحول ولاقوۃ، تم تو بلا ہو پوری-''

محمود بھائی نے پھر گھنٹی کے ارادے سے ہاتھ دیوار کی طرف بڑھایا-

''گھنٹی بجانے کے بڑے شوقین ہیں آپ، اندر آتے کیوں نہیں، ہٹ تو گئی ہوں ایک طرف-''

فرحین جلدی سے ایک طرف ہو کر بولی-

''سیدھی طرح راہ راست پر تھوڑی آتی ہو تم-''

محمود بھائی اندر داخل ہوتے ہوئے بولے-

''اندر تو آ گئے ہیں آپ، لیکن میرا دماغ نہ کھائیے گا-''

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی-

''دماغ کھانے کی عادت تو تمہیں ہی ہے-''

محمود بھائی دیوان پر بیٹھتے ہوئے بولے-

فرحین ان کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی- ابا میاں کے اسٹڈی روم میں سے سات آٹھ موٹی موٹی کتابیں جمع کر کے محمود بھائی کے سامنے لے جا کر ڈھیر کر دیں-

''یہ کیا ہے؟''

محمود بھائی نے حیرت زدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا-

''بس، اس سے زیادہ کوئی خدمت نہیں کی جا سکتی آپ کی؟''

''میں ان کا کیا کروں؟''

''کتابوں کا کیا کرتے ہیں؟ پڑھتے ہی ہیں؟ اچار تو نہیں ڈالتے-''

محمود بھائی نے ایک گہری سانس لے کر کتابوں کی طرف دیکھا ان کا دل چاہا ان کتابوں پر اپنا سر دے ماریں-

''معلوم ہوتا ہے پڑھنے کے شوقین نہیں ہیں آپ-''

اس کی بڑی بڑی آنکھیں شوخی سے چمک رہی تھیں-

''تم تو شوقین ہو-''

محمود بھائی نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف دیکھا-

''اچھا ہم اماں کو اٹھا دیتے ہیں-''

وہ سنی ان سنی کر کے بولی-

محمود بھائی نہیں نہیں کرتے رہ گئے، مگر وہ اماں کے کمرے میں پہنچ گئی-

''محمود بھائی آئے ہیں اماں-''

اس نے اماں کے کان کے پاس منہ لے جا کر حلق پھاڑا- اماں ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ گئیں- اس کی بات تو ان کی سمجھ میں نہ آ سکی، لیکن یوں اپنی نیند خراب ہو جانے پر انہیں بڑا تاؤ آیا- ان کا دل تو چاہا کہ اس بدتمیزی سے اٹھانے پر فرحین کے جھونٹے پکڑ کر دو ہاتھ رسید کریں، مگر اب اس کی عمر مار کھانے کی کہاں رہی تھی- مارنے پر بس نہ چلا تو ڈپٹ کر بولیں-

''کیا مصیبت ہے؟ کیوں حلق پھاڑ رہی تھیں میرے کان کے پاس؟''

''مصیبت نہیں اماں، محمود بھائی آئے ہیں-''

اس نے اماں کی ڈانٹ کی کوئی پرواہ ہی نہ کی-

''کون؟ محمود، اچھا-''

اماں کا غصہ قدرے کم ہوا-

''سہولت سے بھی تو اٹھا سکتی تھیں تم مجھے- دل دہلا دیتی ہو تم تو سوتے ہوئے آدمی کا-''

اماں بستر سے نیچے اترتے ہوئے بولیں-

''کیا کروں؟ مجھے ایسے ہی اٹھانے کی عادت ہے-''

اس نے اپنے موتیوں جیسے دانت چمکاتے ہوئے کہا-

اماں اس کی بات کے جواب میں کچھ کہے بغیر باہر چلی گئیں-

اسی شام کو محمود بھائی کے گھر سے جاتے ہی فرحین کے چہیتے، دلارے ظفر ماموں آ گئے- ظفر ماموں اماں کے سب سے چھوٹے بھیا تھے- مگر چھوٹے ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ وہ دودن کے چھٹلنے تھے ان بے چاروں کا تو نوجوانی کا دور بھی گزر چکا تھا- پینتیس سال سے کم عمر تو ہرگز نہیں تھی ان کی، مگر تھے اب تک لنڈورے ہی- بلا مبالغہ ان کے لئے درجنوں لڑکیاں تو دیکھی جا چکی تھیں ان میں قبول صورت تو بس گنتی کی تھیں، زیادہ تر خوبصورت تھیں- بلکہ ایک لڑکی تو واقعی بے پناہ حسین تھی- ہر لڑکی کو ریجکٹ کر دیتے تھے- فرحین کا خیال تھا کہ ان کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے- اس کے سامنے جب بھی ان کی شادی کا ذکر ہوتا تو وہ پھٹ سے کہہ دیتی-

''کس چکر میں پڑی ہیں آپ نانی اماں؟ ظفر ماموں کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہیں ہے-''

''تیرے منہ میں خاک-''

نانی اماں سے پہلے اماں بولتیں-

اور وہ اپنے چمکیلے دانتوں کی نمائش کئے ہنسے جاتی-

خاندان میں ظفر ماموں کی خوب صورتی اور خوش اخلاقی کے بڑے چرچے تھے- اپنی بھانجیوں بھتیجوں سے انہیں بہت پیار تھا، لیکن اس پیار اور چاہت کے معاملے میں فرحین سب پر بازی لے

گئی تھی، معلوم نہیں اس شوخ وشریر اور بدتمیزسی لڑکی سے کیوں انہیں والہانہ پیار تھا- وہ بھی ظفر ماموں کا بہت دم بھرتی تھی ظفر ماموں کا یہ عالم تھا کہ اس کی ہر بات اور ہر کام میں دلچسپی لیتے تھے- اس کی شرارتوں پر ایسے خوش ہوتے تھے جیسے وہ بڑے کارنامے انجام دے رہی ہو، کسی چیز کی فرمائش کئے اسے دیر نہیں ہوگی کہ ظفر ماموں پورا کرنے کے لئے تیار ہیں- اماں تو اٹھتے بیٹھتے اسے یہی طعنہ دیتی تھیں-

''تیرے دماغ تو ظفر نے خراب کئے ہیں-''

اسے انٹر کا امتحان دیئے دو چار روز ہی ہوئے تھے کہ ظفر ماموں نے اسے آنرز کرنے کا مشورہ دیا- اماں نے فوراً مخالفت کی پروین آپا بھی جھٹ سے بولیں-

''آنرز کرنا مناسب نہیں ہے- ایم- اے کرلے گی-''

ان کا خیال تھا کہ فرحین ابھی کچی عمر کی ہے اور یونیورسٹی میں ایک سے ایک گھاگ لڑکے پڑھتے ہیں- کوئی بھی آسانی سے بے وقوف بنالے گا-

ابا میاں کا بھی یہی خیال تھا-

لیکن ظفر ماموں فوراً اس کی ذمہ داری لینے پر تیار ہوگئے ان کا کہنا تھا کہ میں اتنے سالوں سے یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں- اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ میں اسے ایڈمیشن دلواؤں گا- میرے ہوتے ہوئے کسی کی مجال ہے جو اس پر ٹیڑھی نگاہ ڈالے صبح اپنے ساتھ لے جاؤں گا واپسی میں ساتھ لے کر آؤں گا- گویا ایک طرح سے انہوں نے اس کا باڈی گارڈ بننا منظور کرلیا-

ظفر ماموں نے جب اس شدومد سے اس کی حمایت کی تو سب کو خاموش ہونا پڑا- رزلٹ آیا تو انہوں نے ہی اس کے داخلے کی کارروائیاں کیں- وہ تو بس ایک دن ڈھیہ چھونے گئی تھی- اس کے بعد اطمینان سے اپنی شرارتوں میں مشغول ہوگئی تھی-

شام کو محمود بھائی کے جانے کے بعد جو ظفر ماموں کی تشریف آئی تھی تو صرف یہی خوشخبری سنانے کے لئے کہ تمہارا نام لسٹ میں آگیا ہے- فیس میں نے جمع کروادی ہے کل میرے ساتھ چل کے کچھ ضروری کارڈز بھر دینا اور پھر فلاں تاریخ سے کلاسیں اٹینڈ کرنے آجانا- لسٹ میں نام آنا تو محض رسمی سی کارروائی تھی فرحین کے لئے- اسے تو انٹرویو دینے سے پہلے ہی معلوم تھا کہ داخلہ تو اس کا فارم بھرتے ہی ہو چکا تھا اگلے دن جب وہ ظفر ماموں کے ساتھ یونیورسٹی جارہی تھی تو ظفر ماموں آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہوئے اس کے سامنے نصیحتوں کا پلندہ بھی کھولے بیٹھے تھے اور وہ ان کی باتیں سنجیدگی سے سننے کے بجائے ہنسی میں اڑا رہی تھی جب گاڑی یونیورسٹی کی حدود میں داخل ہوئی تو فرحین نے انہیں اپنا فیصلہ سنادیا-

''بھئی سچی بات ہے ظفر ماموں ہم سے سنجیدگی کا خول نہیں چڑھایا جائے گا-''

''کیا مطلب؟'' ظفر ماموں نے قدرے رعب سے کہا حالانکہ انہیں یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ فرحین کے اوپر ان کا رعب بالکل نہیں چلتا-

''مطلب یہ ہے کہ اب یہی تو ہمارے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ یہ نہ کرنا وہ نہ کرنا-'' فرحین نے ان کے رعب کی قطعی پرواہ نہیں کی-

''ہنسنے کھیلنے کے لیے یہی جگہ تو نہیں رہ گئی-'' ظفر ماموں مسکرائے-

''ذرا لطف رہے گا نا- جب لڑکوں کو تنگ کروں گی-''

''بہت بری بات ہے لڑکوں کو تنگ کرنے کا کیا مطلب ہے......؟''

''بس اسی لئے یونیورسٹی میں ہم داخلہ نہیں لینا چاہتے تھے- کالج میں شرارتیں کرنے پر کوئی پابندی تو نہیں تھی-''

''میری شامت بلوانا چاہتی ہو تم-''

''نہیں- بالکل نہیں-''

''کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تم نے تو سب میری ہی ٹانگ پکڑیں گے-''

''الٹی سیدھی حرکت نہیں کروں گی- بس صرف تنگ ہی کیا کروں گی-''

گاڑی رکتے ہی فرحین دروازہ کھول کر باہر آگئی اور اپنی چمکیلی آنکھوں سے اردگرد کا جائزہ لینے لگی-

باقاعدہ کلاسیں شروع ہونے میں بھی ایک مہینہ لگ گیا- کچھ دن تک تو فرحین کو بوریت محسوس ہوئی- کلاس میں گنتی کے لڑکے اور لڑکیاں تھے، ان میں بھی کوئی مصر کا تھا تو کوئی ایران کا، کوئی نائیجیریا کا تو کوئی عراق کا تھا- لڑکیوں میں سے بھی ایک جاپانی تھی، ایک میمن تھی- دو پنجابی لڑکیاں تھیں جو بہت لئے دیئے رہتی تھیں جب دیکھو جب مدبرہ بنی بیٹھی ہیں- ایک لڑکی حیدرآبادی تھی- وہ ذرا شوخ شریری تھی بات بات پر اس کی بتیسی نکل آتی تھی- شمع اور فرزانہ تو اسکول کے زمانے سے اس کی ساتھی تھیں- ان دونوں کا آنرز کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا- فرحین نے ہی ضد کرکے انہیں یونیورسٹی میں داخلہ لینے پر مجبور کیا تھا- صرف یہ سوچ کر کہ میں اکیلی تو چند ہی دنوں بعد بے موت مرجاؤں گی- کچھ دن تو فرحین نے بڑے صبر سے گزارے لیکن آخر کب تک؟ روز ماموں ظفر کی جان کھاتی-

''میرا دل نہیں لگتا یہاں- ایسی ڈل لائف مجھے قطعی پسند نہیں ہے-''

رفتہ رفتہ اس نے حیدرآبادی لڑکی سے دوستی گانٹھی اور اس کی ذرا سی شوخی شرارت سے فائدہ

اٹھا کر اسے پوری طرح اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ شمع اور فرزانہ تو پہلے ہی سے اس کی مقلد تھیں۔
چاروں نے اپنے پر پرزے نکالے تو نہ مصری کو بخشا نہ ایرانی کو آہستہ آہستہ ڈیپارٹمنٹ میں ان کی شوخی شرارت کے چرچے ہونے لگے۔

ظفر ماموں کے شاگردان سے کہتے۔

''سر! آپ کی بھانجی بہت جولی ہیں۔''

ان کے ساتھی اساتذہ کہتے۔

''ظفر تمہاری بھانجی بہت شریر ہے۔''

ظفر ماموں پیار بھری ڈانٹ کے ساتھ اسے تنبیہ کرتے تو وہ بہت معصوم بن کر کہتی۔

''میں کسی کا کیا بگاڑتی ہوں، میں تو اپنا دل خوش کرتی ہوں۔''

کچھ دنوں بعد الیکشن کی مہم شروع ہوئی تو فرحین کی بن آئی۔ ہر امیدوار اس کی حاضر جوابی کے ہاتھوں تنگ آیا ہوا تھا۔ امیدواروں کے حالی موالی الگ پریشان تھے ہر ایک کی خواہش تھی کہ فرحین ان کے لئے کنویسنگ کرے۔ کیونکہ اس کے ملنے جلنے والوں کا حلقہ تھوڑے ہی دنوں میں بہت وسیع ہو گیا تھا۔ ہر امیدوار کو یقین تھا کہ اگر وہ سنجیدگی سے کام کرے تو بہت سارے ووٹ دلوا سکتی ہے مگر لفظ سنجیدگی تو فرحین کی لغت میں تھا ہی نہیں۔

فرحین کے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے ایم۔ اے فائنل کا ایک طالب علم شہزاد اختر صدارت کے عہدے کے لئے امیدوار تھا لمبے قد درمیانے جسم کا خوش شکل لڑکا تھا جس کے بال سنہری مائل بھورے تھے اور آنکھیں سیاہ اور چمکدار خوش گفتار اور خوش کردار بھی تھا۔ کم از کم ظاہر تو وہ یہی کرتا تھا اندر کا حال اللہ ہی بہتر جانتا تھا یا وہ خود الیکشن کے دنوں میں تو بڑے سے بڑا بدمعاش بھی اپنے اوپر شرافت کا خول چڑھا لیتا ہے۔

شہزاد اختر کے بارے میں تو وہ شروع سے ہی سنتی آرہی تھی کہ بڑا نیک اور شریف ہے۔ سننے میں یہ بھی آیا تھا کہ انگلش اور اردو کا بہت اچھا مقرر ہے۔ فرسٹ ایئر آنرز سے اب تک بے شمار انعامات جیت چکا ہے، لیکن فرحین کو وہ ایک آنکھ نہ بھایا تھا، وجہ اس کی یہ تھی کہ فرحین نے آج تک اس کے دانت باہر نہیں دیکھے تھے، ہنسنا تو دور کی بات ہے فرحین نے آج تک اسے مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی سہیلیوں کا کہنا یہ تھا کہ جس وقت وہ ہنستا مسکراتا ہوگا تمہاری نظر نہ پڑتی ہوگی اس پر مگر فرحین کو تو اس سے اس لئے بھی چڑ تھی کہ افسانوں اور ناولوں کے روایتی ہیروؤں کی طرح اس کی آنکھوں میں اداسی کے سائے نظر آتے تھے۔

''یہ ہیروئنیں اور ہیرو سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس قسم کے ڈھونگ خوب رچایا

کرتے ہیں۔'' وہ ایک شریری مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھیر کر کہتی۔

ڈیپارٹمنٹ کے بہت سے لڑکوں سے فرحین کی بات چیت تھی لیکن شہزاد اختر نے کبھی اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ لیکن الیکشن ایسی چیز ہے کہ اچھے اچھوں کو ناک رگڑوا دیتا ہے۔ عام دنوں میں کوئی کتنا ہی بڑا ہیرو بنا رہے، کم سخنی اور سنجیدگی کا لیبل چپکائے رہے، کسی سے بات کرے یا نہ کرے۔ الیکشن کا سیزن شروع ہوا نہیں کہ بھیک منگوں کی صورت بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

شہزاد اختر کے حالیوں موالیوں نے بھی اسے زبردستی کھینچ کھانچ کر فرحین گروپ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ شہزاد اختر بیچارہ تو گونگے کا گڑ کھا کر کھڑا ہو گیا۔ حالی موالی اس کی قصیدہ خوانی کرنے لگے۔ فرحین کی حالت یہ تھی کہ بہت اطمینان سے سیڑھیوں پر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ کوشش تو یہی کر رہی تھی کہ غور سے ان کی باتیں سنے، مگر دماغ میں جو کیڑے رینگ رہے تھے وہ غور وخوض کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہے تھے بلکہ وہ شرارت پر ہی اکسا رہے تھے دانت ایک نہ دو پورے کے پورے باہر نکلے ہوئے تھے شہزاد کے دوستوں کی بولتی زبانیں بند ہوئیں تو اس نے انہیں فوراً ٹوکا۔

''ارے آپ لوگ چپ کیوں ہو گئے؟ اور بھی کچھ بولئے نا۔''

''جی۔ جی بس اتنا ہی.....'' ایک لڑکا گڑبڑا کر بولا دوسرا بھی خاصا پریشان تھا۔

باقی تین ایک دم ہونق بن کے رہ گئے۔

''کیا بات ہے آپ کچھ پریشان معلوم ہوتے ہیں؟'' اس نے پریشان صورت لڑکے سے پوچھا۔

''نہیں آپ ضرور پریشان ہوں گے۔ یہ الیکشن چیز ہی ایسی ہے۔'' فرحین نے ہنستے ہوئے کہا۔

ساتھ میں اس کی سہیلیوں کی ہی ہی۔ ٹھی ٹھی بھی جا رہی تھی پھر فرحین نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ایک ہونق لڑکے سے بولی۔

''میں نے سنا تھا یہ آپ کے دوست بڑے اچھے مقرر ہیں۔''

''جی ہاں۔ انگریزی اور اردو کے بہت اچھے مقرر ہیں۔''

''مگر یہ بولتے کس طرح ہوں گے؟''

''جی..... کیا مطلب؟''

''یہ تو گونگے معلوم ہوتے ہیں۔'' فرحین نے ہنس کر کہا شہزاد کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔

''یار۔ تم بھی تو بولو۔'' اس کے ایک دوست نے ٹہوکا دیا۔

''بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آپ ایک گونگے سے بولنے کو کہہ رہے ہیں- یہ تو سراسر قدرت کا مذاق اڑا رہے ہیں-''

فرحین نے سنجیدہ بننے کی ناکام کوشش کی-

شہزاد نے کچھ بولنے کے لئے لبوں کو جنبش دی مگر جانے کیا سوچ کر خاموش رہا-

''کیا یہ پیدائشی گونگے ہیں؟'' فرحین نے پوچھا

شہزاد نے بدقت تمام اس جملے کو برداشت کیا اور اپنے برابر کھڑے ہوئے لڑکے سے آہستہ سے کہا-

''چلو آفتاب! خوامخواہ وقت ضائع کر رہے ہو؟''

''چلو یار!'' آفتاب نے بھی کہا-

''ارے نہیں' رکیے- یہ تو بولتے ہیں مگر دیر سے-'' فرحین جلدی سے بولی-

اس کے لہجے میں کچھ اتنی بے ساختگی تھی کہ دوسرے لڑکوں کا تو ذکر ہی کیا ہر وقت سنجیدہ رہنے والا شہزاد بھی مسکرا دیا-

''ہاں- اب بنی نا بات!'' فرحین نے مسکرا کر کہا-

''محترمہ- اگر آپ کو ووٹ نہیں دینا تو ویسے ہی بتا دیجئے-'' شہزاد کے ایک دوست نے جھلا کر کہا-

''کیا ابھی دے دوں ووٹ؟ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا-''

فرحین نے دوسرے امیدواروں کی طرح اسے بھی جھنڈی دکھا دی-

شام کو جب ظفر ماموں سے الیکشن کے سلسلے میں بات ہوئی تو انہوں نے شہزاد کی بہت وکالت کی- اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے- فرحین نے سوچا، اب جبکہ ظفر ماموں بھی کہہ رہے ہیں تو سنجیدگی کے ساتھ شہزاد کے لئے کام کر ہی دینا چاہئے-

اگلے ہی روز سے اس نے بہت سرگرمی دکھانی شروع کر دی- الیکشن کا روز بھی آ گیا- پورے ہنگامے اور شور شرابے کے ساتھ الیکشن ہوئے اور رزلٹ بھی آ گیا-

شہزاد اختر جیت گیا لیکن اس کارروائی کے دوران فرحین نے ان لوگوں سے ڈھنگ سے بات کر کے نہ دی انہیں دیکھتے ہی سارے شوخ جملے اس کی زبان پر آ جاتے خاص طور سے شہزاد کو تنگ کرنے میں تو اسے بہت ہی لطف آتا تھا-

پھر اس سال جتنے بھی فنکشن ہوئے، سب میں فرحین کو بطور خاص مدعو کیا گیا- یوں دیکھتے ہی دیکھتے وقت گزر گیا- امتحان شروع ہوئے اور گزر گئے- فرحین نے وہ چھٹیاں بالکل فضول کے

کاموں میں گزار دیں- آہستہ آہستہ رزلٹ آنے شروع ہوئے- ایم- اے فائنل اکنامکس کا رزلٹ آیا تو اس کو شہزاد کا خیال آیا-

''دیکھوں تو سہی کیا تیر مارا ہے صاحبزادے نے-''

اس نے سرخی پر نظر ڈالتے ہوئے دل ہی دل میں کہا لیکن نیچے والی سطر پر نظریں دوڑاتے ہی اسے ظفر ماموں کے الفاظ کی صداقت کا یقین ہو گیا- ظفر ماموں نے امتحان کے دنوں میں ہی کہا تھا:

''شہزاد ٹاپ کرے گا-''

''یہ لڑکا تو واقعی قابل نکلا-''

فرحین نے سوچا اور اخبار میز پر ڈال کر نسرین آپا کو بتانے چل دی کہ ظفر ماموں کا چہیتا شاگرد فرسٹ کلاس فرسٹ آیا ہے-

اسی رات تاروں بھرے آسمان کے نیچے آنگن کے بیچوں بیچ بچھی کھردری چارپائی پر آڑی ترچھی لیٹی ہوئی فرحین نے خشکی سے بھرے سر کو کھجڑ کھجاتے ہوئے سوچا-

''شہزاد اختر نے پوری سولہ جماعتیں پاس کر لی ہیں اب تو وہ ملازمت کے لئے جوتے گھسا کرے گا- میں تنگ کس کو کروں گی؟''

ایمان کی بات تو یہ تھی کہ ابھی تک فرحین کی جتنی عمر گزری تھی اس میں جتنا لطف شہزاد کو تنگ کرنے میں آیا تھا اور کسی کو کرنے میں بالکل نہیں آیا تھا-

''خیر اللہ مالک ہے، دیکھا جائے گا؟'' اس نے مطمئن ہو کر سوچا-

جب نیا سیشن شروع ہوا تو ایک دن ظفر ماموں نے انتہائی مسرت بھرے لہجے میں اسے یہ خبر سنائی کہ شہزاد کو ڈیپارٹمنٹ میں لیکچررشپ مل گئی ہے-

''چلیے یہ بھی اچھا ہوا کہ اسے یہیں سروس مل گئی ہے-'' فرحین نے اطمینان سے کہا-

ظفر ماموں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا پھر کچھ سوچ کر بولے-

''اب تم اس کی عزت کرنا- تمہارا استاد بن گیا ہے؟''

''بے عزتی تو پہلے بھی ہم نے نہیں کی-'' فرحین مسکرائی-

''میرا مطلب ہے اسے پریشان مت کرنا-''

''یہ پابندی نہ لگائیے ظفر ماموں؟''

''کیوں......؟''

''وہ چاہے ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بھی بن جائے تب بھی ہم اسے پریشان کریں گے-''

ظفر ماموں نے اس کی یہ بات سن کر ایک ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور کافی دیر تک اس کے سامنے نصیحتوں کا پلندہ کھولے بیٹھے رہے۔فرحین نے ان کی تمام باتیں غور سے سنیں لیکن ان پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا۔

کچھ دنوں بعد اسے معلوم ہوا کہ اس کی ایک کلاس شہزاد بھی لیا کرے گا۔وہ اسی دن اسٹاف روم میں پہنچ گئی۔اس کمرے میں چار استاد بیٹھتے تھے۔تین کی سیٹیں خالی تھیں۔شہزاد اپنی نشست پر بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

''حاضر ہو سکتے ہیں جناب؟''

اس نے کمرے میں داخل ہو کر اونچی آواز سے کہا شرارت کی کرنیں نگاہوں سے پھوٹی پڑ رہی تھیں۔شہزاد نے چونک کر کتاب پر سے سر اٹھایا۔

''ارے آپ تو ڈر گئے!'' فرحین نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور کرسی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''بیٹھ جاؤں یا کھڑی رہوں؟''

شہزاد اس کے اس طرح چلے آنے سے نروس سا ہو گیا تھا اس کے منہ سے کوئی بات ہی نہ نکل سکی۔

''اڑتی اڑتی یہ خبر مابدولت تک پہنچی ہے کہ آپ ہماری کلاس لیں گے؟'' اس نے شاہانہ انداز سے کہا۔

شہزاد اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔

''کہیں یہ افواہ آپ کے دشمنوں نے تو نہیں اڑائی؟'' فرحین نے کہا۔

شہزاد اس بات کا کیا جواب دیتا

''اگر یہ حقیقت ہے تو عرض یہ ہے کہ......'' وہ ایک لمحے کے لئے رکی اور پھر بولی۔

''آپ ہمیں ابھی پڑھا دیجئے، کیونکہ آپ کی کلاس میں جانے کے لئے آج موڈ نہیں ہے۔''

''آج تو پہلا دن ہے آپ مت اٹینڈ کیجئے گا؟'' شہزاد نے کہا۔

''یہ کیوں نہیں کہتے کہ ابھی تیاری ہی نہیں کی آپ نے پڑھانے کی۔'' فرحین نے جھٹ سے کہا۔

''جی، کیا مطلب۔؟''

''مطلب یہ کہ کتاب کھولے بیٹھے رٹا لگا رہے ہیں۔''

شہزاد کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

''ابھی کیونکہ رٹا فیکیشن میں کچھ کسر باقی ہے اس لئے......''

فرحین کی بات ابھی ادھوری ہی تھی کہ کمرے کے باہر ظفر ماموں کی آواز سنائی دی۔وہ کلاس

لینے کے بعد اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔راستے میں کسی شاگرد سے بات کرنے لگے تھے۔

''اچھا جناب میں جاتی ہوں ظفر ماموں نے دیکھا تو ڈانٹیں گے۔''

وہ ظفر ماموں کی نظروں سے بچتی ہوئی نکل گئی۔

شہزاد کا پیریڈ شروع ہوا تو فرحین شمع کے ساتھ سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھی۔کلاس میں گنتی کے چند لوگ تھے ساری سیٹیں خالی پڑی تھیں۔وہ شہزاد کا پہلا دن تھا لیکن اس نے بڑے اعتماد سے پڑھایا۔اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بے شمار مباحثوں میں بڑے سے بڑے مجمع کے سامنے تقریر کر چکا تھا۔

فرحین نے اس کے لیکچر کا ایک لفظ سن کے نہ دیا۔اور مستقل شمع سے کھسر پھسر کرتی رہی۔شمع بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکے بیٹھی تھی۔

اس کے بعد تو فرحین کا یہ معمول ہو گیا کہ وقت بے وقت شہزاد کے پاس جا کر اسے تنگ کرتی۔کلاس میں سارا وقت بیٹھی نوٹس کی کاپی پر کارٹون بنایا کرتی، لطیفے لکھ لکھ کر کاپی شمع کے سامنے کر دیتی۔شمع اپنی ہنسی روکنے کی پوری کوشش کرتی لیکن جب معاملہ اس کی برداشت سے باہر ہو جاتا تو منہ دبا کر چپ چاپ کلاس سے باہر نکل جاتی۔

پھر ایک روز جب فرحین ٹیوٹوریل کی کاپی دینے شہزاد کے پاس گئی تو اس نے بڑی ہمت کر کے اسے سمجھایا۔

''مس فرحین! پلیز۔آپ کلاس میں سنجیدہ رہا کریں۔''

''بات یہ ہے ماسٹر صاحب کہ ''سنجیدہ سنجیدہ'' جیسے الفاظ میری لغت میں نہیں ہیں۔''

''اس میں آپ ہی کا نقصان ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

''نہیں جناب! یہ سراسر آپ ہی کا نقصان ہے، اور آپ کا نقصان ہمارا نقصان نہیں ہو سکتا۔''

''میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ کلاس میں دوسرے طالبعلم بھی ہوتے ہیں۔''

''تو کیا ہوا۔ان سب کو معلوم ہے کہ ہم شروع سے آپ کو پریشان کرتے آ رہے ہیں۔''

''مگر اب۔اب یہ بات مناسب نہیں ہے۔''

''کیوں۔اب کیا ہو گیا۔آپ وائس چانسلر بن گئے۔''

''نہیں خیر ایسی میری قسمت کہاں۔'' شہزاد کے لہجے میں بڑی عجیب سی بات تھی۔

''بس تو پھر چلنے دیجئے ایسے ہی۔''

''یعنی آپ کا مطلب ہے......''

''ہاں جناب۔جس لبادے کا نام سنجیدگی ہے وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔'' فرحین نے کہا اور مزید

کچھ سنے بغیر باہر نکل گئی-

اس دن کے بعد فرحین نے یہ دستور بنالیا کہ کلاس میں سب سے آگے بیٹھنے لگی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ اس نے اپنی باقی عادتیں ترک کردی تھیں-ایک روز شہزاد کلاس میں آیا تو فرحین نے پھر سب سے پچھلی کرسی سنبھال رکھی تھی-

''مس فرحین-آپ آگے آکر بیٹھیے-'' شہزاد نے کہا-

فرحین نے بڑی سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی-

شہزاد نے لیکچر دینا شروع کیا تو اس نے کاپی پر کارٹون بنانے شروع کردیئے-شہزاد نے دو ایک دفعہ اس کی کاپی دیکھی اور بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ روکی-

پھر ایک دفعہ جو اس نے فرحین کی طرف دیکھا تو وہ بھینگی آنکھ بنا کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی-شہزاد اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پاسکا-وہ جلدی سے منہ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کھنکار دیا-یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ گلا کچھ خراب ہے مگر اسی روز اس نے بڑے مؤدب لہجے میں ظفر ماموں کے سامنے اپنی پریشانی کا ذکر کردیا-شام کو ظفر ماموں نے شہزاد کی شکایت کا حوالہ دیئے بغیر فرحین کو ہلکی سی ڈانٹ پلائی اور ہمیشہ کی طرح نصیحتیں بھی کیں جو بالکل بے اثر ثابت ہوئیں-

کچھ دن اور گزرے تو لوگوں میں چہ میگوئیاں میں شروع ہوگئیں-لوگوں کا خیال یہ تھا کہ کیوپڈ ان دونوں کو اپنے تیر کا نشانہ بنا چکا ہے، کچھ ایسے بھی تھے جو اب تک اسی خیال پر قائم تھے کہ فرحین اپنی شوخ و شریر طبیعت کے ہاتھوں مجبور تھی-اڑتے اڑتے یہ خبر فرحین کی سہیلیوں تک بھی پہنچی-ان شامت کی ماریوں نے یہ بات فرحین کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھا-

فرحین نے عادت کے مطابق بتیسی نکال کر ان لوگوں کی اس بات کو سنا اور پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے بولی-

''کیا سب کے سب گھاس کھا گئے ہیں یا کچھ ایسے بھی ہیں-''

''نہیں-فی الحال تو سب نے گھاس نہیں کھائی-''

فرزانہ اس کی بات سمجھ کر بولی-

''اور تم لوگ کیا کہتی ہو اس سلسلے میں؟''

فرزانہ اور شمع تو خاموش ہوگئیں البتہ اس کی حیدرآباد والی سہیلی کی شاید شامت ہی آئی تھی جو بول پڑی-

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے-''

''دال میں کالا نہیں تمہارا سر ہے-''

''کیوں-؟''

''ارے اللہ کی بندی میں ابھی سے محبت کروں گی-''

اس کی سہیلی نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا-

''ابھی تو میں بہت چھوٹی ہوں محبت کرنے کے لئے-''

''اس میں چھوٹے بڑے کا کیا سوال ہے؟''

''ہے کیوں نہیں؟ جب تھوڑی سی اور بڑی ہوجاؤں گی تو اس مسئلے پر غور کروں گی-''

ظفر ماموں تو اتنے مصروف آدمی تھے کہ انہیں کسی بات کی خبر ہی نہیں رہتی تھی لیکن کچھ دنوں بعد یہ خبر اڑتی ہوئی ظفر ماموں کے کانوں تک بھی پہنچی-وہ ایک دم چونک کر رہ گئے-اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے ہوئے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر وہ سوچوں میں ڈوب گئے-ان کی آنکھوں میں دکھ، اور پریشانی کے سائے ہولے ہولے کانپ کر رہ گئے-

ظفر ماموں ہر بات بڑی آسانی سے اس سے کہہ دیتے تھے اور پوچھ لیتے تھے-لیکن اس دفعہ جانے کیوں وہ کچھ چپ سے ہوکر رہ گئے تھے-کئی دن گزر گئے انہوں نے اس مسئلے کو چھیڑا تک نہیں-فرحین بھی محسوس کررہی تھی کہ ظفر ماموں کچھ گم سم سے ہیں-ان کا یہ روپ تو اس نے اب سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا-حیران بھی ہوئی اور پریشان بھی-لیکن وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو سوچتے زیادہ ہیں اور بولتے کم-اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ ظفر ماموں سے اس اچانک تبدیلی کا سبب پوچھ کر رہے گی-

اس روز وہ یونیورسٹی سے واپسی پر بجائے اپنے گھر اترنے کے ظفر ماموں کے گھر چلی گئی-کچھ دیر نانی اماں کے کان کھائے تو کچھ دیر ممانی کا بھیجا پلپلا کیا-اس سے فرصت ملی تو بچوں کے ساتھ دھما چوکڑی مچائی-

ظفر ماموں اس وقت تک کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آرام کے لئے جاچکے تھے-کھانا تو اس نے بھی ان کے ساتھ ہی کھایا تھا مگر بعد میں اپنی مصروفیتوں میں گم ہوگئی تھی-

فرحین کو جب اچھی طرح اطمینان ہوگیا کہ اس وقت ظفر ماموں کے کمرے میں کسی اور کے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے تو وہ بچوں کو قیلولہ کرنے کی نصیحت کرکے ظفر ماموں کے پاس پہنچ گئی-ظفر ماموں اپنے بستر پر چپ چاپ لیٹے سامنے والی دیوار کو گھورے جارہے تھے، قدموں کی آہٹ پر انہوں نے دروازے کی طرف دیکھا-

''آؤ فرحین!'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئے-

''میں آپ سے سخت ناراض ہوں ظفر ماموں!'' فرحین نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے

کہا-

''میں بھی تم سے بہت ناراض ہوں-''

ظفر ماموں کے لہجے میں اتنی سنجیدگی تھی کہ فرحین حیرت سے ان کا منہ تکنے لگی- یہ انداز گفتگو تو اس کے لئے بالکل اجنبی تھا- اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ظفر ماموں زندگی میں کبھی اس سے ناراض بھی ہو جائیں گے-

''مگر آپ مجھ سے کیوں ناراض ہیں؟'' وہ مسکرائی-

''جب تم میری توقع کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤ گی تو ناراض ہی ہوں گا-''

''میں نے تو ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جو......''

''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم مذاق ہی مذاق میں شہزاد کے لئے اتنی سیریس ہو جاؤ گی-''

''میں......اور شہزاد کے لئے سیریس؟''

''ہاں......تمہیں احساس ہے کہ تم دونوں کے بارے میں لوگ آج کل کیا باتیں کر رہے ہیں؟''

''سب بکتے ہیں......''

''تو کیا اس بات میں کوئی صداقت نہیں؟''

''آپ میری فطرت سے واقف ہیں، آپ خود سوچ سکتے ہیں-''

ظفر ماموں کچھ یقین اور کچھ بے یقینی کے عالم میں اس کی طرف دیکھتے رہے-

''ابھی تو میری عمر بھی نہیں ہے ان حماقتوں میں قدم رکھنے کی-'' فرحین نے ٹھٹھا لگایا-

ظفر ماموں اس کی بات سن کر دل ہی دل میں ہنسے ''اب تو آپ ہم سے ناراض نہیں ہیں نا؟''

''ہوں......'' ظفر ماموں جانے کن سوچوں میں کھوئے تھے-

''اب میں جاؤں؟''

''نہیں بیٹھو تم سے ایک بات کہنی ہے-''

''جلدی سے کہئے!''

''دیکھو فرحین! تم شہزاد اختر کے بارے میں کبھی اس قسم کی بات سوچنا بھی مت-''

ظفر ماموں کی آنکھوں میں دکھ کے سائے کانپ کر رہ گئے-

''کیوں......؟'' فرحین نے ہنس کر پوچھا-

''بس، اس کی ایک وجہ ہے-''

''وہ وجہ مجھے ضرور بتایئے-''

''نہیں میں مناسب نہیں سمجھتا-''

''ممکن ہے بتا دینے میں ہی کوئی بہتری ہو-''

ظفر ماموں فرحین کی یہ بات سن کر چونک گئے- ان کے دل سے بھی آواز آئی کہ فرحین غلط نہیں کہتی- مگر وہ چاہتے تھے کہ شہزاد کی اصلیت جن پردوں کے پیچھے چھپی ہے چھپی ہی رہے تو بہتر ہے لیکن اب فرحین کے جملے نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ تصویر کا دوسرا رخ ضرور دکھا دیں-

اور پھر......ظفر ماموں نے فرحین کو جو کچھ بتایا وہ اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا- شہزاد کے بارے میں یہ بتاتے ہوئے ظفر ماموں بہت اداس ہو گئے تھے کہ اس نے تو اس بازار میں جنم لیا ہے جہاں دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں- جہاں گھنگھروؤں کی جھنکار اور سکوں کی کھنکھناہٹ کے شور میں روح کی سسکیاں دب جاتی ہیں جہاں عورت کا ہر روپ مر جاتا ہے- صرف ایک روپ زندہ رہتا ہے- وہ نہ ماں ہوتی ہے نہ بیٹی، نہ بیوی ہوتی ہے اور نہ بہن، وہ تو بس ایک عورت ہوتی ہے اور مرد کے ہاتھوں میں کھیلنے والا ایک خوشنما کھلونا-

شہزاد کو تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا باپ کون تھا اتنے لوگوں میں اتنے چہروں میں وہ کیسے پہچانتا اور کسے کہتا کہ یہ میرا باپ ہے-

ظفر ماموں کو شہزاد کے بارے میں جو کچھ بھی تفصیلات معلوم تھیں، انہوں نے لفظ بہ لفظ فرحین کو بتا دیں، اور سوائے اُن کے ڈیپارٹمنٹ میں اور کسی کو یہ بات معلوم نہیں تھی کہ شہزاد کی اصل حقیقت کیا ہے-

اور......اس رات کھانا کھانے کے بعد فرحین نے آنگن کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگاتے ہوئے شہزاد اختر کے متعلق سوچا- تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے اپنے دل سے یہ صدا سنائی دیتی رہی-

''وہ تو کھوٹا سکہ ہے-''

اگلے روز وہ یونیورسٹی گئی تو اسے معلوم ہوا کہ آج شہزاد اختر یونیورسٹی نہیں آیا-

اس نے شہزاد کی کمی بڑی شدت سے محسوس کی گزشتہ روز ہی اس نے بڑے وثوق اور شرارت سے ظفر ماموں سے کہا تھا-

''ابھی تو میری عمر بھی نہیں ہے ان حماقتوں میں پڑنے کی-'' اور چند روز پہلے اس نے اپنی سہیلی سے کہا تھا-

''محبت کرنے کے لئے ابھی میں بہت چھوٹی ہوں-'' مگر اس روز اسے احساس ہوا کہ جیسے ایک دم ہی وہ بہت بڑی ہو گئی ہو-

دوسرے روز جب وہ شہزاد کے پاس گئی تو اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا-

''ظفر ماموں نے مجھے آپ کے بارے میں کچھ بتایا ہے۔''
''جی......کیا...... بتایا ہے؟'' شہزاد کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔
''یہی کہ آپ کھوٹا سکہ ہیں۔'' وہ مسکرائی
''کھوٹا سکہ......؟''
شہزاد کی آنکھوں میں انجانے اندیشوں کے سائے لہرا گئے۔
''جی ہاں۔کھوٹا سکہ۔'' فرحین ہنسی
شہزاد نے اپنا سر جھکا لیا۔
''آگے بھی تو سنیے......'' فرحین نے کہا
شہزاد نے اپنا جھکا ہوا سر اوپر نہیں اٹھایا
''آپ کھوٹا سکہ ہی سہی لیکن میں بھی تو ایک سودائی لڑکی ہوں۔''
شہزاد نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
''میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔''
شہزاد کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
''یہ تو مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے پسند کرتے ہیں۔''
شہزاد پریشان ہونے کے باوجود اس کی بات سن کر مسکرا دیا۔ اتنے میں ہی فرحین کمرے سے یہ جا اور وہ جا۔
اسی روز گھر واپس جاتے ہوئے راستے میں اس نے ظفر ماموں سے کہا۔
''ظفر ماموں! میں محسوس کرتی ہوں کہ اب میں چھوٹی نہیں رہی اور......اور یہ کہ اگر میری شادی ہوگی تو صرف شہزاد اختر کے ساتھ۔''
ظفر ماموں کے ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر کانپ گئے۔

❖ ○ ◆ ○ ❖